UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222887
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY
Call No. ۸۹۱٫۴۳۰۵ Acc.No. ۶۶۱۵
اردو

رسالہ اردو

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱٫۴۳۵ اردو Accession No. G 615

Author

Title رسالہ اردو

This book should be returned on or before the date last marked below.

اردو

جلد ۱۸	جنوری سنہ ۱۹۳۸ ع	حصہ ۶۹

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

٦١٥ م

٥٥ ف

دی اسٹینڈرڈ انگلش - اردو ڈکشنری

مرتبہ

انجمن ترقی اُردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے - اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے - چند خصوصیات ملاحظہ ہوں :-

(۱) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے - انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں -

(۲) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے - اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں -

(۳) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لیے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دے دیا گیا ہے -

(۴) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا - ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے -

(۵) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لیے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کے لیے تمام اردو ادب ' بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے - یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی -

(۶) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کیے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں -

(۷) اس لغت کے لیے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے - طباعت کے لیے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کیے گئے ہیں - جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے -

(ڈمائی سائز - صفحات ۱۵۱۳ + ۳۳) قیمت سولہ روپے کلدار علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقیٔ اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابت جنوری سنہ ۱۹۳۸ ع

نمبر سلسلہ	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	دیوان میر کا ایک مختصر نسخہ اور میر کے متعلق معلومات میں خاص اضافہ	جناب عبدالباری آسی صاحب لکھنؤ	۱
۲	میر صغیر بلگرامی اور مرزا غالب	جناب قاضی عبدالودود صاحب	۲۹
۳	مقالات کارسل دتاسی	مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۴۴
۴	خطبۂ صدارت	عبدالحق اڈیٹر اردو	۱۴۴
۵	ھلدسلانی (خطبہ)	آنریبل مسٹر یعقوب حسن- مدراس	۱۶۳
۶	افکار و واقعات	اڈیٹر	۱۷۷
۷	تبصرے	اڈیٹر و دیگر حضرات	۲۰۳

دیوان میر کا ایک مخصوص نسخہ

اور

میر کے متعلق معلومات میں خاص اضافہ

از

(جناب عبدالباری آسی صاحب - لکھنؤ)

شعرائے ریختہ کی تذکرہ نویسی کا سلسلہ میر تقی میر مرحوم کے وقت سے جاری ہوا اور آج تک اسی طرح جاری ہے خود میر صاحب نے بھی تذکرہ لکھا - اور ان کے موقر معاصرین میر حسن ' سودا ' قایم ' مصحفی وغیرہ نے بھی - مگر چونکہ اس زمانے میں تذکرہ نویسی قرابادیں نویسی سے زیادہ نہ تھی کہ امراض انسانی کے سر سے لے کر پیر تک کے نسخے جمع کردیے اور بس - اسی طرح تذکروں میں شاعر کی تعریف اور مختلف شاعروں کا کلام ہوتا تھا اور بس - اگرچہ ان میں سے بعض مستثنیٰ بھی کہے جا سکتے ہیں جنھوں نے کلام جمع کرنے کے سوائے تاریخی حالات پر روشنی ڈالی ہے - مگر وہ بھی دھندلی دھندلی - اسی سبب سے تمام متقدمین کے تذکرے جمع کرلیجیے پھر بھی اجمال اور اہمال کی تاریکیوں سے نکلنا کچھہ آسان کام نہیں ہے - کیا کیا جائے اس زمانے کی رسم اور اس وقت کا دستور ہی یہ تھا کہ شاعر کی ذاتی

تعریف و محاسن کے رنگین فقروں کے لیے دو دو صفحے وقف اور صحیح حالات کے لیے دو سطریں بھی نہیں —

متقدمین کا دور گزرا متوسطین کا زمانہ آیا - شیفتہ، نساخ، باطن، صہبائی وغیرہ نے تذکرے لکھے وہ بھی ایک قدم اس قدیمی لیکھہ سے نہیں ہٹے اور کسی طرح قدیمی وضع میں فرق نہیں آنے دیا - مگر جب یہ لوگ بھی متاخرین کے لیے جگہ خالی کرگئے تو تنقید و تحقیق کی طرف زیادہ توجہ ہونے لگی - جہاں تک خیال ہے تین چار تذکرے اس دور میں بہت ہی بہتر لکھے گئے - آب حیات مولانا آزاد، کاشف الحقائق امداد امام صاحب اثر، جلوۂ خضر یہ سب تذکرے اپنی اپنی نوعیت میں علیحدہ ہیں - مگر وہ چیز جس کو نگاہیں ڈھونڈتی تھیں آبحیات میں موجود ہے اور اس کی جامعیت یقینی اس وقت کے مولفین و مصنفین کے لیے قابل رشک ہے - حالات، سوانح، لطایف ظرایف، تنقید تحقیق، رنگینی و روانی عبارت غرض کہ یہ سبھی چیزیں اس میں موجود ہیں - مگر اتنی سی کمزوری بھی ہے کہ جہاں مولانا کو کوئی تاریخی سہارا نہیں ملتا تو ان واضعان حدیث کی روش اختیار کرنی پڑتی ہے جنھوں نے مذہب کو نزھت الناظرین بناکر پیش کیا ہے - جب وہ چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد کی فضا میں نکل جاتے ہیں تو گمان، قیاس، تک بندی، چٹکلے بدیہ گوئی غرض کسی چیز سے بھی پرہیز نہیں کرتے - مگر باوجود اس کے بھی آب حیات سے اکثر ایسی چیزیں اور ایسی باتیں بر روئے کار آگئیں جن پر نہ معلوم کب سے جہل کے پردے پڑے ہوئے تھے —

آب حیات کو نقص اولیں ضرور کہا جاسکتا ہے مگر اس حقیقت میں انکار کی گنجائش نہیں کہ دور موجودہ کے نقادان فن نے روایتوں

کو درایت کی کسوٹی پر کس کر اُس زر ناقص کو کامل العیار بنادیا ہے جو اب سے پہلے نہایت خراب حالت میں تھا - اب واقعات کو اس طرح آئینہ بناکر سامنے لایا گیا ہے کہ عہد ماضی کی صحیح صحیح تصویریں اس میں نظر آتی ہیں چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب کے بعض تذکروں پر لکھے ہوئے مقدمات' مولوی عبدالحی صاحب مرحوم کا گل رعنا' رام بابو صاحب سکسینہ کی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر کا ترجمہ تاریخ ادب اردو اس دعوے کے شاہد عادل ہیں - کوئی شک نہیں کہ ان تذکروں میں ہر اجمال کو تفصیل کے ساتھ بدل کر داد تحقیق دی گئی ہے —

پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر نہ کوئی قیاس آرائی کی جاسکتی ہے اور نہ درایت وہاں تک پہنچتی ہے اور وہ جہل اور عدم وقوف ہنوز جہل اور عدم وقوف سے آگے نہیں بڑھے —

مثال کے طور پر میر کی عمر کے مسئلے ہی کو لے لیجیے - وہ جیسا قدیم سے اختلافی تھا ہنوز اختلافی ہے - ان کے سنہ پیدائش سے ناواقفی بدستور ہے - مصحفی کے تخمینے کا میر حسن کے بیان سے تطابق کیا جاتا ہے کہ مصحفی کا تذکرہ جب تالیف ہو رہا تھا ان کی عمر اس وقت اسّی (۸۰) برس کی تھی - میر حسن جب میر کا ذکر کر رہے تھے اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی - آزاد اٹھتے ہیں تو ایکدم انہیں ایک دم انہیں ایک سیکڑے تک بغیر کسی تاریخی سہارے کے پہنچادیتے ہیں - ان سب قیاس آرائیوں کے بعد مولانا عبدالحق صاحب اور مرزا محمد عسکری صاحب نہایت کاوش کے بعد ان کی عمر ۸۹ یا ۹۰ قرار دیتے ہیں - اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے مگر

پھر بھی یہ تعین قیاس اور درایت کا ممنون احسان ہے اور ہنوز اعتماد نہیں کیا جا سکتا —

خیر یہاں تک تو درست ہے - مگر ان باتوں پر کیا قیاس آرائی کی جائے جن باتوں کا سرے سے پتا ہی نہیں - مثلاً یہ تو معلوم ہے کہ سنہ ۱۲۲۵ ھ میں میر صاحب کا انتقال ہوا مگر نہ مہینہ معلوم نہ تاریخ نہ دن —

اسی طرح یہ تو مسلم کہ اُن کا لکھنؤ میں قیام تھا اور وہ دولت آصفیہ سے وابستہ تھے - مگر یہ خبر نہیں کہ وہ کہاں رہتے تھے —

یہ بھی خبر ہے کہ وہ لکھنؤ ہی میں مدفون ہیں مگر اس بارے میں سخت اختلاف ہے کہ کہاں دفن ہیں - کوئی کہتا ہے مصری کی بغیا میں اور کوئی کہتا ہے سعادت گنج یا عیش باغ میں - کوئی کہتا ہے بھیم کے تکیے میں - غرض اختلافی مسائل ہنوز اختلافی، قیاسی قیاسی، نا معلوم نا معلوم ہیں —

مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے واقعات سے پردہ اٹھتا جاتا ہے - آثار قدیمہ مل رہے ہیں اور گمان کو یقین کے درجے پر پہنچا رہے ہیں - چنانچہ آج ہم جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ شاید اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور غالباً دنیائے ادب میں اتنا بڑا درجہ رکھتی ہے جو شاید دوسری چیز کو حاصل نہیں —

خصوصیت اول

وہ کیا ہے؟ میر تقی میر کا چوتھا دیوان - مگر کیسا - جو خود انہوں نے اپنے شاگرد محمد محسن المخاطب بہ زین الدین کو اپنے ہاتھ سے دیا - اور نہایت خوشی و رغبت سے دیا اور معاف کیا —

یہ واقعہ میر صاحب کی وفات سے دس بارہ برس پہلے کا ہے - اور غالباً یہ چاروں دیوان تھے جن میں تین شاید محمد محسن کے ہاتھ سے تلف ہوگئے تھے اور ایک دیوان باقی رہ گیا تھا جس کی طرف خود محمد محسن صاحب نے اُس تحریر میں اشارہ کیا ہے جو انہوں نے اپنے قلم سے اس پر لکھی ہے —

خصوصیت دوم | یہ دیوان میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے - جو شاید اُنہوں نے میر مرحوم کے اشارے سے لکھا ہو - کیونکہ اس دیوان کا میر صاحب کے قبضے میں ہونا اور اُن کا اپنے ایک شاگرد کو بخش دینا اس کی بین دلیل ہے —

خصوصیت سوم | اس دیوان پر محمد محسن محسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جو عبارت ہے اُس سے ان تمام باتوں کا پتہ چل جاتا ہے جو اب تک کسی تذکرے والے نے نہیں لکھیں - اور یہ عبارت میر کے انتقال سے چھ سات روز بعد لکھی گئی —

خصوصیت چہارم | یہ دیوان نہایت صحیح ہے اور یقینی طور پر میر مغفور کی نگاہ سے گزر چکا ہے -

خصوصیت پنجم | اس دیوان کے آخر میں سوانح میر بھی ہیں جن سے اُن کے حالات زندگی پر اور بھی تیز روشنی پڑتی ہے اور یہ حالات بھی اس قسم کے ہیں جو کسی تذکرے میں درج نہیں ہیں - یہ کسی کتاب نوادرالکملاء سے لیے گئے ہیں —

خصوصیت ششم | اس پر شاہان اودھ کے کتب خانوں کی مُہریں درج ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دیوان کتب خانہ جات شاہی میں رہا ہے اور بہترین درجہ پاچکا ہے —

خصوصیت ہفتم | اس دیوان میں بہ نسبت دیوان متداول کے کلام زیادہ ہے - چنانچہ سب سے آخر میں ایک غزل ہے جو کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے —

خصوصیت ہشتم | چونکہ اس دیوان کے ساتھہ میر کی پانچ مثنویاں بھی شامل ہیں ان میں ایک تاریخی مثنوی غیر مطبوعہ ہے اور وہ کسی متداول دیوان میں نہیں ہے —

اس کے بعد ہم وہ عبارت نقل کرنا چاہتے ہیں جو اس دیوان کے پہلے صفحے پر درج ہے اور جس سے اکثر واقعات سامنے آجاتے اور شکوک جاتے رہتے ہیں - اس کے بعد ہم اس کی تشریح کر کے بتائیں گے -

نقل عبارت

بروز جمعہ بستم ماہ شعبان المکرم وقت شام سنہ ۱۲۲۵ ھ یک ہزار و دو صد و بست پانج ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب این دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ شہتی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند - و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دو پہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند - و چہار دیوان خود را کہ این دیوان چہارم ہم ازاں جملہ است بہ محرر سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد تجاوز اللہ عنہ سپاتہ درحین حیات خویش بہ کمال رغبت بحل کردہ بخشیدند - خدایش بیامرزاد -

حررہ محمد محسن علی عفی عنہ روز جمعہ بست و ہفتم ماہ شعبان سنہ الیہ بوقت چہار گھڑی روز باقیماندہ - این دیوان بہ دستخط میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور است —

اس عبارت سے میر کے متعلق معلومات میں کیا اضافہ ہوتا ہے

میر کے متعلق سنہ وفات تو ناسخ کی تاریخ واویلا مرد شہ شاعراں سے متعین ہو چکا ہے

لہذا یہ کوئی نئی معلومات نہ ہوگی - البتہ اسی عبارت کے نیچے محمد محسن محسن کی دو تاریخیں درج ہیں وہ ضرور قابل نقل ہیں:

تاریخ نمبر ۱

محمد تقی میر شاعر کہ بود مسلم و را تخت و تاج سخن
با قلیم معنی ز ارباب شعر ستاندہ او بود باج سخن
ز مرگش چو بے نور شد شعر سال نوشتم بمردہ سراج سخن

۱۲۲۵

تاریخ نمبر ۲

میر تقی استاد فن شعر مرد و ز دنیا سوئے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بیسر میر تقی استاد رقم شد

۱۲۲۶

دوسری تاریخ کے نیچے ۱۲۲۶ کے ساتھ ۱۲۲۵ بھی لکھا ہے - غالباً ایک کی زیادتی کی کوئی پروا نہیں کی گئی اور اشعار کے الف کا ایک عدد دور کر کے اس کو تخرجہ کی صورت میں رکھ لیا گیا —

دوسری چیز جو معلومات میں اضافہ کرتی ہے وہ مہینہ ہے یعنی شعبان سنہ ۱۲۲۵ - تیسری چیز دن یعنی روز جمعہ چوتھی چیز ۹۰ برس کی عمر اور وقت انتقال یعنی وقت شام - پانچویں چیز جائے انتقال یعنی محلہ سُتھٹی * جس سے اُن کے مکان کا بھی پتہ چل گیا اور

* پرانے لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہ لکھنؤ کا ایک محلہ تھا جو ڈالی گنج کے محاذ میں دریا کے جنوبی کنارے کی طرف دور تک آباد تھا اور یہیں اسی نام کا ایک بازار تھا جہاں سوت وغیرہ کی خرید و فروخت ہوتی تھی - یہ محلہ میر کی وفات کے بعد عرصہ تک آباد رہا - میر انیس کا مکان بھی اسی محلے میں تھا - لکھنؤ کے مشہور شاعر جان صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے —

جہاں جاتی ہوں مردوں کی سُتھٹی سی ہے لگ جاتی یہ مجھ بڑھیا کا کاتا ہے جوانوں کا تماشا ہے

اب اس محلہ کا نام بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں ممکن ہے کہ میرے اس پتہ میں کوئی تبدیلی ہوسکے مگر اس محلے کے ہونے میں کلام نہیں -

جائے قیام بھی معلوم ہوگئی --

چھٹی چیز یہ کہ جس روز ان کا انتقال ہوا اس روز دفن نہیں ہوے بلکہ جمعہ کی شام کو انتقال ہوا اور ہفتہ کو دو پہر کے وقت دفن ہوئے - ساتویں چیز یہ کہ ان کے اعزا و اقربا بھی یہاں انتقال کر چکے تھے انہیں کی قبروں کے پاس یہ مدفون ہوئے - اگرچہ اب نہ ان کے اعزا کی قبروں کا نشان ہے نہ ان کی قبر کا پتہ، مگر بتانے والے نے اپنے زمانے کے لوگوں کے لیے ایک صحیح نشان بتایا تھا جسے استداد زمانہ نے ہمارے لیے باقی نہیں رکھا - آٹھویں اہم چیز ان کی جاے دفن کا نام ہے - یعنی اکھاڑہ بھیم * - اور اس سے وہ تمام قیاسات اور روایات باطل ہو جاتے

---

* اکھاڑہ بھیم کے متعلق جب تحقیق کی گئی تو عمر رسیدہ حضرات سے دو باتیں معلوم ہوئیں - بعض نے بتایا کہ بھیم کا اکھاڑہ بھیم کے تکیے کے نام سے بھی مشہور تھا - اور وہ یہی قبرستان ہے جو گولہ گنج ریل کی پٹری کے برابر دور تک چلا گیا ہے - اور اتفاق کی بات ہے کہ میر کی قبر اسی قبرستان میں مشہور بھی ہے چنانچہ ریل کے پھاٹک کے قریب جہاں ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنی ہے اور ایک، دو مجاور بھی وہاں رہتے ہیں اُسی کو میر کی قبر بتایا جاتا ہے - اب اُس پر عرس وغیرہ بھی ہوتا ہے - مگر مولانا سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو لکھنؤ یونیورسٹی سے یہ سن کر مجھے نہایت افسوس ہوا کہ اب ایک فقیر نے جو وہاں رہتا ہے اُسے شاہ جشن کا مزار مشہور کرنا شروع کردیا ہے -

دوسری بات جو اکھاڑہ بھیم کے متعلق معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ عیش باغ کے قریب تھا - مگر جہاں تک تحقیق کی یہ دوسری چیز صحیح ثابت نہیں ہوئی بھیم کے متعلق سنا گیا ہے کہ وہ ایک پہلوان تھا جو کسی اور جگہ سے وارد لکھنؤ ہوا تھا - اور اس نے ایک املی کو چیر کر اُس کے اندر ایک اینٹ رکھدی تھی اور چیلنج دیدیا تھا کہ اب کوئی اس اینٹ کو سالم اس سے نکال لے تو میں اُس کو پہلوان مان لوں گا - مگر یہ سب باتیں کچھ مہمل سی معلوم ہوتی ہیں - اس جگہ کے متعلق بھی جان صاحب نے ایک جگہ ذکر کیا ہے -

ایک ایک نکتہ پر اجی لڑتے ہیں مردوے معقل مشاعرے کی اکھاڑا ہے بھیم کا

بہر حال یہ اکھاڑہ اور یہ تکیہ ضرور تھا - اور عجب نہیں کہ یہی ہو جس پر لوگوں کا گمان ہے - ' آسی '

ھیں جو مزار میر کے تعین کرنے کی کوشش میں رسالوں اور اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ کر چکے ھیں - اور اب تک لکھنؤ کے بعض رسالوں میں اسی قسم کے مضمون نکل جاتے ھیں - نویں بات یہ ھے کہ یہ دیوان جس کی عبارت نقل کی گئی ھے میر کے مرنے سے دس بارہ برس پہلے کا لکھا ھوا ھے کیونکہ لکھنے والے کی یہ عبارت دیکھو کہ - " کہ چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم ھم ازاں جملہ است " ذرق تنقید کو کاوش ھوتی ھے کہ آج کلیات میر میں چھہ دیوان ھیں - پھر کیا میر صاحب نے اپنے شاگرد کو ایک نا تمام نسخہ دیا تھا - ھرگز نہیں - بلکہ واقعہ یہ ھے کہ یہ اُس وقت کا دیا ھوا ھے جب کہ میر صاحب کے صرف چار دیوان اختتام کو پہنچے تھے - چنانچہ تذکرہ گلزار ابراھیم علی ابراھیم خاں جو سنہ ۱۱۹۸ ھ میں لکھا گیا وہ لکھتے ھیں جس کا ترجمہ یہ ھے کہ اج کے دن تک کہ سنہ ۱۲۱۱ ھجری میں وھی حال ھے جو اوپر مذکور ھوا ... ... یہ رھنما قوم سخن سرمایگان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برھان ھے یعنی صاحب چار دیوان - اسی طرح مصحفی نے اپنے تذکرۂ ھندی میں جو سنہ ۱۲۲۱ ھ میں شروع ھوا اور سنہ ۱۲۲۶ ھ میں اختتام کو پہنچا لکھا ھے کہ چہار دیوان از خامۂ فکرش ریختہ - غرض اِن کی آخر عمر تک چار ھی دیوانوں کا پتہ چلتا ھے —

اس سے ھم کو ایک اور چیز پر قیاس آرائی کا موقع مل جاتا ھے - کہ میر صاحب کے دیوان پنجم و ششم میں جو غزلیں ھیں وہ آخر وقت کی ھیں جب کہ اُن کی عمر ۸۵ - ۸۶ سال کی ھو چکی تھی - اس کے ساتھہ ھی ساتھہ قیاس کو اور وسعت دی جائے تو یہ گماں بھی یقین کی حد پر پہنچ جاتا ھے کہ اُن کے دیوانوں کی ترتیب اُن کے عمر کے لحاظ سے

ہوئی پہلے دیوان میں ابتدائی شاعری کا کلام ہے اور دوسرے دیوان میں اُس کے بعد کا اور یوں ہی بتدریج —

پھر اس کے بعد ایک اور مہتم بالشان صورت یہ بھی نکل آئیگی کہ اُن کے ابتدائی کلام کا اُن کے وسط عمر اور آخر عمر کے رنگ سے مقابلہ کرنا آسان ہوگا جو یقینی ایک بہت بڑا ادبی نتیجہ پیدا کر کے اُن کے حالات و خیالات پر روشنی ڈالے گا - دسویں بات یہ ہے کہ میر صاحب کے چھ سات روز بعد محمد محسن نے اُن کے یہ حالات لکھے ان میں کوئی بات مشکوک اور شبہ کے قابل نہ ہوگی —

یہ اُس عبارت سے ہم کو معلومات ہوتی ہے جو دیوان کے ٹائٹل پر باریک خط میں درج ہے - اب میں اُس عبارت کو نقل کرتا ہوں جو دیوان کے ختم ہونے کے بعد دوسرے صفحے پر درج ہے - جو غالباً محمد محسن کی لکھی ہوئی نہیں ہے - کسی دوسرے شخص نے اُسی زمانے میں کسی کتاب نوادرالکملاء سے نقل کردی ہے - اس سے پھر بہت سی نئی باتوں کا پتہ چلتا ہے اور اُن کی آخری زندگی کے حالات آئینہ ہو جاتے ہیں —

سوانح محمد تقی میر

اصلش از اکبر آباد - دراواخر یکصد و سی پنج ہجری ولادت واقع شدہ - بعد واقعہ ہائلہ پدر بزرگوار بہ عمر ہفدہ سالگی در دہلی رفت - وبہ خانہ سراج الدین علی خاں آرزو اقامت ورزیدہ تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ - بعد مرور دہور کہ جدائی فیمابین واقع شد بہ روسائے عظام در خورد وبر خورد - و بہ فراغت تام و خوبی مالا کلام با اعزا و اقربا زندگی بسرمے برد - تا زمانے کہ آشوب عظیم و فتنۂ نمایاں

بروے کار آمد - هنگامه نادره گرم شد - کاروبار مردم در هم و برهم شد - خانما نها به تاراج اوباشاں رفت - برنجیا و شرفا عرصهٔ حیات تنگ شد - مردماں شاهجهان آباد از هر درے که یافتند از جا بیروں رفتند - وروبه صحرائے غربت نهادند - میر صاحب تا زمانے بیجا برجا (ماندند؟) حیران و پریشان سراسیمه و سرگردان - نه انیسے که یاری کند و نه انیسے که غمگساری - کلفت ها دیدند و کرتیها کشیدند - آخر کار به ایمائے نواب وزیر حضرت دهلی را که بجائے وطن مالوف بود وداع کرده به بلاد شرقی شتافتند - و در بلدهٔ لکهنؤ طرح اقامت انداخته مورد عواطف آصفی شدند - شهرهٔ حسن کلام زمین و زماں را برگرفت - ذره ذره روشناس و قطره قطره محو سپاس - چه تعظیم ها که نه دیدند و چه آفرینها که نه کشیدند - گردوں بے مدار فتنه اساس و زمانهٔ غدار ناسپاس است کسے را نه بیند که نیازارد جگر میر را به حوادث گوناگوں فگار ساخت - و آسودهٔ را شکار آزار کرد - در سالے مایهٔ ناز پروردهٔ آغوش ناز دخترے و در سالے دیگر مرهم جگر افگار خلف کامگار - و در سالے دیگر املیهٔ صفت شعار به کنج عافیت مزار آسودند - قیامت آشکار و محشر پدیدار شد - در حواس و مزاج اختلال کلی راه یافت - برداشتگی خاطر از دنیاے ناپائدار از حد افزوں و شوق جاں سپردگی از اندازه بیروں رفت - دامان عزلت مستحکم گرفتند - مجالس و محافل را وداع نمودند - مدتے به همیں نوع گزشت انچه گزشت - آخر در شهر ربیع الثانی عوارض مزمنه رو به ترقی آوردند - درد قولنج که جلیس قدیم و همراز و ندیم بود ساعتے نه گزاشت - وجع مفاصل قوائے جسمانی را معطل ساخته - پزشکان شاهی که شناسائے قدیم بودند هجوم آوردند - رائے همگناں براں قرار یافت که چارهٔ کار قرار واقعی

باید نمود و داروئے باید به استعمال آورد که قبض طبیعت بر طرف شود - تلوئے دادند اسہال بود که پیام مرگ ' جثۂ نحیف و مضغۂ ضعیف و اسہال یکروزہ یک صد و پنجاہ - واویلا آہ آہ - دو سہ روز همیں نوبت بود - آزار به مرگ انجامید - فرشتۂ موت جام ہلا ہل کل من علیہا فان پیش نمودہ - بیاشامید - ان للہ وانا الیہ راجعون ثم ان للہ و انا الیہ راجعون - مرحوم مردے بود متوکل سپاہی پیشہ رقیق القلب پابند وضع جہاندیدہ سرد و گرم زمانہ چشیدہ سرآمد سخنوران ماضی و حال در سخن سنجی بے مثال کم اختلاط و با دوستاں سراسر ارتباط ' سنجیدہ ' از حرص و ہوائے دنیا آزاد - و کسے را کہ نیازردے ہرگز ہرگز حملہ بران نیاوردے - کسے را بد نمی گفت و بد نمی شنفت - استغنائے بیش از بیش به تعظیم و تکریم ہر کہ و مہ پیشا پیش - مراختہ و مطارحہ را ترک نمودہ بود تاہم سخن گوئی را مدار حیات خویش انگاردہ تادم واپسیں گرفتار طرۂ سخن بود - حرفہا می زد و کلام ہا می گفت - ورد آخریش همیں مطلع غزل کہ گفتۂ او بود - بود :

ساز پسیج آمادہ ہے سب قافلہ کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

قریب به چہار صد کس حاضر جنازہ اش بودند - و بعد ازاں شنوندگاں و عقیدتمنداں جرق جوق نماز غائبانہ گزاردند - ہر صنف کلام یادگار اوست مثنوی وغزل و مدح و ذم گرمیٔ بازار اوست - پس اللہم اغفرہ ولکابتہا -

از نوادرالکملاء نقل گرفتہ شد و زیب دیوانش نمودہ آمد

اس عبارت کے دیکھنے سے بھی اکثر ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے ہم اس وقت تک بالکل ناواقف ہیں - چنانچہ سب سے پہلی بات

جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ نوادرالکملاء تذکرے کی قسم سے کوئی کتاب تھی جو اب کہیں نہیں - اور نہ اس کا ذکر کہیں ملتا ہے - خدا معلوم کس نے مرتب کی اور کیونکر ناپید ہوئی —

(۲) ولادت کے سنہ کا علم - جس کے بعد اُن کی عمر کے تعین میں قیاس کی ضرورت باقی نہیں رہتی - اور سنہ ۱۱۳۵ کے آخر سے ۲۰ شعبان سنہ ۱۲۲۵ھ تک جوڑنے سے صاف صاف نتیجہ نکل آتا ہے —

(۳) میر صاحب سترہ برس کی عمر میں دہلی آئے - اس سے تذکرۂ بہار بےخزاں کی اُس عبارت کی بھی کچھہ تصدیق ہوجاتی ہے جو میر صاحب کے متعلق اُنہوں نے لکھی ہے - کہ "بہ شہر خویش با پدری تمثلے کہ از عزیزانش بود" در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت - آخر عشق او خاصۂ مشک پیدا کردہ - می خواست کہ بخفیہ بہ چار سوے رسوائی کند و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید - از ننگ افشائے راز وطن و اقربا بادلے بغل پروردۂ حسرت و حرماں با خاطر ناشاد دست و گریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ بر اندازی ہائے بہ شہر لکھنؤ رسید" - ظاہر ہے کہ سولہ سترہ برس کی عمر سے پہلے اس قسم کے تعلقات پیدا ہونا ذرا دشوار سا ہے - اور اس عبارت سے ان کے گھر سے نکلنے کی ایک وجہ بھی پیدا ہوجاتی ہے —

(۴) دلی پہنچ کر سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں کا قیام تو خیر مسلم ہے لیکن یہ نکتہ بھی حل ہوجاتا ہے کہ میر صاحب نے دلی میں علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کی - اور اس وقت ان علموں کی تکمیل کے معنے یہ تھے کہ جد عالم ہوجائے - لہذا میر صاحب کی

تحصیل علمی پر روشنی پڑتی ہے اور پھر وہ صرف شاعر ہی نہیں رہتے -

(۵) سراج الدین علی خاں آرزو سے علحدگی کی تصدیق ہوتی ہے - مگر نہ اس طرح کہ آج آئے دو دن رہے اور دو دن کے بعد چل دیے - مگر نہ اس طرح جیسے کہ آزاد نے لکھا ہے - بلکہ عقلی و نقلی کی تکمیل کے بعد - اور عرصہ گزرنے پر -

(۶) خان آرزو سے علحدگی کے بعد ان کا دلی میں رہنا اور بہ فراغت زندگی بسر کرنا - اس سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے اس قول کی تردید ہوتی ہے - "دریں وحال بہ شاہجہان آباد آمد ' و تمتع نیافتہ ناکام برگشتہ در لکھنؤ میگزرانید" -

(۷) میر صاحب کا لکھنؤ جانا نواب آصف الدولہ کے ایما سے تھا - جیسا کہ انہوں نے ذکر میر میں بھی لکھا ہے - اس سے آزاد کے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ خود دلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے ' سراے میں ٹھہرے ' مشاعرے میں گئے ' یہ ہوا اور وہ ہوا -

(۸) میر صاحب کی شاعری دلی میں شروع ہوئی اور وہاں کی شہرت کو لکھنؤ میں چار چاند لگے -

(۹) میر صاحب نے لکھنؤ میں فارغ البالی سے زندگی بسر کی اور یہیں ان کے لڑکے ' لڑکی اور بیوی کا انتقال ہوا - اور یکے بعد دیگرے تین سال میں یہ سانحے در پیش ہوئے -

(۱۰) میر صاحب نے بد دل ہو کر مجالس شعر و سخن کو خیر باد کہہ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کی - مگر پھر بھی فکر سخن جاری رہی -

(۱۱) میر صاحب کا زمانہ مرض مدت طویل تھا - اور وہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۲۵ ھ میں بستر علالت پر گرے - چھ ماہ بیمار رہے آخر سنبھل نہ سکے

اور شعبان میں انتقال ہوا -

(۱۲) وہ قولنج کے قدیمی مریض تھے - وجع مفاصل کی وجہ سے اعضا بیکار ہوگئے تھے --

(۱۳) اگرچہ قولنج اور وجع مفاصل ان کی موت کا سبب بنے مگر ان کا انتقال اسہال کی زیادتی کے سبب سے ہوا - جن کو طبیبوں کی رائے کی خطا تو نہیں کہہ سکتے مگر موت کا بہانہ ضرور کہہ سکتے ہیں --

(۱۴) ان کے اوصاف ذاتی و جبلی نہایت ہی جامع طور پر بیان ہوئے ہیں - (ا) وہ متوکل تھے - اس لیے کہ وہ بزرگ زادے تھے اور ایسے بزرگوں کی آغوش شفقت میں پرورش پائی تھی کہ قناعت ان کا شیرۂ خاص ہے - (ب) وہ سپاہی پیشہ تھے - اس سے بھی کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ مختلف معرکوں میں شریک رہے - جس کا ثبوت ان کی کتاب ذکر میر اور ان کی بعض مثنویوں سے ملتا ہے - (ج) رقیق القلب ہونا ان کے تمام کلام سے ظاہر ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل ایک شیشہ تھا جو ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جانے کا احتمال رکھتا تھا - (د) پابند وضع، جہاندیدہ، سرد و گرم زمانہ چشیدہ - یہ سب باتیں اس لیے زیادہ صحیح ہیں کہ اول تو وہ زمانہ ہی وضعداروں کا تھا - دوسرے نوے برس کی عمر ان سب باتوں کی کفیل ہے - (ر) ان کی سخن سنجی کے بارے میں کچھہ لکھنا ہی بیکار ہے - جس قدر شعرا گزرے ہیں سب ان کو استاد مانتے رہے اور اب تک مانتے ہیں - (س) وہ کم اختلاط تھے - مگر اپنے احباب کے ساتھہ سراپا ارتباط تھے - یہ بات ان

کے تذکرے سے صاف صاف ظاہر ہوتی ہے - وہ اکثر لوگوں کا بیگانہ وار ذکر کرتے ہیں - مگر اپنے دوستوں کو طرح طرح کی تعریفوں اور دعاؤں کے ساتھہ یاد کرتے ہیں - (ط) وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے تھے جب تک اُن پر کوئی حملہ نہیں کرتا تھا - چنانچہ ان کی تمام ہجویہ مثنویاں اس کی شاہد عادل ہیں - (ع) وہ آخر تک فکر سخن میں منہمک رہے - چنانچہ دیوان پنجم اور ششم ان کی آخر عمر کا نتیجۂ فکر ہیں -

(۱۵) انہوں نے آخر میں یہ غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے :

ساز پسیج آمادہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

(۱۶) ان کا کلام تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے - اور وہ غزل، مثنوی اور مدح وذم کے استاد ہیں -

(۱۷) نماز جنازہ کے نمازیوں کی تعداد - جس سے میر کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے -

اس کے بعد ہم اس غزل کی نقل بھی ضروری سمجھتے ہیں جو اس دیوان چہارم میں زاید ہے اور مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے -

رنج کی اس کے جو خبر گزرے رفتہ رفتہ واقف اس کا مر گزرے
ایک پل بھی نہ اس کے آنسو پونچھے روتے مجھہ کو پہر پہر گزرے
جوئے خوں آنکھوں سے بہے شاید خون سے میرے وہ بھی در گزرے
مارے غیروں کو یا مرے عاشق کچھہ نہ کچھہ چاہیے کہ کر گزرے
راہ جاناں سے ہے گزر مشکل جان ہی سے کوئی مگر گزرے
غنچہ ہو شرم سے ان انکھوں کی گل نرگس اگر نظر گزرے

سر کا جانا ہے ہر قدم پر 'میر'
کیا کوئی اس کی راہ پر گزرے

یہ دوسری غزل غیر مطبوعہ مثنوی کے آخر میں ہے - اور ہم نے اس کو اول میں نقل کرنا زیادہ بہتر سمجھا تاکہ دو غزلیں ایک ساتھ دیکھنے والے کو مل جائیں —

غزل غیر مطبوعہ دیوان چہارم جو سب سے آخر میں ہے -

یہ * کاکول نہیں ٹلتی جی پر سے اس کے علاقہ ہوا جس کو خنجر سے اُس کے
سکھا دے ہے ہجراں کا غم دلبروں کو اُٹھے پھول کانٹے ہو بستر سے اُس کے
وہ بے رحم گھر سے بھی اپنے نہ نکلا گئیں نعشیں غم کشتوں کی در سے اُس کے
کبھو کھاوے گا آفتاب آفتابہ سحر دیر ہوتا ہے اب گھر سے اس کے

کہیں میر کے جلتے آنکھیں ہوں ٹھنڈی
کف پا ملو دیدۂ تر سے اُس کے

اس کے بعد میں اس غیر مطبوعہ مثنوی کی طرف توجہ کرتا ہوں جو اس دیوان کی مثنویوں میں آخری مثنوی ہے اور جو جنگ نامہ کے نام سے موسوم ہے —

یہ مثنوی سنہ ۱۲۰۹ ھ میں لکھی گئی - جس میں نعمیہ کے طور پر تاریخ نکالی گئی ہے —

سال تاریخ کا تھا مجھ کو خیال لطف کے رو سے کی ملک نے مقال
کاے سخن گستر جہاں اُستاد فتح نواب سے کر اب دل شاد

---

* یہ غزل دیوان چہارم میں کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے - ممکن ہے کہ کسی اور دیوان میں مل جائے - میں نے سب دیوانوں کی تلاشی نہیں لی - 'آسی' -

لطف کے رو - (ل) کے ۳۰ عدد مصرع فتح نواب الخ کے اعداد ۱۱۷۹ میں ملا دیے جائیں تو سنہ ۱۲۰۹ ھ ہوتے ہیں - غالباً یہ وہ لڑائی ہے جو آصف الدولہ کے زمانے میں سید غلام محمد خاں والی رام پور کی مسند نشینی اور سید محمد علی خاں کے قتل کے بعد واقع ہوئی - جس کے لیے نواب آصف الدولہ اوایل ماہ ربیع الاول میں الہ آباد سے روانہ ہوکر لکھنؤ آئے اور یہاں تین مقام کرکے رام پور کی جانب کوچ کیا —

اس جنگ کے وجوہات اور جو کچھہ بھی ہوں لیکن وجہ وجیہ یہ ہوئی کہ جب سنہ ۱۲۰۹ ھ میں نواب فیض اللہ خاں روہیلہ کا انتقال ہوا اور ان کے بڑے بیٹے محمد علی خاں زینت افزائے مسند حکومت ہوئے تو اسی وقت میں ان کے چھوٹے سگے بھائی غلام محمد خاں نے افاغنہ سے مل کر محمد علی خاں کا کام تمام کردیا - اور خود گدی پر بیٹھہ گیا - شدہ شدہ جب یہ خبر نواب آصف الدولہ تک پہنچی تو ان کو نہ صرف رنج ہوا بلکہ غصے کی وجہ سے انتقام کی آگ اُن کے دل میں بھڑک اُٹھی - اور اس کا سبب یہ تھا کہ محمد علی خاں دو مرتبہ آستانہ بوس وزارت ہو چکے تھے اسی لیے نواب وزیر ان کی رعایت کرتے تھے —

یہ وہ زمانہ تھا کہ مارکوئس کارنوالس بہادر ولایت جا چکے تھے اور اُن کی جگہ مسٹر جان شور گورنر کام کر رہے تھے - مسٹر جان شور کو بھی اس خون ناحق نے بے حد برافروختہ کردیا تھا - چنانچہ انہوں نے جنرل ابرکرمبی کو فوراً غلام محمد خاں کی گرفتاری کا حکم دیا - یہ اس وقت فوج کے کمانڈر انچیف تھے چنانچہ فوج انگریزی مع

آصف الدولہ بہادر کی فوج کے معہ توپ خانہ وغیرہ کے رام پور پر چڑھائی کرنے کے لیے تیار ہوگئی —

مورخین کا بیان ہے کہ اس توپ خانہ میں عجیب و غریب نام کی توپیں تھیں جن کے بعض نام یہ ہیں - دھوردھانی، فتح پیکر، نہلنگ، شیر پیکر، جم ڈکار، مُلک میدان، فتح بار، اجگر، خود پسند، کھنڈ دھاتی، کڑک بجلی، سرجیو، گھن گرج، سنگار دل، فتح لشکر، صف شکن، وزیری، جہانگیری، حیدری، سلیمانی، پھلجھڑی، فتحیاب، غباری، انگریزبان، شترنال، کرنال، ہتھہ نال وغیرہ جن میں سرجیو بہت بڑی توپ تھی - سید ولی اللہ نے تاریخ فرخ آباد میں لکھا ہے کہ نواب مظفر جنگ بنگش رئیس فرخ آباد اور رزیڈنٹ انگریزی چیری صاحب * بھی نواب کے ساتھہ تھے - چنانچہ پہلے کچھہ نواب کی فوج اور کمانڈر انچیف کی جمعیت روانہ ہوئی - اور اس کے بعد دو ایک روز کی تعویق سے نواب بھی روانہ ہوئے - چنانچہ پہلی منزل نول گنج میں دوسری الماس گنج میں تیسری سلطان گنج میں چوتھی قصبہ باون میں پانچویں سرمن نگر میں چھٹی شاہ آباد ضلع ہردوئی میں ساتویں شاہجہاں پور میں آٹھویں قریب ظہر کے ہوئی - انگریزی فوج بھی کڑی کڑی منزلیں طے کرتی ہوئی بریلی پہنچی اور لکھنؤ کی فوج کا انتظار کرنے لگی -

مؤلف عماد السعادت کا بیان ہے کہ اس لشکر میں بے شمار آدمی تھے - اور ایسے ایسے لوگ بھی شریک تھے جنھوں نے عمر بھر لکھنؤ سے باہر قدم نہ رکھا تھا —

غلام محمد خاں کے چھوٹے بھائی سید فتح علی خاں نے جو اُن کی

* یہ مسٹر الوف صاحب کے بعد رزیڈنٹ مقرر ہوئے تھے -

طرف سے نواب وزیر کے پاس بطور سفارت بھیجے گئے تھے اپنے بڑے بھائی کو اطلاع کی - وہ بھی ساٹھ ہزار فوج لے کر رام پور سے نکل کھڑے ہوئے - اور پہلی منزل ملک میں ہوئی - ادھر نواب وزیر کی فوج کی صحیح تعداد ۹۷ ہزار تھی —

نواب غلام محمد خاں نے موضع ملک میں تنخواہ میں اشرفیاں تقسیم کیں - اور بڑی داد دہش کر کے اپنی فوج کا دل بڑھایا - مگر پھر بھی احتیاطاً جنرل کرمبی کو لکھا کہ آپ بیچ میں پڑ کر نواب وزیر سے صلح کرا دیجئے - چونکہ آصف الدولہ کی فوج ٹلہر میں تھی اور بریلی اس وقت تک نہ پہنچی تھی اس واسطے جنرل مذکور نے لکھا کہ اچھا نواب وزیر یہاں تک پہنچ جائیں تو ایسا ہی کیا جائے گا - مگر شدنی امر وہاں اس بات کا یہ مطلب سمجھا گیا کہ انگریزی فوج نواب وزیر کی منتظر ہے - جب ان کی فوج بھی آجائے گی تو متفقہ حملہ ہوگا - اس واسطے غلام محمد خاں کی فوج آگے بڑھی اور دو جوڑہ تک آپہنچی - جنرل کرمبی کو جب یہ خبر ہوئی تو اس نے سفیر کو بلا کر کہا کہ تمہارے نواب کا ارادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا - ہم نے جو ان سے معاہدہ کیا تھا اب اس کو فسخ سمجھنا چاہیے - اور ان کو لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہیے - یہ کہہ کر اس کو رخصت کر دیا - اس کے بعد انگریزی فوج بھی بریلی سے آگے بڑھی اور سنگھا کے پل کے پاس قیام کیا —

اُدھر نواب غلام محمد خاں کو اب صلح کی اُمید جاتی رہی اور وہ آگے بڑھے اور موضع بھتورے کے کھیڑے پر ان کی فوج قبضہ کرنے لگی یہ جگہ انگریزی فوج سے دو میل کے فاصلہ پر تھی - اب فتح گنج یا فتح گنج غربی کے نام سے مشہور ہے - ۲۸ ربیع الاول سنہ ۱۲۰۹ ھ مطابق

۲۴ اکتوبر سنہ ۱۷۷۴ ع کو جنگ شروع ہوئی - اور جنرل کرنمبی کے ایک کپتان مسٹر رامزی کو غلام محمد خاں کی فوج پر حملہ کا حکم ہوا - مگر کپتان سے کچھ غلطیاں ہوئیں اور آخر کپتان رامزی کو شکست ہوئی - اور انگریزی فوج میں ابتری پھیل گئی - پھر بھی لفٹننٹ گاھن اور ریچارڈسن نے دوبارہ فوج کو درست کر کے صف بندی کی - مگر روھیلوں کے دل بڑھے ہوے تھے وہ انگریزی فوج میں گھس آئے اور خوب خوب لڑے یہاں تک کہ پچاس انگریزی سردار اور ڈھائی سو گورے اور دو ھزار نٹنگے کام آئے - چنانچہ لاشوں کو خندق میں ڈال کر پاٹ دیا - اور بے انتہا زخمی بریلی بھیج دیے گئے -

نواب سید غلام محمد خاں ایک ٹیلے پر سے مع اپنے بھائیوں کے تماشہ دیکھ رھے تھے انہوں نے جنرل کرنمبی کی ابتری دیکھکر وقت سے پہلے فتح کے شادیانے بجوا دیے - ادھر جو روھیلے انگریزی فوج میں گھس گئے تھے اُن کی کوئی مدد نہ پہنچی - ایک انگریزی افسر نے اس موقع کو غنیمت سمجھ اور چار توپوں سے روھیلوں پر حملہ کر کے آتشباری شروع کردی - تھوڑی دیر میں ھوا بدل گئی اور ایک ھزار روھیلے کام آئے - باقی منتشر ھو کر بھاگ گئے - شدہ شدہ روھیلوں کو کامل شکست ھوئی - نتیجہ یہ ھوا کہ سید غلام محمد خاں مع اپنے بعض صاحبزادوں کے رام پور کی طرف بھاگے اور یکم ربیع الثانی کو رامپور سے اپنے اھل و عیال سمیت دامن کوہ کی طرف بھاگے اور ایک گھاٹی میں پناہ لی - بعد شکست سید غلام محمد خاں آصف الدولہ بہادر کا لشکر بھی انگریزی لشکر میں مل گیا اور یہ فتح آصف الدولہ بہادر کے نام زد ھوئی - بعد کو نواب کو معافی دی گئی اور وہ

حج بیت اللہ کو چلے گئے * —

یہ ہے اس مثنوی کی حقیقت جو آپ ملاحظہ فرما چکے - اور جس کو مجمل طور پر تواریخ سے مدد لیکر لکھا گیا ہے - اب مثنوی ملاحظہ ہو —

جنگ نامہ

اب کے نواب رام پور آیا ناگہاں اس طرف خدا لایا
آگے آتا تھا بہر سیر و شکار بازی † یکسر روہیلی ہے اسوار
گرد تھی فوج کی سپہر تلک بن گیا اور ایک تازہ فلک
جمع افغاں پسر تھے اس جاگہ لیک سارے تھے جنگ نا آگہ
یہ نہ سمجھے وزیر کوہ وقار ہے تحمل سے رہ میں دیر گزار
یعلی تخریب ایک آن میں ہے روکشی اُن کی کسر شان میں ہے
بے تہی سے وے پھس جنگی کر دانتے ‡ دے دے گرے ہر اول پر
دیکھ کر لوگ تھوڑے ٹوٹ پڑے پکے پھوڑے کے رنگ پھوٹ پڑے
جھٹکے تلواروں میں فرنگی سے مرے مارے بہت کڈھنگی سے
تھا تہور نہ یہ شجاعت تھی ساعت جنگ یا قیامت تھی
تھے تلنگے روہیلے محو جنگ لوتھوں § سے ہو گیا تھا عرصہ تنگ
گورے کالے جدا جدا کیا تھے دونوں ¶ مردم گیاہ سے یکجا تھے

---

* اس واقعہ کو اور شاعروں نے بھی نظم کیا ہے چنانچہ در منظوم فارسی بھی اسی حال میں ہے جو مولوی غلام جیلانی رفعت کی تصنیف ہے - اسی حال کو میر صاحب نے بھی جنگ نامے کے نام سے لکھا ہے -

† یعنی اس مرتبہ سب روہیلے پن کی سی باتیں ہیں -

‡ یعنی کٹ کٹا کر گرے - § لاش -

¶ ایک گھاس کا نام جو آدمی کے مشابہ بتائی جاتی ہے

دیو کا بھی نہ ٹھہرے پا اُس جا تھا اُنھوں کا جہاں ثبات پا
سہل سردار سمجھا یہ مرنا اللہ اللہ ترا جگر کرنا
توپ پر آن کر چلی تلوار جھول کر زخم لڑموا سردار
صاحب اک اور اُس کی جا آیا جن نے ایسی بلا کو چلوایا
جنگ مغلوبہ تھے گتھے باہم مرتے تھے دونوں اور کے رستم
صاحب انگریز کے گرے اکثر تھک گئے لڑتے مرتے ہمدیگر
نہ کہ اک بار پہلو سے ماری صف الٹ دی حریف کی ساری
لشکری سب سراں سمیت رہے سبز جو کچھہ ہوے تھے کھیت رہے
لاش پر لاش گر کے ڈھیر ہوے بھوکے مرنے کے جی سے سیر ہوئے
پیچھے * سردار تھا پٹھانوں کا دیکھا جانا جو اُن نے جانوں کا
خواب غفلت سے چونک اُٹھا جاگا دست پاچہ ہوا گیا بھاگا
مارے بھاگوں کو فوج نے لوٹا مرگیوں میں سے بھی نہ اک چھوٹا
غارت از بسکہ لشکری لائے لاشوں سے اشرفی روپے پائے
وہ جو بھاگا تھا معرکے سے رئیس بھاگا یوں جیسے پیش اسپ سئیس
ہوتے جو ہیں رُھیلے ظلم شعار لُٹتے جاتے تھے شہر راہ گزار
رام پور † میں بھی آکے رہ نہ سکا وہ خدا گیر بات کہہ نہ سکا
بھاگا واں سے ہے لیکے کچھہ اسباب کہ لگا آیا لشکر نواب
لی پناہ اُن نے جا کے زیر کوہ واں بھی تھا ساتھہ کوہ انبوہ
تھا پہاڑوں کے آگے جنگل بھی وہیں نا کے پہ تھا یہ دنگل بھی

---

* اشارہ ہے نواب غلام محمد خاں کی طرف جو ٹیلے پر سے جنگ کا تماشا دیکھہ رہے تھے -
† جیسا کہ عبارت نثر میں ہم نے لکھا ہے کہ بعد شکست نواب غلام محمد خاں اہل و عیال کو لیکر دامن کوہ کی طرف چلے گئے -

واں ڈھیلے ہوئے اکٹھے سب بعد دو چار پانچ روز و شب
عجز کی راہ سے کیا پیغام ہم ہیں نواب کے کمینے غلام
بندہ رہتے ہیں باوجود خطا تمسے صاحب امید وار عطا
لطف کرے امید واروں پر رحم کرے گناہگاروں پر
ہم غلامی میں ہوتے ہیں حاضر اب نہ خدمت سے ہوویں گے قاصر
کسو صاحب کو ہو حضور سے حکم موجب طوع و رغبت دور سے حکم
کہ مجھے اپنے بانہہ لیجاوے پاؤں کتنے کہ عاجز آپ آوے
ذات نواب ہے کرم سیرت کہا صاحب کو تم بصد عزت
معرفت اپنی جاکے لاؤ اسے پاس خیمہ میں لا بٹھاؤ اسے
یا کہ خیمہ جدا کرو اِستاد ہم اُسے وقت پر کریں گے یاد
لایا صاحب چنانچہ خود جاکر پاس کرتا ہے تانفر جاکر
سر میں اُس کے خیال باطل تھا آپ بھی وہ جوان جاہل تھا
گفتگو میں کجی لگا کرنے ہوا مرجود مارنے مرنے
چاہتا تھا کہ آپ کو مارے بارے ہتیار چھن گئے سارے
رفقا کے تئیں نکال دیا رنجہ کر ٹہلوں کو ٹال دیا
اُٹھ گئے جو حرام زادے تھے ہو چکے دل میں جو ارادے تھے
عاقبت اُس کو باندھ کر بھیجا کہا پلٹن سے لکھنؤ لے جا
جمع تھے لوگ سو پریشاں ہیں رہ گئے ہیں سو عجز کیشاں ہیں
جنگ نے صبح کے تئیں ہے نہ شام آشتی کے ہیں اب پیام و سلام
غالباً صلح آج کل ہووے ہر طرف جملگی خیال ہووے
لوکے اب ملک و مال سب نواب راہ لیتے ہیں لکھنؤ کی شتاب
سال تاریخ کا تھا مجھکو خیال لطف کے روسے کی ملک نے مقال

کاے سخن گستر و جہاں استاد فتح نواب سے کراب دل شاد

سنہ ۱۱۷۹

میر کوئی غزل کہو اب تم ۳۰

لذت شعر میں رہو خود گم ۱۲۰۹

ہر چند کہ میر صاحب کی دوسری مثنویوں کے مقابلے میں یہ مثنوی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتی مگر چونکہ تاریخی ہے اس لیے اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے —

اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ محمد محسن المخاطب بہ زین الدین کون تھے - ان کے بارے میں کچھہ ایسے مختلف بیان ہیں کہ سمجھنا دشوار ہوگیا ہے - بہر حال ہم سب کی رائیں اور عبارتیں لکھ دیتے ہیں اور سب سے پہلے میر صاحب ہی کا بیان قلمبند کرتے ہیں - وہ لکھتے ہیں :—

کہ محمد محسن سلمہ اللہ - محسن تخلص کرتے ہیں اور میرے برادر زادہ ہیں - نہایت ذہین اور سلیقہ مند ہیں - مجھہ سے شعر ریختہ کی اصلاح لیتے ہیں - اس وقت ان کا سن بیس برس کا ہوگا - انشاءاللہ آگے چل کر عمدہ شعر کہیں گے - اس کے بعد ان کا کلام نقل کیا ہے - اور وہ اکتیس شعر ہیں —

میر حسن کا بیان ہے کہ محمد محسن ایک نوجوان ہے - سراج الدین علی خاں آرزو کے عزیزوں میں سے - وہ میر تقی میر کا برادر زادہ اور اکبرآباد کا رہنے والا ہے - شاعری میں نہایت مشاق ہے سراج الدین علی خاں آرزو کا تربیت یافتہ - سالار جنگ بہادر کے یہاں ملازم ہے - اب شعر گوئی کا اتفاق نہیں ہوتا - اول میں جو کچھہ کہا کہا اب شعر نہیں کہتا - یہ شعر ان کے قدیم کلام سے لکھے جاتے ہیں -

اس کے بعد جو شعر لکھے ہیں ان میں سے چھہ سات شعر وہی ہیں

جو میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں لکھے ہیں —

اب لیجیے تذکرۂ حکیم قدرت اللہ قاسم کو انہوں نے وضاحت کے ساتھہ حال لکھا ہے مگر بالکل الگ - وہ کہتے ہیں کہ محمد محسن محسن ' سراج الدین علی خاں آرزو کے قریب عزیز تھے اور میر تقی میر کے بھی رشتہ دار تھے - بقدر ضروریت عربی بھی جانتے تھے - اور کتب متداولۂ فارسی پر بھی عبور تھا - نہایت سلیم الطبع اور نہایت خوش گو - خان آرزو کے انتقال کے بعد ان کے تمام مال و متاع کے یہی وارث قرار پائے - زیادہ تر فارسی کا شعر کہتے تھے مگر اردو کا بھی دیوان کہا جو اب ناپید ہے - چار شعر بقدموں کی زبانی سنے ہیں وہی لکھتا ہوں - اس کے بعد چار شعر نقل کئے ہیں - اور لطف یہ کہ وہ چاروں شعر بھی میر کے تذکرے میں محسن کے نام سے موجود ہیں -

قائم کا بیان ہے کہ محمد محسن ایک جوان آدمی ہیں - خان آرزو کے بھانجے میاں حسن کے لڑکے - نہایت صحیح ذوق شعر اُن میں موجود ہے - کہتے رہے تو خوب کہیں گے - اس کے بعد ۲۲ شعر نقل کیے ہیں - اور یہ سب وہی ہیں جو میر صاحب نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں -

مولوی مسعود حسن صاحب ادیب لکچرار یونیورسٹی نے محسن کو کلیم کا لڑکا بتایا ہے - اور غالباً یہی صحیح ہے - مغالطہ کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ کلیم میر صاحب کے بہنوئی تھے - اور وہ اُن کی نہایت تعظیم کرتے تھے - ان کو بزرگ مانتے تھے اس لحاظ سے اُن کو بھائی اور اُن کے لڑکے کو برادر زادہ لکھا ہے - اور بس -

اب تجلی کا حال سن لیجیے جن کے ہاتھہ کا یہ دیوان لکھا ہوا ہے - میر صاحب نے اپنے تذکرۂ نکات الشعراء میں تجلی کا کوئی ذکر نہیں

کیا - مگر مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں لکھا ہے کہ وہ ایک جوان آدمی ہیں ریختہ گوئی میں بے نظیر ہیں - میر تقی میر کے بھانجے ہیں - ایک بہت بڑا دیوان ترتیب دیا ہے - مثنوی لیلیٰ مجنوں اور اکثر مسدس اور مخمس خوب خوب کہے ہیں - بحر کامل میں ان کی اکثر غزلیں ہیں جو شاہجہاں آباد کے لوگوں کی زبان پر ہیں - اب قریب چالیس برس کے عمر ہے - فرقۂ سپاہگری میں اعزاز و امتیاز کے ساتھہ عمر بسر کرتے ہیں - میرے گہرے دوست ہیں خدا سلامت رکھے - اس کے بعد کچھہ کلام ہے - ان کا عرف میاں حاجی ہے —

تذکرہ تاسم میں لکھا ہے کہ وہ پہلے دہلی میں عرب سرائے میں رہتے تھے اور بعدہ لکھنؤ چلے گئے وہیں انتقال کیا - انہوں نے غلطی سے ان کا محمد محسن نام لکھا ہے - حالانکہ ان کا نام محمد حسن تھا - اور چھوٹے بھائی کا محمد محسن - باپ کا محمد حسین نام کلیم تخلص - اور انہیں میر صاحب کی صاحب زادی منسوب تھیں، جیسا کہ ان کے چھوٹے بھائی کا بیان ہے اور اس دیوان کی عبارت سے پتہ چلتا ہے -

اب ہم ان مُہروں کا ذکر کرتے ہیں جو اس دیوان پر لگی ہیں - دیوان کے ٹائٹل پر تین مہریں ہیں -

مہر اول، بالکل پڑھی نہیں جاسکی - سرخ رنگ سے قریب ڈیڑھ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی ہے - اور اس میں کوئی شعر ہے جو پڑھا نہیں جاتا -

مہر دوم، سلیماں جاہ کے کتب خانہ کی ہے - جو قریب قریب ۱-۱/۴ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی ہے سرخ رنگ ہے اور اس میں یہ شعر ہے -

خوش است مہر کتب خانۂ سلیماں جاہ

بہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ سنہ ۱۲۴۴ ھ

تیسری مہر، سلطان عالم واجد علی شاہ آخری تاج دار اودھ کے کتب خانے کی ہے جس پر یہ شعر ہے -

خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب

ثابت و پرنور بادا چوں فروغ آفتاب سنہ ۱۲۶۳ ھ

یہ بھی سرخ رنگ سے لگی ہے - ایک انچ سے زیادہ چوڑی اور دو انچ لمبی ہوگی - اوپر سے کچھہ نقش و نگار بھی ہیں -

ختم کتاب کے صفحہ پر ایک مہر زاید ہے وہ امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی ہے - یہ بھی سرخ رنگ سے لگی ہے اور سب سے بڑی ہے - مہر کا شعر یہ ہے -

ناسخ ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب

خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

یہ دیوان پختہ مگر معمولی خط میں ہے مگر نہایت صحیح ہے —

میر صفیر بلگرامی اور میرزا غالب

از

(جناب قاضی عبدالودود صاحب)

میرزا غالب کے دوست، شناسا اور شاگرد بہت تھے، لیکن ان میں سے کم ایسے ہیں جنھوں نے میرزا سے اپنی ملاقات اور ان کی طرز بود و ماند کا ذکر تفصیل کے ساتھ لکھا ہو - میر فرزند احمد صفیر بلگرامی میرزا کے آخری زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے تھے، اور سنہ ۱۲۸۲ ھ میں دہلی جاکر ڈھائی مہینے میرزا کے مہمان رہے تھے - صفیر مرحوم نے اپنے تذکرے موسوم بہ جلوۂ خضر میں میرزا سے اپنی ملاقات کا حال بالتفصیل درج کیا ہے، اور شعر اردو اور زبان سے متعلق میرزا نے ان کے سامنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا انہیں بھی قلم بند کردیا ہے - اس تذکرے کے حصۂ اول کی پہلی جلد سنہ ۱۳۰۲ ھ میں شائع ہوئی، اور دوسری سنہ ۱۳۰۷ ھ میں - میرزا کے حالات جلد اول میں صفحہ ۲۱۸ سے ۲۲۸ تک درج ہیں - میرزا کے خیالات مومن خاں کے حالات کے ذیل میں نقل کیے ہیں، جو (جلد اول ص ۲۳۵ تا ۲۴۰) - دوسری جلد میں پانچ خطوط ہیں جو میرزا نے صفیر مرحوم کو لکھے تھے - اس جلد میں اپنے حالات کے ضمن میں تمام دہلی اور میرزا کی اصلاح کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"میں نے حضرت غالب کی ملازمت اور شاگردی کی کیفیت جلد اول ... میں لکھ دی ہے ' اب دوبارہ لکھنے کی ضرورت ' نہیں - مگر اتنا لکھنا ضرور ہے کہ سنہ ۱۲۸۲ ھ میں محرم کے مہینے میں حضرت کی ملازمت کے لیے دہلی گیا ' اور دو ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا ... اصلاح کی کیفیت یہ تھی کہ حضرت شاگرد کا کلام خرد اپنی چشم مبارک سے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے اصلاح دیتے تھے ' چنانچہ رسالہ فیض صفیر ... حضرت نے کئی روزوں میں خود اپنی آنکھ سے ملاحظہ فرمایا اور جابجا اصلاح دی اور اس کی تقریظ لکھی جو عود ہندی میں چھپی ہے - اور کلام فارسی و اردو کی اصلاح بھی اکثر ہوا کی ہے" —

میر صفیر مرحوم کے بیان میں بعض باتیں محل نظر معلوم ہوتی ہیں :

(۱) میرزا کا دبیر کو بے مثال قرار دینا اور انیس کا ذکر تک نہ کرنا -

(۲) میرزا کی غذا - اس کے متعلق حالی اور صفیر کے بیان میں بہت فرق ہے —

(۳) فارسی شاعری کی مختلف طرزوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ' وہ لفظ بہ لفظ میرزا کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو اردوے معلی میں موجود ہے - حیرت کی بات یہ ہے کہ بجنسہ انہیں الفاظ میں خیالات کا اظہار دوبارہ کیا گیا ' اور جو باتیں خط کی تحریر کے وقت یاد نہ آئی تھیں وہ تقریر کے وقت بھی فراموش رہیں - مثلاً ناسخ و آتش کے اشعار —

(۴) میر صفیر مرحوم ناسخ کے شاگرد تھے، لیکن ناسخ سے جو عقیدت انھیں تھی وہ ان سے براہ راست مستفید ہونے والوں میں بھی کسی کو نہ ہوگی - جب وہ ناسخ کے متعلق کچھہ لکھتے ہیں، تو قصیدے کا انداز آجاتا ہے - اس لیے یہ بخوبی ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر ناسخ کے متعلق کچھہ ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہوں، جو در اصل غالب کی بہ نسبت خود ان کے ذاتی خیالات سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں - اب میر صفیر مرحوم کا بیان ملاحظہ کیجیے —

سنہ ۱۲۸۰ ہجری میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا حضرت صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا، رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خان بہادر نادر سے ملاقات کا لطف اٹھایا - جب مارہرے پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا، وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربط خاص تھا، مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد مثنوی ابر گہربار اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا - میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بہ فرمایش تفضل حسین خاں (جاھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) لکھا تھا اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر بلگرام آیا - اور وہاں سے آرے پہنچا، حضرت غالب نے اس مخمس پر

ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا - جب میں نے بوستان خیال کو اردو کر کے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا' میں نے ایک جلد بھیج دی - اس وقت سے خط و کتابت رہی' یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے سنہ ۱۲۸۲ ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دھلی چلنے کی تحریک کی اور بے شان گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھہ مع چند ملازموں کے روانۂ دھلی ہوا - آموں کا موسم تھا نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھہ کر دیے - میں علی گڈھ سے دھلی روانہ ہوا - دس بجے شب کو دھلی پہنچا - شب جملہ پار لال قلعے کے نیچے بسر کی' صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلّی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا - حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے' ماموں صاحب بھی حاضر ہوے' دیکھہ کر بشاش ہوگئے' اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا پوچھا یہ کون ہیں عرض کیا صفیر - ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا - برلے ذرا ٹھہر جائیے - یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے' اور برآمدے سے اندر آکر بیٹھے' گرمی کے دن تھے' صفر کا مہینہ تھا - حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا' پاجامہ سیاہ بوتے دار دریس کا' کلی دار' نیفہ سرخ ململ کا' بدن میں مرزائی' سر کھلا ہوا' رنگ سرخ سفید' منہ پر داڑھی دو انگل کی' آنکھیں بڑی' کان بڑے' قد لمبا' ولایتی صورت' پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھہ گئی تھیں' اور یہی سبب

تھا - کان کی سماعت میں کچھہ ثقل آ چلا تھا —

الغرض اندر آکر بیٹھے ' بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں ' اتنے میں نواب ضیاءالدین خان بھی تشریف لاے ' حضرت نے مجھے ان سے ملایا - وہ بھی وجیہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے ' کرتا پہنے خلطہ دار پاجامہ ' سر پر توپی ' جریب ہاتھہ میں ' بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں ' اس کے بعد کچھہ ان سے سرگوشی ہوئی - جب وہ اُٹھہ گئے اور دو پہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا - ہر جگہہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے اور یہ فلاں کام کے واسطے ' آخر زینے کے پاس آے - اور چھت پر چلے ہم لوگ بھی ساتھہ تھے اوپر جاکر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرا گلی کے رخ بنا ہوا تھا ' لطیفہ :- فرمایا میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے ' میں نے کہا سمجھا ' یعنی گرمی کے دن ہیں دہلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے ' الغرض پھر کوٹھے کے نیچے آے اور فرمایا اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں ' اس لیے ضیاءالدین خان صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے ' آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے ' گو تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا - میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے فرمایا کچھہ ایسا دور نہیں ہے ' یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور

ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا - جب میں نے بوستان خیال کو اردو کر کے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا' میں نے ایک جلد بھیج دی - اس وقت سے خط و کتابت رہی' یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے سنہ ۱۲۸۲ ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دھلی چلنے کی تحریک کی اور بے شان گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھہ مع چند ملازموں کے روانۂ دھلی ہوا - آموں کا موسم تھا نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھہ کردیے - میں علی گڈھ سے دھلی روانہ ہوا - دس بجے شب کو دھلی پہنچا - شب جملہ پار لال قلعے کے نیچے بسر کی' صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلّی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا - حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے' ماموں صاحب بھی حاضر ہوے' دیکھہ کر بشاش ہوگئے' اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا پوچھا یہ کون ہیں عرض کیا صفیر - ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا - برلے ذرا ٹھہر جائیے - یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے' اور برآمدے سے اندر آکر بیٹھے' گرمی کے دن تھے' صفر کا مہینہ تھا - حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا' پاجامہ سیاہ بوتے دار دریس کا' کلی دار' نیفہ سرخ ترل کا' بدن میں مرزائی' سر کھلا ہوا' رنگ سرخ سفید' منہ پر داڑھی دو انگل کی' آنکھیں بڑی' کان بڑے' قد لمبا' ولایتی صورت' پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہوکر اینٹھہ گئی تھیں' اور یہی سبب

تھا - کان کی سماعت میں کچھہ ثقل آ چلا تھا —

الغرض اندر آکر بیٹھے ' بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں ' اتنے میں نواب ضیاءالدین خان بھی تشریف لاے ' حضرت نے مجھے ان سے ملایا - وہ بھی وجیہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے ' کرتا پہنے خلطہ دار پاجامہ ' سر پر ٹوپی ' جریب ہاتھہ میں ' بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں ' اس کے بعد کچھہ ان سے سرگوشی ہوئی - جب وہ اُٹھہ گئے اور دو پہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا - ہر جگھہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے اور یہ فلاں کام کے واسطے ' آخر زینے کے پاس آے - اور چھت پر چلے ہم لوگ بھی ساتھہ تھے اوپر جاکر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرا گئی کے رخ بنا ہوا تھا ' لطیفہ :- فرمایا میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے ' میں نے کہا سمجھا ' یعنی گرمی کے دن ہیں دھلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے ' الغرض پھر کوٹھے کے نیچے آے اور فرمایا اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں ' اس لیے ضیاءالدین خان صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے ' آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے ' گو تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا - میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے فرمایا کچھہ ایسا دور نہیں ہے ' یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور

میرے ساتھہ کیا' اس مکان میں پہنچے' وہ مکان عالی شان تھا ایک بڑا پیاٹک برسر سڑک تھا' جس پر ایک بنگلا خوشنما بنا ہوا اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ' اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ سجا سجایا' اس کی پشت پر محل سرا دونوں بغلوں میں کمرے' غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا' ہم سب ۶ آدمی تھے' اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے - الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوشنما پڑے تھے انہیں رفیق کے ساتھہ آئے' معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوش بو تخمی آم تھے میں نے خیال کیا کہ جب یہ آم خود ایسے ہیں پھر میرے ساتھہ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں - الغرض کھانا کھایا بہت مزے دار اور خوش گوار تھا' قورمہ' قلیہ' شیر مال' پلاؤ' زردہ' شیر برنج' متلنجن' کباب' پراٹھا سب کچھہ تھا' بعد کھانے کے آم جو کھانے بیٹھا' صورت حرام نظر آئے بالکل کھٹے' میں پورب کے آم کھائے ہوے تھا' بڑی نفرت ہوگئی' اپنے ساتھہ کے آم نکال کر کھائے اس سے کہیں بہتر پائے' پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا' وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھہ کر آئی جس کا آخر مصرع مجھے یاد ہے - "کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم" - اور سب آم منگالیے - آم کا شوق حضرت کو بہت تھا' الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا' آموں کی بہت تعریف کی - قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا - صبح کو فیض صفیر رسالہ تذکیر و تانیث کا لے کر گیا' حضرت نے خود لے کر اسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا اور چار روز میں تمام رسالہ دیکھہ ڈالا اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھہ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھہ چھپی ہے' اور عود ہندی

میں بھی موجود ہے ' ہر روز کی ملازمت سے طبیعت بہت محظوظ ہوتی رہی ہے —

ایک دن قریب دو پہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پنکھی کے حاضر تھا ' بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیوگے میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پیدا ہو تو پلوائیے ' ہنسکر بولے ضرور - اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کوئیں سے پانی لے آؤ ' میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا - فرمایا برف ہی کا ہے ' غرض پانی آیا ' پیا واقعی سرد تھا ' فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے - ایک دن ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا ' میرے سامنوں صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا منھم ' اور میری طرف اشارہ کرکے فرمایا مِنّا —

ایک دن مرثیے کا ذکر آگیا فرمانے لگے کہ میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا ' تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہوگیا وہ بند یہ ہیں :-

مرثیۂ فرمودہ حضرت غالب

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو　　اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو　　اے ماتمیان شہ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی　　اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی
تاب سخن و طاقت غوغا نہیں ہم کو　　ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو　　گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہ تہہ پایہ جو مدت سے بچا ہے　　کیا خیمۂ شبیر سے رتبہ میں سوا ہے
کچھہ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا　　کچھہ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا　　ہوگا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب قہر میں اور برق میں کچھہ فرق نہیں ہے　　گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

پھر فرمایا کہ واقعی یہ حق مرزا 'دبیر' کا ہے' دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا' ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھہ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لیے معمولی پلاؤ' قورمہ' قلیہ' شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہے' آج آپ میرا کھانا دیکھیے' الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا - ایک دستر خوان بچھایا گیا اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا' اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور ایک تانبے کی رکابی میں تین پھلکے ڑوے کے - اور ایک رکابی تانبے کی خالی' پھر وہ رفیق آکر بیٹھے' انہوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے اور خالی رکابی میں رکھے' پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربہ لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھہ دیا' اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اُترے اور دستر خوان پر آبیٹھے - پہلے وہ دو لقمے نوش جان فرمائے' اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے' البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا - اور کھا چکے - اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے - شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں —

ایک دن نواب ضیاءالدین خاں نے میری دعوت کی' بہت تکلف کا کھانا کھلایا' میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کرسکتا' بہت دیر تک باتیں ہوا کیں' ایک دن مولوی صدرالدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے - ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا —

ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بٹھا گیا - وہ میلا بھی قابل دید تھا، دھلی کا میلا کیا کہنا ہے - میں نے دھلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی - جامع مسجد کو دیکھا - سبحان اللہ کیا کہنا ہے - تبرکات کی زیارت کی جناب امیر اور حسنین علیہم السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوے دیکھے - خط کوفی میں تھے، چوک کی سیر روز کرتا تھا - بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دھلی عجب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو - کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو، خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان خمخانہ میں چھپی ہیں —

غرض دھلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لطف اُٹھائے، آخر رمضان سنہ ۱۲۸۲ ہجری تک آرے چلے آئے، جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی، آخر سنہ ۱۲۸۵ ہجری میں انتقال فرمایا —

کلام معجز نظام ان کا فارسی اور اردو ہر جگہ موجود ہے -

مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمتہ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دھلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالے کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے - حضرت نے دیکھ کر فرمایا ہاں، اس کو دیکھو یہ ایک چیز میں نے ان دنوں

بہ فرمایش ڈاکٹر صاحب لکھی ہے ' اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے ' کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا ' جناب ڈاکٹر صاحب نے مؤلف کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجیے ' چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا - مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے بھیج دیا تھا ' پھر خدا جانے کیا ہوا ' اسی طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا ' وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے ' الغرض اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا - فرمایا ' میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ' ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا ' اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے ' مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے ' ہاں قواعد لکھ نہیں گیا - قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے - ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا ' مگر یاد رہے ' اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا ' پھر ہنس کر فرمانے لگے ' اس زبان پر اس کے سوا اور ہونا کیا - میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا ' جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشوونما ہو سکتا تھا ' مگر یاروں نے چلنے نہ دیا - اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے ' میاں ' جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا ' جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سنا ہو گا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں ' اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے ' اس وقت فارسی کی شاعری دہلی میں بہت چمکی تھی ' مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال

میں تھی ' اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی داں سب اس کی تقلید پر چلنے لگے ' اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری کی - مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دینا تھا - کچھہ ایسی دقت نہ ہوئی ' پھر بھی چلتے لوگوں نے ' ادھر توجہ کی ' ہر ایک کی ایک نئی طرز ہوگئی - مگر ناسخ کے کلام نے (جس کو علم درکار تھا اور قاعدے کے پر تو پر ڈالا گیا تھا) دھلی میں آکر سب کو حیران کر دیا - اور قاعدے کے سانھہ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا ' دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا ' یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا ' اس وقت ہم تین شاعر باشراق نام برآوردہ تھے ' میں اور مومن خان اور ذوق ' ذوق نے ادھر کم رغبت کی - کیونکہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی ' زبان کی طرف کب خیال کرسکتے ہیں ' مگر مومن خان نے خیال کیا - پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے - شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے ' مگر مومن خان نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کے طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی ' ادھر میں نے بھی ' غرض ہم دونوں دھلی کے طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوے ' مگر جب بہت کچھہ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہوگئی - اور کوئی ناسخ سے نہ ملی - میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا ' اور مومن خان اپنے اسی رنگ میں رہے ' خلاصہ یہ کہ دھلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤگے اور اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہوگئی ' وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے ' ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھہ ہوا وہ کیا مگر یاد رہے کہ مضمون دھلی کا اور زبان

لکھنؤ کی مستند ہے ' ایک تمہارے بحر صاحب فرماتے ہیں —

' نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے '

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی ' بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے - اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند شعر پڑھے ' میں نے عرض کی کہ حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جانے اور باندھنے سے کام ہے ' عشق و عاشقی ان کی بلا جانے ' نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق ' ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہوَ ھُوَ ہُوجاتا ہے —

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں ' میں چھپرے میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا ' وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے ' مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے ' میں نے چند شعر پڑھے ' منجملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا —

کس وقت سے ہم جام ہتیلی پہ لیے ہیں
لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے ' آپس میں کہنے لگے ' بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے ' جناب پھر پڑھیے گا میں نے پھر پڑھا ' ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا ' اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں ' اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا - جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا ' فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے - حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آجائے اس کو باندھ دینا چاہیئے - کیا غریب معشوق نہیں ہوسکتا ہر ایک کا معشوق

الگ ہوتا ہے - کسی کو گورا پسند ہے ' کسی کو سانولا - ' معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت است ' کا حال ہے - یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے ' مگر میاں میں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے ' وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودکی اور فردوسی سے لیکر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ہے ' ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے ' پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہیں سعدی ' جامی و ہلالی ' یہ اشخاص متعددہ ہیں - فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا ' خیالہائے نازک اور معانیٔ بلند کا - اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے ' سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑگئی - اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پرواز دیا ' صائب و کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں ' رودکی و اسدی و فردوسی یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا - اور سعدی کی تحریر نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا - فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے - تو اب طرزیں تین ٹھہریں - خاقانی اس کے اقران ' ظہوری اس کے امثال ' صائب اس کے نظائر ' اب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہوگیا - جس کو بظاہر عشق مجازی کا زینۂ آخر ' اور حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں ' اُن کا کیا پوچھنا - اور جو مجازی میں پورے نکلے ' وہ بھی قدم بقدم ٹھہرے اور ان کے بعد کے درجے والے سب حقیقی میں ہیں —

اگرچہ شاعران نغز گفتار زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم ورائے شاعری ' چیزے دگر ہست

وہ چیز دگر حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر -

بد نام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا - دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم - قائم اور تجھہ سے طالب بوسے کی کیونکر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں - تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کمتر، آتش کے یہاں بیش تر، یہ تیز نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں، میں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں کے شعر عرض کروں، فرمایا، ہاں پڑھو —

ناسخ - یہی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا
کہ اک ذات خدا ہے، اور میں ہوں
جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم
وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سروکار مہربان
کرتے رہو جفاہی، وفا گر نہ ہوسکے
مر چلا ہوں اُمید واری میں
ایسے ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں، ان میں بعض نشتر

ہیں ' پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے —

آتش - آے بھی لوگ بیٹھے ہیں ' اُٹھ بھی کھڑے ہوے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دم آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آے
رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اس بلاے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک ' دل سے نازک خوے دوست

سجدۂ شکر خدا یا میں کہے رکھتا ہوں
قدم یار پہ ہے سر کو جھکانا شب وصل

یہ شعر سن کر فرمایا ' ان میں بھی بعض -

مقالات گارساں دتاسی

ہندوستانی زبان و ادب سنہ ۱۸۷۱ع میں

(مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب
پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

پچھلے سال، جو فرانس کے لیے انتہائی نامردی کا ثابت ہوا، ہندوستان برابر ترقی کے راستے پر گامزن رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا قدم بہ نسبت پیشر کے زیادہ مستعدی سے اٹھہ رہا ہے۔ میں اس سال کے تبصرے میں اس ترقی کا ذکر کروں گا۔ میں یہاں یہ دہرانا نہیں چاہتا کہ اردو زبان نشوونما پا رہی ہے اور اس کی وسعت بڑھتی جاتی ہے اور نہ اس موقع پر اس جھگڑے کا تفصیلی ذکر کروں گا جو اردو اور ہندی میں کچھہ عرصے سے پیدا ہوگیا ہے۔ ہندی وہ بولی ہے جو اردو سے پہلے سے موجود ہے اور اب بھی اس کے ساتھہ موجود ہے۔

سورت، کے ایک ہندو عالم نے جن کا نام گنپت رام ہے اور جو اپنے دوسرے اکثر ہم مذہبوں کے خلاف تعصب سے پاک ہیں اور محب وطن ہیں، ابھی حال میں ایک خط شائع کیا ہے جس میں تمام ہندوستان کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ اس مقصد کے لیے ہندوستانی سے زیادہ موزوں اور کوئی زبان نہیں ہے۔

مسلمانوں کی ہندوستان کی فتوحات کے بعد اس زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش ہوگئی ہے - * موصوف اس خط میں لکھتے ہیں کہ دیوناگری خط جو ہندی میں استعمال ہوتا ہے فارسی رسم خط کے مقابلے میں ہندوستانی زبان کے لیے زیادہ موزوں ہے - یہ خط سید احمد خاں کے نام ہے اور ۲۶ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع کے علی گڑھ اخبار میں شائع ہوا ہے —

گلپت رام نے اپنے خط میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ دوسرے ملکوں کے خلاف جن میں ایک زبان بولی جاتی ہے ہندوستان مشترک زبان کے فوائد سے محروم ہے - ہندوستان میں عام طور پر صوبجاتی زبانیں بولی جاتی ہیں اور کچھ عرصے سے انگریزی زبان نے ملک پر دھاوا کردیا ہے - لیکن اب ان مختلف صوبوں میں رسل وسائل کے سلسلے عام طور پر قایم ہوگئے ہیں - گزشتہ زمانے میں یہ سہولت موجود نہیں تھی جب کہ ہر صوبہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا اور دہلی کا اقتدار اعلیٰ محض اخلاقی حیثیت رکھتا تھا - مختلف صوبوں کے ہندوستانیوں کے لیے گر وہ اردو نہیں بولتے تو آپس میں ایک دوسرے کا مطلب سمجھنا بہت دشوار ہوتا ہے اس لیے کہ ان کی بولیاں بالکل مختلف ہوتی ہیں - حکومت کے انگریزی ملازموں کا جب ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبادلہ ہوجاتا ہے تو انہیں بالکل نئی زبان سیکھنی پڑتی ہے —

یہ بات یقینی ہے کہ ہندوستان میں اگر ایک مشترک زبان رائج ہوجاے تو اس سے ملک کی فلاح و بہبود کی ضمانت ہوگی اور ملک کو

---

* ہندوستانی زبان کے الفاظ تمام ایشیا میں استعمال کیے جاتے ہیں - دیرمون درویل نے لکھا ہے کہ تونگا تابو Tonga-Tabou (بحر اوقیانوس میں ایک جزیرہ) میں قومی جشنوں کو "ناچی" کہتے ہیں جو لفظ ناچ کا بگڑا ہوا ہے - ان موقعوں پر ناچ گانا ہوتا ہے —

ترقی حاصل ہوگی جس کے لیے بہت سے مخلص لوگ کوشاں ہیں - گنپت رام نے اپنے خط میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہر صوبے میں اس خاص مقصد کے لیے ایک مجلس بنائی جاے اور اس خیال کو عام کرنے کے لیے کویلی مجالس بنائی جائیں - ہندوستانی زبان کا ایک رسالہ دیوناگری خط میں اس مقصد کی نشر و اشاعت کے لیے جاری کرنا چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ سے سارے ہندوستان میں اس زبان کو رائج کرنے کا کام لیا جاے - پھر دوسری زبانوں کے اخبار نویسوں کو آمادہ کرنا چاہیے کہ ہندوستانی زبان میں اپنے اخبارات و رسائل کو شایع کریں اور سواے اس کے اور کوئی زبان نہ استعمال کریں - اسی طرح ہندوستانی زبان میں کتابیں تالیف و تصنیف ہونی چاہییں - ظاہر ہے کہ یہ اصلاحی کام ایک دم سے نہیں کیا جاسکتا - آہستہ آہستہ صبر و استقلال کے ساتھہ ہندوستانی زبان سارے ملک میں پھیل سکتی ہے —

اس کے ساتھہ حکومت سے درخواست کرنی چاہیے کہ سوائے ہندوستانی زبان کے اور کسی دوسری زبان کو کالجوں اور اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے اور اسی زبان میں نصابی کتابیں شایع کی جائیں - بلاشبہ حکومت خوشی سے اس تجویز کو منظور کرلے گی —

ممکن ہے اس پر لوگ آمادہ نہ ہوں کہ سارے ہندوستان میں سواے ہندوستانی کے اور کوئی زبان بولی ہی نہ جاے لیکن یقیناً اس پر سب راضی ہوجائیں گے کہ ہندوستانی کی تعلیم سارے ملک میں عام کی جائے تاکہ ہر شخص تھوڑا بہت اس زبان میں گفتگو کرسکے اور ایک مشترک رسم خط کی وجہ سے کل ملک کے پڑھے لکھے لوگوں میں باہمی تبادلۂ خیالات ممکن ہوسکے —

اس ضمن میں ہندوستانی پر نظر انتخاب اس لیے پڑتی ہے کہ بہت زمانے سے یہی زبان کل ملک میں پھیلی ہوئی ہے - اب ضرورت اس کی ہے کہ اس کا استعمال اور وسیع کیا جاے اور اس کو سارے ہندوستان کی سرکاری اور ادبی زبان بنایا جاے جس طرح کہ اب بھی ایک حصۂ ملک کی وہ ادبی اور سرکاری زبان ہے - بعض لوگ یہ کام انگریزی زبان سے لینا چاہتے ہیں لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ زبان ہندوستانیوں کے لیے اس درجہ اجنبی ہے کہ وہ کبھی بھی عام زبان نہیں بن سکتی - گلپت رام اور اس کے اکثر ہم وطن بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان اسی خیال کی حمایت میں ہیں - انگریزی بہت عرصے تک ذریعۂ تعلیم بھی نہیں رہ سکتی جیسا کہ سید عبداللہ اور کرنل نسولیز نے دوسرے مستند ہندوستانی لوگوں کی طرح صاف صاف کہا ہے - یہ بات مسلم ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں ہندوستانی بہ اعتبار اپنی نزاکت اور خوبی کے اور دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے - بابو گلپت رام نے اپنے ہم مذہبوں کی خاطر جو یہ خیال پیش کیا ہے کہ دیوناگری رسم خط کو فارسی رسم خط پر ترجیح دینی چاہیے تو میں افسوس کے ساتھہ کہتا ہوں کہ میں اس راے سے متفق نہیں ہوں - اس کے وجود میں پہلے بھی متعدد مرتبہ بیان کر چکا ہوں - اصطلاحات کے متعلق بھی بابو صاحب کہتے ہیں کہ اگر سہولت ہو تو عربی زبان سے انہیں مستعار لیا جاے لیکن وہ سنسکرت الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں -

ظاہر ہے کہ اس صورت میں ضروری ہوگا کہ ہندوستانی زبان کو وسیع کیا جاے اور بہتر بنایا جاے اور اس میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں - جس طرح کہ پچھلے چالیس سال سے آجکل کے یونانی اپنی زبان

کے متعلق کر رہے ہیں - اس طرح ہندوستانی زبان کی سطح بھی بلند کی جا سکتی ہے اور دنیا کی وقیع زبانوں کے پہلو بہ پہلو یہ اپنا مرتبہ حاصل کر سکتی ہے —

یہ اعتراض کیا جا رہا ہے کہ اگر ہندوستانی زبان کو کل ملک کے لیے اختیار کیا گیا تو صوبجاتی زبانوں کی طرف عام طور پر بے توجہی برتی جائے گی - لیکن ہماری رائے میں اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ جو قومی فائدہ حاصل ہوگا وہ زیادہ اہم ہوگا - پھر اگر مقامی زبانوں میں کوئی تصنیف واقعی دلچسپ اور مفید ہوگی تو کوئی امر مانع نہیں کہ لوگ اسے اصلی حالت میں نہ پڑھیں * -

مسٹر جی گیرز نے ' جو ایک فاضل شخص ہیں اور میرے خطبوں میں شریک رہے ہیں ' مجھے اس بات کا پورا یقین دلایا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی زبان کا ہندوستان کی موجودہ زبانوں نیز مردہ زبانوں سے مقابلہ کیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہندوستانی ہی اس کی مستحق ہے کہ اسے ہندوستان کی تاریخی زبان کہا جا سکے صرف و نحو کے اعتبار سے یہ نسبت دوسری زبانوں کے وہ سنسکرت سے قریب تر ہے - پھر مختلف زمانوں میں اس کے الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا رہا ہے - ان الفاظ کے ذریعہ ہم تاریخ ہند کے مختلف عہدوں اور ان تغیرات کا جو رونما ہوے سراغ لگا سکتے ہیں - ان وجوہ سے ہندوستانی زبان میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہندوستان کی وسیع برطانوی سلطنت کی مستقل ادبی زبان قرار دی جائے -

بمبئی کے ریونڈ براؤن کرنے ' جنھیں اپنے ان سفر ناموں کی

* علیگڑھ اخبار ' مورخہ ۱۶ جون سنہ ۱۸۷۱ ع -

وجہ سے شہرت حاصل ہوئی ہے جو ہندوستان اور انگلستان کے رسائل میں شائع ہوچکے ہیں ' حال میں اپنے ایک خط میں میرے سنہ ۱۸۷۰ ع کے مضمون کے متعلق لکھتے ہوے یوں کہا ہے :- " میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر حصے میں اردو زبان نہایت مفید ثابت ہوتی ہے - میں نے راس کماری سے ہمالیہ تک اور گنگا کے دہانہ سے لے کر دریاے انڈس تک ہر جگہ یہ بات محسوس کی " -

انگلستان میں بھی ہندوستانی کی اہمیت کا لوگوں کو احساس ہورہا ہے چنانچہ لندن کے یونیورسٹی کالج کی مجلس رفقا میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ہندوستانی زبان کی جو چیر قائم کی گئی ہے اس پر فوراً کسی کا تقرر ہونا چاہیے - چنانچہ حال میں قاضی شہاب الدین ابراہیم کا اس خدمت پر تقرر عمل میں آیا ہے جو " ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن " کے معتمد اعزازی ہیں اور عرصہ تک کوٹہ کے راجہ کے وزیر رہ چکے ہیں اور اب بھی راجہ کے مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں - موصوف کو ہندوستان کی قومی زبان پر پورا عبور حاصل ہے اور ان کی قابلیت کی عام طور پر شہرت ہے * —

آج کل اس مسئلہ پر انگلستان میں سنجیدگی کے ساتھ غور ہورہا ہے کہ لندن میں ایک ایسا کالج قائم کیا جاے جہاں خاص طور پر ہندوستانی سول سروس کے لیے طلبہ کی تعلیم کا انتظام کیا جاے - یہ نیا کالج 'ہیلی بری' کے کالج کا قائم مقام ہوگا جس کے بند ہونے پر مستشرقین نے سخت رنج و افسوس کا اظہار کیا تھا - اب بھی ایک کالج ایسا موجود ہے جہاں ہندوستانی سول سروس کے طلبہ کی تعلیم ہوتی ہے اور جہاں ہندوستان

* انڈین میل ' مورخہ ۱۵ اگست سنہ ۱۸۷۱ م -

کی زبانوں میں صرف ہندوستانی لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہے —

پنجاب یونیورسٹی کی مجلس رفقاء میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ سائنس پر اردو زبان میں جو بہترین رسالہ لکھے گا اسے سالانہ یونیورسٹی کی جانب سے انعام دیا جائیگا اس لیے کہ اردو نہ کہ ہندی شمالی ہند کی زبان ہے - ہندی بہ نسبت اردو کے کم استعمال کی جاتی ہے - نیز یہ کہ اردو میں دوسری زبانوں کے مستعار لیے ہوئے خیالات کی ترجمانی کرنے کی بہتر صلاحیت موجود ہے -اس میں دوسری زبانوں کے مستعار لیے ہوے خیالات اچھی طرح ادا ہوسکتے ہیں اور اگر ان خیالات کے ادا کرنے کے لیے محاورے موجود نہ ہوں تو آسانی کے ساتھہ بنائے جاسکتے ہیں - بابو نوین چندر رائے نے اس خیال سے مجلس رفقاء میں اختلاف کیا اور وہی دلائل پیش کیے جو ہندی کے حامی اکثر پیش کیا کرتے ہیں اور جن کے جواب میرے خیال میں نہایت تشفی بخش طریقے پر بارہا دیے جا چکے ہیں * چونکہ بابو صاحب ہندو ہیں اس لیے انہوں نے مذہبی حیثیت سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے - ہم یورپین لوگ اس قسم کے مسائل پر زیادہ بے تعصبی اور غیر جانبداری سے راے قائم کرسکتے ہیں - جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں پنجاب یونیورسٹی کی مجلس رفقاء کے فیصلہ کو خوشی سے تسلیم کرنے کو تیار ہوں —

سنہ ۱۸۷۰ ع کی تعلیمات کی سرکاری رپورٹ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نئے قواعد کے مطابق اودھ کے تمام اضلاع کے مدارس میں طلبہ کو

---

* بابو صاحب نے اس ضمن میں ایک خاص لسانی تقسیم پیش کی ہے - وہ ہندوستانی کو اردو اور ہندی دونوں سے علحدہ ایک زبان تصور کرتے ہیں جو دونوں پر حاوی ہے - ویسے علحدہ طور پر ہندی ہندوؤں کی ہے اور اردو مسلمانوں کی -

اردو پڑھائی جاتی ہے اس لیے کہ تجربہ سے یہ پتا چلا کہ بہ نسبت ہندی (ناگری رسم خط) کے زیادہ مفید اور مقبول خیال کی جاتی ہے - رپورٹ نگار نے لکھا ہے کہ دیسی علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اردو زبان کے طرز نگارش اور انشاء میں اس وقت تک لطف پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہ کیے جائیں —

صوبۂ متوسط میں جہاں قدیم قبائل کثرت سے آباد ہیں ہندی بہ مقابلہ اردو کے زیادہ استعمال کی جاتی ہے - اس صوبے کی عدالتوں میں بھی ہندی استعمال ہوتی ہے اور مدارس میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کی تعلیم کا انتظام ہے - یہاں بہ نسبت ہندی کے اردو کم طالب علم پڑھتے ہیں * —

مستشرقین کے لیے مشرقی زبانوں کو جب لاطینی رسم خط میں لکھا جائے تو اکثر مغالطہ ہوجاتا ہے اس لیے کہ لاطینی رسم خط میں ایک ہی لفظ کو مختلف اشخاص مختلف طریقوں پر لکھتے ہیں - چنانچہ حکومت ہند نے بھی یہ دشواری محسوس کی اور جیسا کہ میں پہلے بتلا چکا ہوں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ لاطینی رسم خط میں سرکاری طور پر جو اعلام لکھے جائیں ان میں یکسانیت ہونی چاہیے - اور اسی طرح انگریزی الفاظ یا اعلام جب اردو میں لکھے جائیں تو ان میں یکسانیت ہونی چاہیے - یہ نہیں کہ جس کا جس طرح جی چاہے لکھے - پنجاب کے ناظم تعلیمات مسٹر 'ہالرائڈ نے' اس مقصد کے حصول کے لیے قواعد وضع کیے ہیں جن میں انگریزی تلفظ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جو تحریر سے مختلف

---

* ہندی پڑھنے والوں کی تعداد ۷۴ ہزار ہے اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد ۳ ہزار ہے (رپورٹ تعلیمات صوبہ متوسط بابتہ سنہ ۱۸۶۹ ع - سنہ ۱۸۷۰ ء ص ۱۳) -

ہوتا ہے * —

ہندوستان کے تین کروڑ مسلمان اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں اور ہندوؤں کی مخالفت کا اچھی طرح مقابلہ کر رہے ہیں - انہیں یہ بات یاد ہے کہ انہوں نے ہندستان پر چھ صدی تک حکومت کی ہے اور اس لیے انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ انگریزوں سے جنھوں نے ان کی جگہ لی ہے ' انصاف کی توقع رکھیں - اس لیے اور بھی وہ انگریزوں سے لحاظ کی توقع رکھتے ہیں کہ انہوں نے انگریزی حکومت کے ساتھ وفاداری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی - مسلمانوں کو اس کا اعتراف ہے کہ انگریزی حکومت ان کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتی لیکن بقول کرنل ' نسولیز ' قدیم صدر کلیہ اسلامی کلکتہ ' مسلمانوں کو اس بات کا ملال ضرور ہے کہ حکومت کے بعض قوانین سے انہیں نقصان پہنچا ہے جنھیں وہ خلاف انصاف تصور کرتے ہیں - مثلاً ان جاگیروں کی ضبطی جو مغل شہنشاہوں سے نسلاً بعد نسلٍ انہیں منتقل ہوئی تھیں ' ان مسلمانوں کے وارث کے حق کو تسلیم کرنا جنھوں نے مذہب بدل دیا ہو ' قاضیوں کو ان کے شرعی حقوق سے محروم کرنا ' وقف کو مذہبی اغراض کے علاوہ دوسرے کاموں میں استعمال کرنے کی اجازت اور مسلمانوں کے بجائے سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کا مامور ہونا جس کی وجہ سے وہ انگریزی تعلیم سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں اور اگر سرکاری عہدوں کی توقع ان میں باقی رہتی تو وہ خود بخود تعلیم کی طرف رغبت کرتے - مسلمانوں کی ان شکایت کو بقول کرنل ' نسولیز ' دور کیا جا سکتا ہے - کرنل موصوف نے

---

* ملاحظہ ہو :-

"A Scheme for writing English words in the Persian character"

مطبوعہ لاہور ' سنہ ۱۸۷۱ م —

ان مسائل کے متعلق جو بحث کی ہے وہ ہندی مسلمانوں کے حامیوں کو ضرور پڑھنی چاہیے * بعض سر بر آوردہ مسلمانوں نے اپنی متذکرہ بالا شکایات "ہندوستان میں معاشری ترقی کی امداد کی انجمن" کے ایک جلسے میں، جو گزشتہ نومبر 'لندن' میں منعقد ہوا تھا پیش کی ہیں † —

مذہب اسلام تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے - ملک کے ہر گوشے میں آپ کو مساجد نظر آئیں گی - آج بھی مسیحی مذہب کے مقابلے میں اسلام کی ترقی ہندوستان میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہے - چین اور افریقہ میں جن شیر خوار بچوں کو ان کے ظالم والدین لاوارث چھوڑ دیتے ہیں انہیں دریا دل مسلمان مبلغ اپنے مذہب کے آغوش میں پناہ دیتے ہیں - ان بے کس شیر خوار بچوں کی جان بچانے کے لیے اسلامی مبلغوں کی دیکھا دیکھی مسیحی مبلغین نے بھی انتظام کیا ہے - نانسی کے لاٹ پادری "فوربین جانسون" کی خاص توجہ کے باعث اب مسیحی مبلغین کا کام بہت بڑھ گیا ہے - یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ شمالی چین میں مسلمانوں نے چین کی شہنشاہی سے آزاد خود مختار ریاستیں قایم کرلی ہیں -

ملاکا، جاوا، بورنیو اور اس مجمع الجزائر کے دوسرے ٹاپوؤں میں اسلام کو خوب فروغ ہورہا ہے - ان جزائر میں ہندوؤں کے قدیم مندر بھی نظر آتے ہیں لیکن وہ سب عرصے سے نہایت شکستہ حالت میں ہیں - ان مندروں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندوں نے بت پرستی ترک کردی ہے جو ان کے باپ دادا کا مذہب تھا اور وہ

---

* ٹائمز مورخہ ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

† Allens Indian Mail مورخہ ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

اس حقیقی خدا کی پرستش کرنے لگے ہیں جس کی انجیل مقدس اور توریت میں تعلیم دی گئی ہے - اس میں مضائقہ نہیں کہ وہ مسلمان ہوگئے ہیں نہ کہ عیسائی اس واسطے کہ قرآن بجائے خود انجیل مقدس اور توریت کی تعلیم کو اپنے مخصوص افسانوی رنگ میں پیش کرتا ہے —

یہ سچ ہے کہ اکثر مسلمان اپنے مذہب کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے مذہبی احکام کی پوری پیروی کرتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ تبلیغ کا کام اچھا کرسکتے ہیں - بہت سے ایسے ممتاز مسلمانوں کے حالات ہم تک پہنچتے ہیں جن کی نیکی اور فیاضی میں مسیحیت کی جھلک نظر آتی ہے - بہادر لیکن بد قسمت ٹیپو سلطان کی اولاد میں ایک آخری شخص باقی رہ گئے ہیں وہ اسی قسم کے لوگوں میں ہیں - ان کا نام غلام محمد ہے - اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے لگ بھگ ہے - گزشتہ فروری کی ۱۷ تاریخ کو لارڈ میئو وائسرائے ہند نے انہیں کے - سی - ایس - آئی کا خطاب عطا کیا - شہزادہ غلام محمد نے شجاعت کی بجائے فیاضی اور سخاوت سے نام پیدا کیا ہے - دراصل دانشمند لوگوں کے نزدیک یہ صورت زیادہ قابل ترجیح ہے* - اس قسم کے مسلمان جو عیسائیوں کی طرح نیک زندگی بسر کرتے ہیں قابل احترام ہیں - ویلز کے مشہور واعظ جے ' رابرٹ سن ' نے یوحنا باب ۱ - سطر ۹ کی عبارت کی جو تشریح اپنے وعظ میں کی ہے وہ ایسے لوگوں پر صادق آتی ہے - وہ عبارت یہ ہے : " وہ حقیقی روشنی ہے جو ہر شخص کے دل کو روشن کرتی ہے جو دنیا میں آتا ہے " -

---

* شہزادہ غلام محمد نے کلکتہ کے غرباء کے لیے ایک لاکھ ۶۵ ہزار روپے کی رقم وقف کردی تھی - بعد میں اس میں ایک لاکھ کا اور اضافہ کیا گیا - موصوف نے فریب عیسائیوں کی امداد کے لیے بھی ایک لاکھ کی رقم وقف کی ہے - (انڈین میل - ۲۸ مارچ سنہ ۱۸۷۱ اور ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ ع) —

جے رابرٹ سن اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں :- "اگر کوئی شخص اپنے دل میں پاکیزہ خیال کو جگہہ دیتا ہے یا نیکی اور شرافت کو اپنے عمل میں سموتا ہے تو ہمیں زیبا نہیں کہ ان اوصاف سے چشم پوشی کریں اور انہیں ظاہر داری پر محمول کریں بلکہ ہمیں چاہیے کہ جس شخص سے جیسے اعمال صادر ہوں انہیں ان کی فطری حالت میں دیکھیں۔ ہمیں یہ دیکھہ کر خوش ہونا چاہیے کہ بعض اوقات نہایت تاریک گوشوں میں بھی اس روشنی کی جھلک ہمیں نظر آجاتی ہے جو سر چشمۂ عدل کا آفتاب ہے" —

'ڈبلو براؤن کیرنے' جن کی نسبت میں ابھی ذکر کر چکا ہوں' بمبئی کے ایک اخبار "اورلینڈ استار آف انڈیا" (Overland star of India) مورخہ ۱۱ فروری سنہ ۱۸۷۰ ع اپنے بیجاپور کے سفر کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو قابل ذکر ہے - بیجاپور دکن میں عادل شاہیوں کا دارالسلطنت رہ چکا ہے - موصوف بیان کرتے ہیں کہ انہیں اس سفر میں معلوم ہوا کہ مسلمان آدمی خدا کے نام کی کس قدر عزت کرتا ہے - موصوف نے اتفاق سے جب کہ وہ اس شہر کے آثار دیکھنے گئے ایک پرانی توپ پر اپنا پاؤں رکھہ دیا - اتفاق سے انہوں نے جہاں پاؤں رکھا تھا اس کے نیچے لفظ "اللہ" نہایت خوبصورت ایرانی خط میں کندہ تھا - موصوف توپ پر اس لیے دونوں پیر رکھہ کر کھڑے ہوے تھے تاکہ قریب جوار کا منظر اچھی طرح دیکھہ سکیں - ان کے ساتھہ جو شخص قدیم آثار کے متعلق وضاحت کر رہا تھا وہ مسلمان تھا - اس نے فوراً صاحب موصوف کی توجہ اس طرف مبذول کی کہ ان کے پیر کے نیچے "اللہ" کا نام کندہ ہے جس کی بے حرمتی ہو رہی ہے - جب صاحب موصوف نے اپنے پیر وہاں

۶۱۵۴

سے ہٹالیے تو اس شخص نے نہایت خوش اعتقادی اور احترام کے جذبات کے ساتھ اس جگہ کو اچھی طرح صاف کیا —

اگرچہ میں مسلمانوں کا طرفدار ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب درحقیقت مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے جیسا کہ مون پلیئے (Montpellier) کے مشہور سوال و جواب میں مذکور ہے - مجھے یہ دیکھکر سخت ملال ہوتا ہے کہ بعض عیسائی لوگ اسلام قبول کرلیتے ہیں اور حقیقت کو چھوڑ کر گمراہی میں پڑجاتے ہیں - انھیں شرم آنی چاہیے کہ وہ ایسا کرتے ہیں - ایک انگریز رابرٹ گرین نے جو برمنگھم کا باشندہ ہے اور اس کا باپ سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں باغیوں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا' اس سال کے شروع میں بمبئی میں دین اسلام قبول کرلیا - اسلامی روایات کے مطابق اس نے اپنا نام بھی بدل ڈالا اور اب اپنا نام عبداللہ رکھا ہے- *

ایک نہایت معزز نوجوان انگریز خاتون مس 'ڈونلی' نے حال ہی میں لکھنؤ میں اسلام قبول کرلیا اور ایک اور انگریز خاتون مس 'چارلوٹ ہل' بھی حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئی ہیں اور اب وہ مسز غلام قادر ہیں - † مجھے یہ پوری توقع ہے کہ مسلمان لوگ سورۂ فاتحہ میں جو دعا مانگتے ہیں "اھدنا الصراط المستقیم" وہ بارگاہ رب العزت میں ضرور قبول ہوگی اور یہ پوری جماعت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بجائے ہمارے رہبر صادق حضرت مسیح ابن مریم کی ہدایت قبول کرے گی ‡

---

* انڈین میل' مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

† انڈین میل' مورخہ ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

‡ گارساں دتاسی کٹر عیسائی تھا - اس لیے تعجب نہیں کہ اس قسم کی توقعات نے اس کے دل و دماغ میں راہ پائی - (مترجم) -

قسطنطنیہ کے سلطان کو سنّی مسلمان اپنا خلیفہ مانتے ہیں ' نہ صرف روحانی اعتبار سے بلکہ دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی - چنانچہ 'تونس' کے حاکم صادق پاشا نے خلیفۃ المسلمین کے اقتدار کو کھلم کھلا تسلیم کیا ہے- خلیفۃ المسلمین نے صادق پاشا کے بیٹے کو ان کا جانشین قرار دے دیا ہے خلیفۃ المسلمین کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ نہ صرف عالم اسلامی کے روحانی پیشوا بلکہ دنیاوی مقتدر بھی تسلیم کیے جائیں - لیکن مصر والے خلیفہ کے اقتدار کو دل سے نہیں مانتے - سلطان قسطنطنیہ کے خلاف حال میں وھابیوں نے جو شورش اٹھائی تھی اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی - سلطان نے ان کے خلاف جنگ کی اور انہیں زیر کر لیا - وھابیوں کے متعلق یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ وہ مذہب اسلام کو آلائشوں سے پاک اصلی شکل میں رائج کرنا چاہتے ہیں- انہیں ہم پروتستانتوں یا پیوریٹنوں سے مشابہ کہہ سکتے ہیں- خوش عقیدہ مسلمانوں میں جو لوگ مذہبی آزاد خیالی کی طرف مائل ہیں وہ وھابیت کو کچھ نہ کچھ رجحان ضرور رکھتے ہیں- یا کم از کم وھابیوں کو برا نہیں سمجھتے - مثال کے طور پر میں سید احمد خاں کا نام پیش کرسکتا ہوں جن کا اتفاق سے وہی نام ہے جو ہندی وھابیت کے بانی کا تھا * --

ہندوستان کی انگریزی حکومت کی نظر میں وھابی باغی تصور کیے جاتے ہیں - لیکن ایسا سمجھنا بڑی غلطی ہے - وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بعض اشخاص نے جو اپنے کو وھابی کہتے تھے حکومت ہند کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے خلاف جہاد کا فتوی مکّہ

---

* ملاحظہ ہو میری کتاب " ہندوستانی ادب کی تاریخ " جلد ۳ - صفحہ ۳۲ (اس باب میں سید احمد خاں کا ذکر ہے) —

کے علماء سے حاصل کیا * - لیکن جہاد تو اس وقت جائز ہو سکتا ہے جب کہ اسلام کی عظمت اس سے قایم ہوتی ہو اور کامیابی کی توقع ہو - سید احمد خاں نے کلکتہ کی "اسلامی انجمن" کی رائے کے مطابق اس فتوے کی اصلیت کے متعلق "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۱۴ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع میں نہایت مدلل بحث کی ہے - یہ مضمون بطور ایک خط کے شائع ہوا ہے - موصوف کا خیال ہے کہ اسلامی مملکت کسی دوسری مملکت کے خلاف اس وقت جہاد کر سکتی ہے جب کہ اس کے ساتھہ کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو اور وہاں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے جاننے والے آباد ہوں - یا جہاد اس وقت فرض ہوتا ہے جب کہ کسی غیر مسلم مملکت میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہوں اور وہ اپنے مذہبی احکام کی پیروی نہ کر سکتے ہوں - اگر اس غیر مسلم مملکت میں مسلمانوں کو اس کا یقین ہو کہ اگر وہ بغاوت کریں گے تو کامیابی یقینی ہے ' ایسی حالت میں جہاد جائز ہوگا - ان کی بغاوت ہی در اصل جہاد تصور ہوگی - لیکن مسلمانان ہند کے حالات بالکل دوسرے ہیں - باوجود مکی علما کے فتوے کے ان پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ حکومت وقت کے خلاف بغاوت کریں اس لیے کہ حکومت ان کے مذہبی معاملات میں مطلق کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرتی اور اس باب میں انہیں پوری آزادی دے رکھی ہے - فی الحقیقت ہندوستان کو ہمیں بجائے دارالحرب کے دارالسلام کہنا چاہیے —

* ملاحظہ ہو میری کتاب " ہندوستانی ادب کی تاریخ " دوسرا ایڈیشن - ص ۳۸۴ - مسٹر ہنٹر نے اپنے رسالے " مسلمانان ہند " میں اس فتوے کو نقل کیا ہے - یہ رسالہ مسلمانوں کے خلاف لکھا گیا ہے جس کا جواب سید احمد خاں نے " علی گڑھ اخبار " مورخہ ۲۴ نومبر و یکم دسمبر میں دیا ہے -

وھابیوں کا اصل مقصد موجودہ مسلمانوں کے عقائد اور رسوم میں اصلاح کرنا ھے - جہاد کے متعلق ان کے بھی وھی عقائد ھیں جو دوسرے مسلمانوں کے ھیں - سید احمد خاں نے اصول جہاد کی نسبت جو مثالیں پیش کی ھیں ان سے یہ حقیقت اچھی طرح آشکار ھو جاتی ھے - سید صاحب نے اپنے دلائل سے ثابت کردیا ھے کہ سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم میں سوائے ایک کے اور دوسرے وھابیوں نے کوئی حصہ نہیں لیا - نیز یہ کہ وھابی اصول کسی طرح بھی حکومت وقت کے خلاف نہیں ھیں - سید صاحب نے وھابیوں کی جو حمایت کی ھے اس سے کٹر مسلمانوں اور حکومت دونوں کو ناخوش کرنے کا اندیشہ ھے - لیکن معتدل خیال لوگوں کو دشواری ھمیشہ پیش آیا کرتی ھے اور انتہا پسندوں کا انہیں نشانۂ ملامت بننا پڑتا ھے - سید صاحب نے اس باب میں جو نقطۂ نظر اختیار کیا ھے وہ عین دانشمندی اور معقولیت پر مبنی ھے —

سنہ ۱۸۷۰ ع میں امبالہ اور سرھند کے قریب اور بالخصوص سیستان کی نوآبادی میں جسے مشہور مصلح سید احمد نے آباد کیا تھا انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ مشتعل ھوگئی - یہ شورش وھابیوں کی طرف منسوب کی جاتی ھے جنھیں ایک ملا نے جو جہاد کی تلقین کرتا پھرتا تھا آمادۂ بغاوت کردیا - یہ بھی مشہور کردیا گیا کہ وھابی لوگ انگریزی حکومت کا خاتمہ کرکے مغلیہ سلطنت کو پھر سے قایم کرنا چاھتے ھیں - اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض لوگوں نے مساجد اور مدارس میں اپنے وعظوں کے ذریعہ مسلمانوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کرنے کی پوری کوشش کی لیکن حکومت کو پریشان ھونے کی کوئی وجہ نہیں - اس کے مخالفوں کے وسائل بہت محدود ھیں اور وہ اس کو کوئی شدید

نقصان نہیں پہنچا سکیں گے - اس قسم کی تحریکوں کو سنہ ۱۸۵۷ ع کی سپاہیوں کی بغاوت کے مماثل نہیں سمجھنا چاہیے - بقول 'سعدی':

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

سنہ ۱۸۷۱ ع میں ہندوستانی زبان کی متعدد کتب شائع ہوئی ہیں - پنجاب میں سرکاری طور پر ہندی اور اردو کی مطبوعات کی جو فہرست شائع ہوا کرتی ہے اس سے مجھے ان کتابوں کا حال معلوم ہوا - کپتان ہولرائڈ کی مہربانی اور توجہ کی بدولت مجھے یہ فہرست دیکھنے کو ملجاتی ہے - موصوف اہل ہند کی تعلیم کے لیے عرصے سے کوشاں ہیں - میں پہلے ہندی کتابوں کے متعلق ذکر کرتا ہوں —

رجندر کی دان لیلا - یہ نظموں کا مجموعہ ہے - سداسا اور پرماناند کی نظموں کے مجموعے کا بھی یہی نام ہے —

موہن کی سینا لیلا - یہ بھی نظموں کا مجموعہ ہے - کمار داس اور سداسا کی نظموں کے مجموعے کے بھی یہی نام ہیں —

سمجھوراؤ کی رکمنی منگل - بشن داس کی تصنیف کا بھی یہی نام ہے جسکی نسبت میں نے اپنی کتاب "ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ" میں ذکر کیا ہے (جلد ۳ - ص ۲۵) —

چرن داس کی نوس کیتو - اس میں نوس کیتو کے قصے کو نظم کیا گیا ہے جو گرد پران سے ماخوذ ہے - یہ کتاب دہلی میں چھپی ہے —

سیوا پشن پن جلی - یہ اشعار کا انتخاب ہے جو بابو کالی چرن نے سیوا کے متعلق جمع کیا ہے - بابو صاحب نے ہندی میں اور دوسری کتابیں بھی تصنیف کی ہیں —

سونے لوہے کا جھگڑا - اس میں سونے اور لوہے کی بحث کا حال ہے -

یہ کتاب دھلی میں سنہ ۱۸۷۰ ع میں چھپی ھے —

اس ضمن میں میں " نچیکتن باگ " کا ذکر کردوں جو پستن جی بھرانچ والا کی تصنیف ھے اور بمبئی میں سنہ ۱۸۷۰ ع میں چھپی ھے - یہ کتاب گجراتی رسم خط میں ھے اور ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ھے دوسری کتاب " راجہ گوپی چند اکھیان " ھے جو رستم ایرانی کی لکھی ھوئی ھے - یہ بھی بمبئی میں چھپی ھے اور گجراتی رسم خط میں ھے اور ۸۶ صفحات پر مشتمل ھے * - اس کتاب میں اجین کے ایک راجہ کا قصہ بیان کیا گیا ھے جس نے راج پاٹ چھوڑ کر فقیری اختیار کرلی تھی - اس مضمون کو اور دوسرے مصنفوں نے بھی بیان کیا ھے - جے دت نے ھندی میں (دیکھو میری کتاب " ادب ھندی اور ھندوستانی کی تاریخ " - جلد ص ۹۹) اور امبو پرشاد نے اردو میں اسی مضمون پر کتابیں لکھی ھیں - آخرالذکر کی کتاب دھلی میں چھپی ھے —

یجروید کے ھندی ترجمے کا اعلان کیا گیا ھے - ترجمے کا نام " ویدارتھا پرادیپ " رکھا گیا ھے - اس کا پہلا حصہ علیگڑھ میں چھپا ھے جس کو ' بوسم ' کے راجہ گوری پرشاد سنگھہ نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے پیش کیا ھے - اس کا بھی اعلان کیا گیا ھے کہ اتھروید کا اصل متن شائع کیا جائیگا اور بین السطور اردو ترجمہ ھوگا † - اسکا ایک نمونہ بھی پیش کیا گیا ھے لیکن مجھے اس کا علم نہیں کہ یہ کتاب شائع ھوئی یا نہیں —

---

* جس طرح پانڈی چری میں ھندوستانی کو تامل کے رسم خط میں اور بنگال میں بنگالی کے رسم خط میں لکھتے ھیں اسی طرح بمبئی پریسی تنسی میں اکثر اوقات ھندستانی گجراتی رسم خط میں لکھی جاتی ھے اور سندھ میں سندھی رسم خط میں —

† اخبار عالم - مورخہ ۲۳ فروری سنہ ۱۸۷۱ م —

بنارس کے ریورنڈ ڈبلو ایتھرنگٹن نے اہل ہند کے لیے ہندی زبان کی صرف و نحو پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کی نسبت میں گزشتہ سال ذکر کرچکا ہوں - موصوف نے اسی مضمون پر ہندی میں ایک اور کتاب " بھاشا بھاسکر " کے نام سے لکھی ہے - صوبہ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات نے اس کتاب کی قدر افزائی کی ہے اور اسے اپنے مدارس کے نصاب میں شامل کرلیا ہے - اس مسیحی مبلغ کے لیے یہ بات موجب فخر ہونی چاہیے کہ وہ اہل ہند کے لیے سلیس ہندی زبان میں یہ کتاب لکھنے کے قابل ہوا - ہندی کی صرف و نحو پر ایک اور کتاب حال میں شائع ہوئی ہے جسکی مشہور مستشرق مسٹر فٹز ایڈورڈ ہال نے بہت تعریف کی ہے - اس کتاب کا نام " بھاشا تتوابودھنی " ہے - سیتل پرشاد گپت کی ہندی صرف و نحو کی کتاب " شبد پرکاش " بھی قابل ذکر ہے --

ہندی زبان کے مشہور مصنف بابو ہری چندر نے جو " کاوی بچن سُدھا " کے ایڈیٹر ہیں ' سنہ ۱۸۷۰ ع - سنہ ۱۸۷۱ ع میں بنارس میں بھارت چندر کے بنگالی ناٹک کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے - اس کا نام " ودیا سندر ناٹک " ہے - مجھے توقع ہے کہ ہندی کے " شکنتلا ناٹک " کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ اسے بھی نصیب ہوئی - " شکنتلا ناٹک " کے قلیل عرصے میں متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں - میں اس کا پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ بابو صاحب کا ارادہ ہے کہ سنسکرت زبان کے مشہور ناٹکوں کا ہندی میں ترجمہ شائع کریں - بابو ہری چندر کی دوسری کتاب " اگروالا کی اُت پتی " کے شائع ہونے کا بھی اعلان کیا گیا ہے - یہ کتاب ہندی میں ویش ذات کے متعلق ہے - کہا جاتا ہے کہ " اگروالا " کے نام کی بنا شہر " اگروھا " سے پڑی ہے جو دھلی کے مغرب میں واقع ہے - لیکن میرے

خیال میں اس نام سے پتہ چلتا ہے کہ اس ذات کے لوگ پہلے آگرہ سے آئے تھے - بابو ہری چندر نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس مصنف کو ۸۰۰ روپیے بطور انعام پیش کریں گے جو فرانس و جرمنی کی گزشتہ جنگ کی تاریخ ہندی زبان میں سب سے اچھی لکھے گا —

نواب محمد مردان علی خان نواب جھ پور نے ایک جنتری شائع کی ہے جو ایک سو ایک سال تک مفید ہوسکتی ہے - اس کا ایک نسخہ نواب صاحب نے علیگڑھ کی مجلس ادبی کو نذر کیا ہے * —

اردو کتابوں میں سب سے پہلے "کلیات ظفر" قابل ذکر ہے - یہ دھلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفر کے کلام کا مجموعہ ہے - اس بادشاہ کو اپنے تخت و تاج سے سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے بعد ہاتھ دھونا پڑا - اس بد قسمت بادشاہ کا حال میں نے اپنی کتاب "ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ" میں مفصل بیان کیا ہے (جلد ۳ - ص ۳۱۷ وغیرہ) مولوی غلام رسول نے قصۂ بلال نظم کیا ہے - اس نظم کی زبان پنجابی ہے اور وہ لاہور میں سنہ ۱۸۷۰ ع میں طبع ہوئی ہے - دیوی دیال نے لیلیٰ مجنوں اور سسی پنوں کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے - مولوی خلیل علی نے "داستان امیر حمزہ" کا فارسی سے اردو میں ایک نیا ترجمہ کیا ہے - یہ ترجمہ ۵۲۱ صفحات پر مشتمل ہے اور ایک جلد میں ہے - یہ کتاب فارسی میں اکبر بادشاہ کے حکم سے تالیف کی گئی تھی - اس کے لکھتے وقت مولف کے پیش نظر مہابھارت کا مضمون تھا - اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکبر کے زمانے میں سنسکرت سے فارسی میں جو تراجم کیے گئے تھے وہ ہندی اصل پر

---

* علیگڑھ اخبار - مورخہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱

مطبع قیصر * —

مرزا اعظم بیگ نے " تاریخ گجرات " لکھی ہے جو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے - یہ کتاب لاہور میں چھپی ہے - پنڈت کاشی ناتھہ نے اپنی تصنیف " کتاب اخلاص کاشی " کا نام اپنے نام پر رکھا ہے - اس کتاب میں کہانیوں کے طور پر مفید باتیں بیان کی گئی ہیں - علیگڑھ اخبار میں اسکے متعلق متعدد بار ذکر نکل چکا ہے - اس کتاب کی اشاعت میں حکومت نے بھی مدد دی ہے اور مدارس کے لیے اسکے ایک ہزار نسخے خریدے ہیں -

" تہذیب القلوب " اخلاق پر ایک کتاب ہے اور سنہ ۱۸۷۰ ع میں دہلی میں چھپی ہے - یہ فارسی کتاب " مفرح القلوب " مصنفۂ محمد ارزانی کا ترجمہ ہے اور سنہ ۱۸۷۰ ع میں لکھنؤ میں طبع ہوا ہے - فارسی میں سنسکرت کی کتاب " ہتوپدیشا " سے ترجمہ کیا گیا تھا - اردو ترجمہ ۴۷۶ صفحات پر مشتمل ہے ! —

" تحفتہ الاحبابی تحریم النساء " مولوی قطب الدین دہلوی کی تصنیف ہے اور ۱۸۶۱ ع میں لکھنؤ میں چھپی ہے - اسی مصنف کی دوسری کتاب " تحفتہ الزوجین " دہلی میں دوسری مرتبہ طبع ہوئی ہے - اس کتاب میں زن و شوہر کے حقوق و فرائض پر بحث کی گئی ہے - مولوی قطب الدین دہلوی نے حال میں ایک کتاب ان مسلمانوں کے لیے لکھی ہے جو مذہب کے پابند نہیں ہیں - اس کتاب کا نام " رسالۂ بے نمازاں " ہے —

" اعتراض قرآن " میں رام چندر نے اسلامی عقائد پر تنقید کی ہے - شورش عظیم سے قبل رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے —

" سراج القاری " میں قرآن کے لب و لہجہ اور تلفظ کے متعلق بحث کی گئی ہے - اس کتاب کی نسبت میں نے اپنی تصنیف " ادب ہندی

* H. Blochman, Proceedings of the Asiatic Society Bengal, 1871, P. 142.

؎ دیکھو میری کتاب " ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ " جلد ۱ - ص ۶۰۹ -

و ھندوستانی کی تاریخ" میں ذکر کیا ھے - اس کتاب کی زبان پنجابی ھے - لیکن فارسی رسم خط میں ھے اور لاھور میں طبع ھوئی ھے —

" کلمات الحق" - یہ نصرت علی کی اردو نظم ھے اور سنہ ۱۸۷۰ ع میں دھلی میں چھپی ھے - اس میں مشہور صوفی منصور کے سولی پر چڑھنے کا حال بیان کیا گیا ھے - یہ بات قابل ذکر ھے کہ منصور کے حالات زندگی کو حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات سے مشابہ بتلایا گیا ھے —

" راہ نجات" - اس کتاب کے مصنف کا نام غلام حسین ھے نہ کہ محمد علی جیسا کہ میں نے اپنی کتاب " ادب ھندی و ھندوستانی کی تاریخ" میں ذکر کیا ھے (جلد ۲ - ص ۳۵۵) —

" گوھر شب تاب" پنڈت بانکے بہاری لال نے بعض انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ھے - یہ کتاب سنہ ۱۸۶۹ ع میں لکھنؤ میں طبع ھوئی ھے - اس ترجمہ کو دیکھتے ھوے میں ڈاکٹر لیٹنر کی اس راے سے بالکل متفق ھوں کہ مغربی زبانوں کی تصانیف کا لفظ بہ لفظ ھندوستانی میں ترجمہ کرنے کے بجاے ان کے مطالب کو سلیس زبان میں ادا کرنا چاھیے - اس سے یہ فائدہ ھوگا کہ ھندوستانی لوگ ان تصانیف کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور ترجمہ کرنے والوں کو بھی سہولت ھوگی - انگریزی سے اردو میں اچھا ترجمہ کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ھیں وہ ایسی تو نہیں ھیں کہ ان پر قابو نہ پایا جاسکے جیسا کہ مولوی عظمت اللہ مظفر پوری نے " رسالۂ جلسۂ تہذیب" کی دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کی اشاعت میں بوضاحت بیان کیا ھے - لیکن نظم کا معاملہ دوسرا ھے - نظم ھمیشہ مبہم اور غیر واضح ھوا کرتی ھے جیسا کہ شیخ سعدی نے بوستان میں کہا ھے :—

شیخ سعدی کے اس قول کے ضمن میں میں یہاں اس طرف اشارہ کردوں جیسا کہ میں نے اپنے مضمون "مشرقی ادب پر ایک نظر میں" لکھا تھا کہ ایشیائی شاعر مظاہر فطرت کو ذہنی اور تمدنی اشیا سے اکثر تشبیہ دیا کرتے ہیں - مثلاً ہندوستان کا ایک مسلمان شاعر اپنے معشوق کے ہونٹوں کے رنگ کو گلاب کے رنگ کے مثل بتاتا ہے تو ہندو شاعر دریائے گنگا کی موجوں کو سبز مخمل پر جو گوٹ لگائی جاتی ہے اس سے تشبیہ دیتا ہے اور موجوں کی آواز کو ان برہمنوں کی گنگناہٹ سے مشابہ قرار دیتا ہے جو گنگا کے کنارہ وید کی مناجاتیں پڑھا کرتے ہیں-

منشی نظام الدین نے ناصرالدین محمد بن الاحسان طوسی کی کتاب "اخلاق ناصری" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے - یہ ترجمہ لاہور سے شائع ہوا ہے اور ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے - اس کتاب کا نام مصنف کے نام پر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ کہستان کے شہزادہ کے نام پر رکھا گیا ہے جو مصنف کا ہمنام تھا اور اسی کے نام کتاب معنون کی گئی ہے - میں منشی نظام الدین کی دوسری تصانیف کے متعلق اپنی کتاب "ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ" میں ذکر کر چکا ہوں —

علی گڑھ کی اکادمی سائنس اور ادب کی ہندوستان میں بڑی خدمت کر رہی ہے - اس کا رسالہ اور دوسری مطبوعات اور مباحثے نہایت مفید ہوتے ہیں - اکادمی کی طرف سے اردو میں لاہور کے ریورنڈ ڈبلو 'ولکن سن' نے جو جغرافیہ لکھا تھا اس کی طباعت کا کام ختم ہوگیا - اس کا نام "مرآت غریب" رکھا گیا ہے - کتاب دو حصوں میں منقسم ہے -

لاہور کے پروفیسر جی ڈبلو لیٹنر نے اپنی تصنیف "سلین الاسلام" شائع کردی ہے جو ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے - یہ اردو میں

اسلامی تاریخ اور ادب کا خلاصہ ہے - موصوف کو اس کتاب کی تیاری میں مولوی محمد حسین سے بہت مدد ملی - یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ ہندوستان کے متعلق جو کچھہ لکھا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے - اس کتاب کا طرز تحریر نہایت سلیس اور شستہ ہے جس کی اہل مشرق بڑی قدر کرتے ہیں اور جو اکثر ان کتابوں میں مفقود ہوتا ہے جو اہل یورپ ہندوستان کے متعلق خود لکھتے ہیں یا دوسروں سے لکھواتے ہیں —

ان کتابوں کے علاوہ جو مولوی عمادالدین نے پہلے مسیحی مذہب کے متعلق شائع کی تھیں ابھی حال میں تین کتابیں اسی موضوع پر موصوف نے لکھی ہیں - مولوی عمادالدین پہلے مذہب اسلام کے "عماد" تھے تو اب مسیحی مذہب کے "عماد" ہیں - وہ اپنی تحریر اور تقریر سے مسیحی مذہب کی ہندوستان میں بڑی خدمت کر رہے ہیں - یہ تین کتابیں یہ ہیں - (۱) اعجازالقرآن - یہ کتاب چھہ حصوں میں ہے - پہلے حصے میں مصنف نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ آیا قرآن کو آسمانی کتاب کہہ سکتے ہیں یا نہیں - دوسرے حصے میں مولوی عمادالدین نے ثابت کیا ہے محمد (علیہ السلام) کا تمام تر استدلال یہود و نصاریٰ کی کتب سے ماخوذ ہے - تیسرے حصے میں حضرت جبرئیل کے وحی لانے پر بحث کی ہے - چوتھے حصے میں حضرت جبرئیل کی ماہیت بیان کی گئی ہے - پانچویں حصے میں اس واحد ذریعۂ نجات پر بحث کی گئی ہے جو خدا کا بتایا ہوا ہے - چھٹے حصے میں سچی وحی کے ثبوت میں قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا ہے - آخر کے باب میں قرآن اور حدیث کی رو سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق کوئی

اعجازی کتاب نہیں ہے —

(۲) تفسیر مکاشفات - یہ کتاب لاہور میں سنہ ۱۸۷۰ ع میں شائع ہوئی ہے -

(۳) آثار قیامت - اس کتاب میں قیامت کے روز مُردوں کے زندہ ہونے کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے - یہ کتاب بھی لاہور میں سنہ ۱۷۸۰ ع میں شائع ہوئی ہے —

شملہ کے مسٹر پوٹروائن نے، جو حکومت ہند کے محکمۂ امور خارجی میں مددگار معتمد ہیں، ایک ہزار روپے کا انعام اس شخص کو دینے کا وعدہ کیا ہے جو میرے قدیم دوست مسٹر اے کِلِین کی کتاب "سماوات" کا بہترین ترجمہ ہندوستانی زبان میں کرے گا - یہ اعلان ۳ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع کو شائع ہوا ہے - ترجمے ۳۱ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ ع تک پہنچ جانے چاہییں - ان ترجموں کی جانچ کے لیے سر سید احمد کی صدارت میں ایک مجلس مقرر کی گئی ہے جو اس بات کا تصفیہ کرے گی کہ انعام کا کون مستحق قرار دیا جائے —

کپتان ہولرائڈ کی تصانیف میں "قواعد اردو" قابل ذکر ہے - اس کا دوسرا ایڈیشن ابھی حال میں شائع ہوا ہے اور اس کے ۱۲۵۰ نسخے طبع کیے گئے ہیں - کتاب ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے - اس کتاب سے دوسرے اور تیسرے حصے میں ہندوستانی زبان کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس زبان میں کس قدر خوبیاں موجود ہیں اور اس کے لکھنے والوں کے طرز تحریر میں کس قدر فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے —

ہندوستانی زبان کی جو دوسری کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں بعض پہیلیوں پر ہیں، بعض نظمیں ہیں؛ پرندوں کے حالات انگریزی سے

خواجہ ضیاالدین نے ترجمہ کیے ہیں؛ سقراط ' افلاطون ' ارسطو ' بیکن ' پلوٹن ' فارسی شاعر فردوسی اور سنسکرت کے شاعر والمیکی مصنف رامائن کی سوانح عمریاں ہیں - (سر) سید احمد (خاں) نے دھلی کے آثار قدیمہ پر سلسلۂ مضامین لکھا ہے اور اسی طرح مصر کے اہرام اور چین کی دیوار اور چینیوں کے رسم و رواج پر بھی مضامین شائع ہوئے ہیں —

اودھ کی تعلیمی ترقی بابتہ سنہ ۱۸۶۹ ع - سنہ ۱۸۷۰ ع کے متعلق جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس میں بعض نئی مطبوعات کا ذکر ہے جن کی نسبت میں یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں —

" مفید الانشا " - منشی امین الدین نے خطوط نویسی کے اصول اس میں بیان کیے ہیں - پنڈت شیو نرائن نے اس کتاب کو ہندی میں بھی شائع کیا ہے - میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ " میں اس کتاب کے متعلق ذکر کیا ہے - (دیکھو جلد ۳ - ص ۴۴۴) —

" اشرف القوانین " - یہ سید ابوالفتح عرف مولوی اشرف علی کی لکھی ہوئی صرف و نحو کی کتاب ہے اور بمبئی میں چھپی ہے - سندھی زبان کی صرف و نحو پر ہندوستانی میں منشی اڈھا رام نے ایک کتاب لکھی ہے - " دل پسند کہانیاں " بھی اسی مصنف کی لکھی ہوئی ہیں جو ہندوستانی زبان میں ہیں - الومل تکم داس نے سنہ ۱۸۷۱ ع میں " مختصر تاریخ سندھ " ہندوستانی زبان میں شائع کی ہے —

اس وقت میں اس خبر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ الہ آباد کے ریورنڈ مسٹر بیٹ جو امریکی مسیحی مبلغ ہیں اور عالم فاضل شخص ہیں ' ہندی کی ایک لغت تیار کر رہے ہیں جس میں ۳۷ ہزار لفظ ہوں گے -

یعنی تامسن کی لغت کے مقابلے میں اس میں ۱۲ ہزار لفظ زائد ہوں گے * —

پٹنہ میں منشی سورج مل نے ڈاکٹر ایس ڈبلو ' فیلن ' کے زیر نگرانی ایک اردو لغت تیار کرنا شروع کیا ہے جس میں اردو لفظوں کے معنی اردو میں بیان کیے جائیں گے - یہ لغت فارسی رسم خط میں ہوگی اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہوگی - اس کی ۸ سائز کی تقطیع ہوگی اور ہر صفحے پر دو کالم ہوں گے - الفاظ کی ترتیب فارسی حروف تہجی کے لحاظ سے ہوگی - ہر لفظ کے ساتھہ اس کا ماخذ بتایا جائے گا کہ آیا وہ عربی کا ہے ' فارسی کا یا سنسکرت کا ہے - سنسکرت کے الفاظ کی اصل دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے گی - اس لغت کے الفاظ کے ساتھہ مشہور مصنفوں اور شاعروں کے کلام سے مثالیں بھی دی جائیں گی تاکہ ان کے معنی کا تعین ہوسکے - اس لغت کا اشتہار اس وقت میرے پیش نظر ہے جس کے ساتھہ چار صفحات بطور نمونہ منسلک ہیں - ان صفحات کے دیکھنے سے میں نے یہ رائے قایم کی ہے کہ کام قابل اطمینان طریق پر ہوا ہے - میری خواہش ہے کہ یہ لغت جلد تیار ہوکر چھپ جائے —

میں اس موقع پر خاص طور پر اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اردو اور ہندی میں سائنس پر سنہ ۱۸۷۱ ع میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں اور بعض عنقریب شائع ہونے والی ہیں - ان میں سے بعض پٹنہ میں زیر طباعت ہیں - رائے سوہن لعل ناظم نارمل اسکول پٹنہ اور مسٹر فیلن کے زیر نگرانی یہ کتابیں لکھوائی گئی ہیں - مسٹر فیلن نے ازراہ کرم ان کتابوں کے نمونے جو مجھے بھیجے ہیں انہیں دیکھنے سے

* ٹائمز آف انڈیا ' مورخہ ۲۷ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع —

معلوم ہوا کہ سائنٹفک اصطلاحوں کو بجائے سنسکرت یا عربی کے ہندوستانی میں ترجمہ کیا گیا ہے - بعض مصنف یہ کرتے ہیں کہ علمی اصطلاحوں کو علی حالہ رہنے دیتے ہیں اور انہیں انگریزی رسم خط میں متن میں تحریر کردیتے ہیں - لیکن پٹنہ میں جو کتابیں شائع ہورہی ہیں ان میں یہ طریقہ نہیں اختیار کیا گیا - میں خود ہندوستانی زبان میں اصطلاحات کے ترجمے کرنے کا قائل ہوں - میرا خیال ہے کہ اس طرح مغربی علوم کا چرچا ہندوستان میں بڑھے گا اور سائنس کی معلومات سے لوگ آگاہ ہوسکیں گے - اس وقت اس قسم کی ۵۶ اصطلاحات میرے پیش نظر ہیں جو ہندوستانی میں ترجمہ کی گئی ہیں —

یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی قدیم رسائل و اخبارات کے بند ہونے پر نئے نئے اخبار و رسائل جاری ہوتے ہیں - اس سال ہندوستانی کے ۳۰ نئے اخبار و رسائل جاری ہوے ہیں لیکن یہ سب کے سب روزانہ اخبار نہیں ہیں ان میں سے بیشتر ہفتہ وار ہیں اور بعض دسویں دن نکلتے ہیں اور بعض مہینے میں دو مرتبہ - بنگلور کا " قاسم الاخبار " ہفتہ میں دو مرتبہ شائع ہوا کرتا تھا لیکن اس کی اشاعت بند ہوگئی - اودھ اخبار نے بھی اعلان کیا ہے کہ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع سے اس کی اشاعت ہفتہ میں دو مرتبہ ہوگی - اس اخبار کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے - شروع میں یہ صرف چار صفحات پر ہوتا تھا اور اب اس میں ۲۴ صفحے ہوتے ہیں - یہ خبر کہ یہ اخبار ہفتہ میں دو مرتبہ شائع ہوا کرے گا ہندوستانیوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ہندوستانی زبان سے شغف رکھتے ہیں باعث مسرت ہے —

صرف صوبۂ شمال مغربی میں اس وقت ۲۳ اخبار دیسی زبانوں

میں نکلتے ہیں - ان میں سے ۱۹ ایسے ہیں جو حکومت کی سرپرستی میں شائع ہوتے ہیں - جو اخبار حکومت کے اثر سے آزاد ہیں وہ جب ضرورت سمجھتے ہیں تو انگریزی حکومت پر تنقید ین کرتے ہیں - اب پریس کی قوت ہندوستان میں ایک حقیقت ہوتی جاتی ہے (انڈین میل - مورخہ ۱۲ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع) —

ہندوستانی زبان کے نئے اخبار جن کے متعلق میں نے اوپر ذکر کیا ہے مندرجہ ذیل ہیں - ان میں ماہوار رسالے اور ایجنسیوں کی میعادی مطبوعات بھی شامل ہیں —

اخبار محتشم جاورا - (؟) - اس اخبار کے متعلق لکھنؤ کے اپریل سنہ ۱۸۷۱ ع کے " جلسۂ تہذیب " میں اعلان کیا گیا تھا —

اخبار سوشل راجپوتانہ - اس اخبار کا اعلان جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع کے " جلسۂ تہذیب " میں کیا گیا ہے - اس کا مقصد راجپوتانہ کے معاشرتی حالات کی اصلاح و ترقی ہے —

اخبار سوسائٹی کانپور؛ اخبار ناگپور - اس کا ۲۹ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کے " علیگڑھ اخبار " میں ذکر ہے —

المورہ اخبار - اس اخبار کی ہندوستان میں بہت قدر ہو رہی ہے —

اخبار انجمن پنجاب - یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحہ پر چار کالم ہوتے ہیں اور ہر کالم میں ۲۵ سطریں - غالباً یہ اخبار وہی ہے جس کا پہلے نام " ہمائے پنجاب " تھا اور جس کی نسبت میں اپنے سنہ ۱۸۷۰ ع والے مضمون میں تذکرہ کر چکا ہوں - اس اخبار کے سرورق پر ہما کی خیالی تصویر بنی ہوئی ہے -

یہ اخبار "اخبار پنجاب" سے علحدہ ہے * - اسی اخبار کو "رسالۂ انجمن پنجاب" اور "رسالۂ انجمن اشاعت پنجاب" بھی کہتے تھے - جس انجمن کی طرف سے یہ اخبار شائع ہوتا ہے وہ اس کا التزام کرتی ہے کہ عام لوگوں سے مفید مطلب مضامین اس میں شائع ہوا کریں - چنانچہ اس میں صرف وہ یاد داشتیں شائع ہوتی ہیں جو ارکان انجمن بھیجتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ پڑھنے والوں کی دلچسپی کے مضامین کی اشاعت بھی ہوتی ہے - انجمن کے صدر مسٹر لیپل گریفن ہیں اور معتمد بابو نوین چند رائے ہیں - ان دونوں کی نگرانی میں اخبار نکلتا ہے - حکومت کی سرپرستی اس اخبار کو حاصل ہے - چنانچہ سرکاری طور پر اس کے ۲۰۰ نسخے خریدے جاتے ہیں - منشی نظام الدین اس کے مدیر ہیں - ۲۱ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں جو اس وقت میرے پیش نظر ہے انجمن کانگڑہ (پنجاب) کی کارروائی درج ہے - اس انجمن کا جلسہ منشی امین چند کلکٹر ضلع کے تبادلہ کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا - جلسے میں جتنی تقریریں ہوئیں ان میں انجمن اور پورے ضلع کی طرف سے اظہار افسوس کیا گیا † - اس اخبار میں

---

* "ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ" جلد ۳ - ص ۴۷۷ -

† میں نے اپنی کتاب "ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ" میں منشی امین چند کے متعلق بہ حیثیت ہندوستانی کے مضمون نگار کے ذکر کیا ہے - (دیکھو جلد ۲ - ص ۱۹۹) -

ریاست کشمیر کا حال نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے - اس مضمون کے شروع میں جو ۱۵ کالم میں ہے منشی جلال الدین شیرازی نے کشمیر کی تعریف میں ایک نظم لکھی ہے - یہ نظم اس لائق ہے کہ اس کا انگریزی یا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جاے - اس اخبار میں تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دیسی لوگوں کے لیے یہ اور بھی زیادہ قابل قدر ہے - اس کی آخری اشاعت میں موجودہ بادشاہ ایران نصیرالدین کی تصویر ہے اور بوشہر کے پُل کا منظر ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے —

آگرہ اخبار - یہ ہفتہ وار اخبار آگرہ سے شائع ہوتا ہے اور ۸ صفحوں کا ہوتا ہے - ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں - ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہے - اس اخبار کا پہلے "ایجوکیشنل گزٹ" نام تھا - اس میں تعلیم کے متعلق مضامین اب تک شائع ہوتے ہیں —

بدیا بلاس - یہ ہندی کا اخبار جمّو سے نکلتا ہے - غالباً یہ وہی اخبار ہے جس کی نسبت میں نے اپنی کتاب "ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ" (جلد ۳ - ص ۴۷۸) میں ذکر کیا ہے —

بدھی بلاس - یہ اخبار بھی جمّو سے مارچ سنہ ۱۸۷۰ ع سے نکلنا شروع ہوا ہے اور قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے —

بلند اختر - اس کا پہلا نمبر دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع میں مراد آباد سے شائع ہوا ہے —

فیض عام - یہ ماہوار رسالہ گجرانوالہ کی ادبی انجمن کے زیر اہتمام نکلتا ہے - اس کا پہلا نمبر یکم جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع کو سیالکوٹ سے شائع ہوا - اس کے مدیر منشی دیوان چند ہیں جن کی ادارت میں "چشمہ فیض" نکلتا تھا * —

گورنمنٹ گزٹ - اودھ سے اردو میں شائع ہوتا ہے - اسی نام کا اخبار لکھنؤ سے انگریزی زبان میں بھی نکلتا ہے -

گورنمنٹ گزٹ مغربی و شمالی - یہ اخبار صوبہ شمالی مغربی کا ہے —

ہندو پرکاش - یہ اخبار ہندی کا ہے اور کانپور کی "مجلس اصلاح معاشرت" کی جانب سے شائع ہوتا ہے - یہ انجمن مغل سرائے کی مقامی انجمن کو اپنے پرچے بھیج دیتی ہے † —

ہلی شہر پتر کا (؟) - علیگڑھ اخبار مورخہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس کی تعریف کی گئی ہے —

خورشید جہاں تاب - یہ اخبار آگرے سے ہر مہینہ کی پہلی اور پندرھویں کو شائع ہوتا ہے - اس کا پہلا نمبر یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کو شائع ہوا تھا - اس کے ہر نمبر میں ایک یا دو صفحوں پر "جہانگیر نامہ" شائع ہوتا ہے - اس کے قلمی نسخے بہت کمیاب ہیں اور اب تک یہ طبع نہیں کیا گیا ہے —

مدھو بہار - یہ ماہ نامہ تھانہ (بمبئی) سے کرشن جی پرسورام گوز کے زیر ادارت نکلتا ہے - اس میں ہندوستانی، مرہٹی

---

* "ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ" - جلد ۳ - ص ۴۷۹ -

† علی گڑھ اخبار - مورخہ ۲ جون و یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

گجراتی اور سنسکرت کے مضامین ہوتے ہیں —

مطلع نور - یہ اردو کا اخبار کانپور سے نکلتا ہے -

مفرح القلوب - یہ رسالہ کراچی سے نکلتا ہے - اسی نام کا ایک اور رسالہ شکار پور سے شائع ہوتا ہے جس کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ " (جلد ۳ - ۴۸۴) میں ذکر کیا ہے —

محب مارواڑ - یہ رسالہ مہینے میں دو دفعہ نکلتا ہے - اس میں اردو اور ہندی دونوں کے مضمون ہوتے ہیں - یہ یکم دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع سے مارواڑ سے شائع ہوا ہے اور ۱۲ صفحات کا ہے - اس کا وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر اخبار کی اشاعت بڑھی تو اس کے صفحات کی تعداد بڑھادی جاے گی —

نورالابصار - یہ اخبار الہ آباد سے نکلتا ہے - اسی نام کا دوسرا اخبار بھی ہے جس کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی اور ہندوستانی کی تاریخ " (جلد ۳ - ص ۴۸۴) میں ذکر کیا ہے - یہ دونوں بالکل الگ الگ ہیں - مسٹر کمپسن کی رائے ہے کہ " نورالابصار " جو الہ آباد سے نکلتا ہے صوبۂ شمال مغربی کا بہترین اخبار ہے - ۹ مئی کے پرچے میں " انجمنوں " کے متعلق ایک مضمون ہے جس میں بعض مشرقی مصنفوں کے حوالے دیے گئے ہیں اور ۱۷ مئی کے پرچے میں الہ آباد کی سڑکوں کا حال شاعرانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے - بالخصوص برسات کے موسم میں اس شہر کی سڑکوں کی جو حالت ہوتی ہے وہ نہایت دلچسپ طریقہ پر بیان کی ہے -

اس ضمن میں " فسانہ عجائب " کا ایک شعر لکھا ہے :—

دیکھی نئی ریت اس نگر میں
جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

پریاگ دوت - یہ ہندی کا اخبار بھی الہ آباد سے نکلتا ہے -

رسالہ ڈبیٹنگ سوسائٹی - یہ میرٹھ کی مجلس مباحثہ کا ماہوار رسالہ ہے -

رہنمائے پنجاب - اس کی نسبت جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع کے " رسالہ جلسۂ تہذیب لکھنؤ " میں ذکر ہے -

ریاض نور - ستمبر سنہ ۱۸۷۰ ع سے یہ اخبار مراد آباد سے شائع ہوا ہے - اسی نام کا ایک اخبار ملتان سے بھی نکلتا ہے جس کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ " (جلد ۳ - ص ۴۸۵) میں ذکر کیا ہے —

سندراس گزٹ - یہ ہندی میں شاہجہاں پور سے شائع ہوتا ہے —

سلبھ سمچار - یہ ہفتہ وار ہندی رسالہ ہے - اس کے چار صفحے ہوتے ہیں اور قیمت بہت کم ، صرف ایک پیسہ ہے - " انڈین ریفارم ایسوسی ایشن " کی طرف سے کلکتہ سے شائع ہوتا ہے - اس اخبار کا یہ مقصد ہے کہ غریب لوگوں کی خدمت کرے - اس میں مفید اور دلچسپ معلومات اور خبریں درج ہوتی ہیں - اس میں دیسی لوگوں کی ضروریات اور ان کی شکایتیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ حکومت کو ان کے متعلق علم ہو اور وہ انہیں دور کرنے کی طرف

توجہ کرے * —

اردو لا رپورٹ - یہ میرتھہ سے مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتی ہے - پہلے یہی " گنجینۂ احکام " کے نام سے ماہوار نکلتا تھا -

ذخیرۂ بال گوبند - یہ آگرہ سے نکلتا ہے -

کبی بچن سدھا - یہ ہندی کا ادبی رسالہ بنارس سے بابو ہری چندر کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے - اس کے سرورق پر ایک ہندی شعر لکھا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے : -

" سدھا (آب حیات) وہاں دستیاب ہوتا ہے جہاں غیر فانی ہستیاں سکونت پذیر ہیں - تمہاری رسائی اس تک دشوار ہے - لیکن وہ لوگ جو عقل و فہم رکھتے ہیں اس سے (اس رسالے سے) اس کو حاصل کرسکتے ہیں اور اس کا ذائقہ چکھہ سکتے ہیں " —

مسٹر کمپسن ' جو صوبۂ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات ہیں ' جب تعریف کرتے ہیں یا کوئی دعوی پیش کرتے ہیں تو کبھی احتیاط کو ہاتھہ سے نہیں جانے دیتے - انہوں نے " کبی بچن سُدھا " کے متعلق اپنی سنہ ۱۸۷۰ ع کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ " ہندی کے سب رسالوں کے مقابلے میں یہ رسالہ سب پر فوقیت رکھتا ہے - اس کا طرز تحریر دلکش ہے اور اس کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں اور ان کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے " - یہ رسالہ خالص ادبی ہے اور مہینے میں دو دفعہ شائع ہوتا ہے - اس میں کبھی سیاسی معاملات پر بھی بحث کی جاتی ہے اور خبریں شائع کی جاتی ہیں - اس کی تقطیع پہلے بڑی ہوا کرتی تھی

* انڈین میل - مورخہ ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۱۷ ع -

لیکن اب چھوٹی ہوتی ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں - اس چھوٹی تقطیع کا پہلا نمبر ۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کو شائع ہوا ہے - اس کی دوسری اشاعتوں میں ہندی شاعری کی مختلف اصناف مثلاً کبت ' سورٹھہ ' بسنت ' ہوری اور کہروا وغیرہ کے انتخابات ہیں - ایک ناٹک " نتمبنی ناٹک " کے نام سے سلسلہ وار شائع ہو رہا ہے - میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ " میں " سدھابرشا " کا ذکر کیا ہے - لیکن یہ رسالہ ہندی اور بنگالی دونوں زبانوں میں سنہ ۱۸۵۴ ع میں کلکتہ سے شائع ہوا کرتا تھا * —

میور گزٹ - اس کے متعلق میں نے اپنے سنہ ۱۸۶۹ ع کے خطبے میں ذکر کیا تھا - یہ اردو کا رسالہ میرٹھہ سے نکلتا ہے - اب دیوناگری خط میں بھی اس کے مضمون اردو کے ساتھہ ساتھہ شائع ہوتے ہیں —

مخزن العلوم - یہ رسالہ بریلی سے نکلتا ہے جیسا کہ میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ " (جلد ۳ - ص ۴۱۳) میں ذکر کیا ہے —

مظفرپور کی سائنٹفک سوسائٹی اپنے رسالے " اخبار الاخیار " کو کامیابی کے ساتھہ چلا رہی ہے - مہینے میں یہ دو مرتبہ نکلتا ہے - اس رسالے کے نسخے اس کے قابل مدیر مولوی سید امداد علی خان بہادر ازراہ کرم مجھے بھیجدیا کرتے ہیں - یکم ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ۲۰ اگست کے جلسے کی کارروائی بھی درج ہے —

---

* J. Long., Catalogue of Bengali publications, p. 61.

مسلمان اس بات سے مطمئن ہیں کہ سرکاری مدارس میں ہندوستانی ' عربی اور فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - عربی اور فارسی ان کی کلاسکی زبانیں ہیں اور وہ سنسکرت کی طرح مردہ زبانیں نہیں ہیں ان کی وہی حیثیت ہے جو یورپ میں یونانی اور لاطینی کی ہے - مسلمانوں کو یہ بات بھی بہت پسند ہوئی ہے کہ حکومت کا ارادہ ہے کہ روز مرہ کی زبان میں نئی کتابیں لکھوائی جائیں ' انگریزی سے ترجمے کرائے جائیں اور اس کام کو ترقی دینے میں ہمت افزائی کی جائے - مسلمانوں کی تمام علمی انجمنیں حکومت کی اس کے لیے شکر گذار ہیں - " اخبار الاخبار " میں ایک مضمون ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ روزمرہ کی زبان میں تعلیم دینے سے تعلیم میں سہولت پیدا ہوگی اور دیسی لوگوں کو تعلیم سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا - اسی اشاعت میں میری ان چند سطروں کا ترجمہ بھی درج ہے جو میں نے مظفر پور کی انجمن کے متعلق اپنے سنہ ۱۸۷۰ ع کے مقالے میں سپرد قلم کی تھیں -

روھیلکھنڈ اخبار - مسٹر کمپسن کی رائے ہے کہ یہ ایک عمدہ اخبار ہے - اس میں بعض اوقات نہایت اعلی درجے کے دلچسپ مضامین ہوتے ہیں —

نجم الاخبار - اس اخبار میں خاص طور پر تعلیمی مسائل پر مضامین ہوتے ہیں - اس کی رائے قابل قدر سمجھی جاتی ہے —

ملکل سماچار - اس کے متعلق میں اپنے سنہ ۱۸۷۰ ع کے مقالے میں ذکر کرچکا ہوں - اس میں انجمن ہند کی کارروائیاں درج ہوتی ہیں - اس انجمن کا مقصد ہندوؤں کی معاشرتی اصلاح ہے تاکہ شادی بیاہ پر فضول خرچی کو روکا جائے -

التالیق پنجاب - مسٹر ہولرائڈ جو پنجاب کے ناظم تعلیمات ہیں اور ایک

روشن خیال شخص ہیں اہل ہند کی تعلیمی ترقی کے لیے برابر کوشاں ہیں - یہ ماہوار رسالہ ان کی سرپرستی میں منشی پیارے لال کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے - اس میں تاریخ جغرافیہ اور سائنس پر نہایت مفید مضامین ہوتے ہیں مسٹر ہولرائڈ کا مقصد اس رسالے سے یہ ہے کہ اہل ہند کی معلومات میں اضافہ ہو - موصوف ازراہ نوازش یہ رسالہ مجھے برابر بھیجتے رہتے ہیں - اس کی آخری اشاعت میں حکومت انگلستان پر ایک مختصر مضمون ہے ' انگلستان اور ہندوستان کے بادشاہوں کی ایک فہرست ہے جس میں ان کے عہد حکومت کا مقابلہ کیا گیا ہے اور ایک بیس صفحے کا "کنفوشس" پر مضمون ہے —

علی گڑھ اخبار - دیسی اخباروں میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اس واسطے کہ اس میں سید احمد خان بہادر کے مضامین اور بعض اوقات ان کے جوابات شائع ہوا کرتے ہیں - اس اخبار کے بعض مضامین ایسے ہیں جن کا ذکر صوبۂ شمالی مغربی کے ناظم تعلیمات کی سنہ ۱۸۷۰ ع کی رپورٹ میں کیا گیا ہے - اس اخبار کی ۷ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ایک مضمون میری نظر سے گذرا جس میں پٹیالہ کے پنڈت کاشی ناتھ نے اخبارات کی اس ذمہ داری پر بحث کی ہے جو قومی بیداری پیدا کرنے کے لیے ان پر عائد ہوتی ہے - پنڈت جی اپنی

ہندوستانی نظموں اور دوسری تصانیف کے باعث مشہور ہیں - ان کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ " میں بھی (جلد ۲ ص ۱۲۶) ذکر کیا ہے - اس اخبار کی ۱۱ مئی سنہ ۱۸۸۱ ع کی اشاعت میں سید خیرالدین وزیر اعظم تیونس کی کتاب " رقوم المسالک " کے مقدمہ کا ترجمہ درج ہے - اس کتاب میں اس ملک کی تصویر کھینچی گئی ہے جہاں اسلامی نقطۂ نظر سے اچھا نظم و نسق قائم کیا گیا ہو- ۶ اکتوبر کی اشاعت میں ایک مضمون ہے جس میں تعلیم یافتہ اور ہوشمند اہل ہند سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے اپنی تحریر یا کسی اور ذریعہ سے اپنی یادگار میں ادارے قائم کیے جائیں یا جو ادارے انہوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے قائم کیے ہیں ان کے باقی رہنے کا انتظام کریں - ۱۳ اکتوبر کے نمبر میں عربی الفاظ " تصنیف " اور " تالیف " کے فرق پر ایک عالمانہ ملحوظ شائع ہوا ہے —

اخبار تہذیب الاخلاق علیگڑھ کا یہ اخبار خاص طور پر مسلمانوں کے مذہبی مسائل سے بحث کرتا ہے - اس میں میری نظر سے سید احمد خاں کا ایک مضمون گزرا جس کا عنوان " مذہبی عقائد اور تعلیم عامہ " تھا - اس مضمون میں سید صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ تعلیم کے نصاب میں سے مذہبی تعلیم کو خارج

نہیں کیا جاسکتا - علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار " علیگڑھ اخبار " میں سید صاحب کا یہ مضمون نقل کیا گیا تھا - اس پر " اودھ اخبار " نے مخالفت کی اس لیے کہ اس اخبار کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو خوش کرنا چاہتا ہے - غرض کہ کچھ عرصے تک دونوں اخباروں میں نوک جھوک ہوتی رہی —

لکھنؤ سے " رسالۂ جلسہ تہذیب " کی نومبر سنہ ۱۸۷۰ ع کی اشاعت میں ۲۲ صفحوں کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انگریزی حکومت کے ان مساعی کا ذکر ہے جو اس نے ہندوستان میں علوم و فنون اور صنائع کی ترقی کے لیے کی ہیں - یہ مضمون ایک مسلمان کے قلم کا لکھا ہوا ہے جن کا نام مولوی محی الدین خاں صاحب بہادر رئیس کاکوری ہے - موصوف علمدوست شخص ہونے کے علاوہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں - ایک زمانے میں موصوف سرکار اودھ کی طرف سے انگلستان کے شاہی دربار میں مامور تھے میری اُن سے اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب وہ نواب اودھ کی والدہ کے ساتھ پیرس تشریف لائے تھے نواب اودھ کی والدہ کا یہیں انتقال ہوگیا تھا —

ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظما نے ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۵۴ ع کے اپنے مراسلے میں اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ یہ اس کا فرض ہے کہ مفید علوم و فنون کے ذریعہ اہل ہند کی اخلاقی اور مادی حالت درست کی جائے - ان الفاظ سے ہندوستان کی حکومت کے اس ارادے کا پتہ چلتا ہے جو وہ اہل ہند کی تعلیم کے متعلق رکھتی تھی - مسٹر' پیل' نے

جو احاطۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات ہیں ' ان مذکورہ بالا الفاظ کو اپنی سالانہ رپورٹ بابتہ سنہ ۱۸۶۹ ع سنہ ۱۸۷۰ ع کا زیب عنوان بنایا ہے - اس ۵۴۸ صفحات کی رپورٹ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر پول نے ان الفاظ کو کس طرح عملی جامہ پہنانے کی سعی بلیغ کی ہے - لیکن اس رپورٹ میں ہندوستانی کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہوتی ہیں اس واسطے کہ احاطۂ بمبئی میں مرہٹی اور گجراتی کا عام طور پر زیادہ رواج ہے —

مسٹر 'ہاول' نے برطانوی ہند کے جو تعلیمی اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بھر میں مدرسہ جانے والے طلبا کی تعداد ۲۵ لاکھ کے قریب ہے - ان مدارس میں ہندوستانی یا دوسری مقامی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے - صرف کلکتہ ' مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے - قومی درسگاہوں کے طلبا کی تعداد ۱۰۹۶۰۲۸ ہے جو ۳۷۰۶۷ مدارس میں تعلیم پاتے ہیں - ۵ لاکھ طلبا سرکاری مدارس میں ہیں - ایسے مدرسے جنھیں سرکاری امداد ملتی ہے ۲۷۵۷۲ ہیں اور ان میں ۳۰۱۷۸۹ طلبا پڑھتے ہیں - حکومت کا یہ بھی ارادہ ہے کہ ان ہندوستانی لوگوں کے لیے جنھیں حصول معاش کے مشاغل کے باعث دن میں فرصت نہیں ملتی ان کے لیے مدارس شبینہ کا انتظام کیا جائے - اگر اس منصوبے میں کامیابی ہوئی تو طلبا کی تعداد بڑھ جائے گی * - ایسے مدرسے جو

(*) ضلعوں کے ایک ہزار مدارس میں جو براہ راست انگریزی حکومت کے تحت ہیں جسمانی سزا کی اجازت نہیں ہے سوائے غیر معمولی حالات کے - عام طور پر طلبا کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ مدرسے کے اوقات ختم ہونے کے بعد انہیں تھوڑی دیر کے لیے روک لیا جاتا ہے -

بالکل آزاد ہیں اور کسی قسم کی سرکاری امداد نہیں لیتے تعداد میں ۲۳۶۲ ہیں اور ان میں ۳۹۳۳۷ طلبا تعلیم پاتے ہیں - احاطۂ بمبئی میں طلبا کی تعداد سب سے زیادہ ہے اس کے بعد صوبہ شمال مغربی ' بنگال ' پنجاب اور مدراس کا نمبر آتا ہے - اگرچہ اودھ کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ ہے لیکن وہاں طلبا کی تعداد صرف ۳۶۹۴۰ ہے - لکھنؤ کے ماڈل اسکول کے صدر بابو رامچندر سین ہیں - اس اسکول کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اردو زبان کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے تاکہ اس زبان کے ذریعہ تہذیب کو ترقی ہو - اس اسکول کے ایک مدرس نے جس کا نام مولوی امان الحق ہے '' امان اللغات '' کے نام سے ایک لغت شائع کی ہے جس میں عربی الفاظ کے اصلی معنوں اور ان کے اردو میں مروجہ معنوں کا فرق واضح کیا ہے —

کیننگ کالج میں ۴۷۹ طلبا اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور صرف ۲۳ ہندی کی - لکھنؤ کے مارٹینر کالج میں سنہ ۱۸۷۰ ع میں ۲۷۱ طلبا ' تعلیم پاتے تھے جن میں سے ۲۰۰ اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور ۳۵ فارسی کی اور انگریزی زبان سبھوں کے لیے لازمی تھی -

ہندوستان کے تمام شہروں میں کتب خانے قایم ہوگئے ہیں - ان کتب خانوں سے قصبات کے مدرس اپنے نام کتابیں جاری کراسکتے ہیں بشرطیکہ وہ برائے نام تھوڑی سی رقم ادا کیا کریں - لکھنؤ کے کتب خانے میں جو صرف دو سال کا عرصہ ہوا قایم کیا گیا ہے اس وقت ۲۹۴ کتب موجود ہیں جن میں سے بیشتر اردو کی ہیں - لکھنؤ کے ریفارم کلب کے کتب خانے میں بچوں کی کتابوں کا ۱۱۶۲ جلدوں کا ذخیرہ موجود ہے —

بنگال میں تعلیم نسواں کو خوب ترقی ہو رہی ہے - زنانہ تعلیم کا والدین یا بھائی ایسا انتظام کرتے ہیں کہ مشرقی اور مغربی تعلیم کے فوائد سے عورتیں مستفید ہو سکیں - چونکہ عورتیں پردے میں رہتی ہیں اس لیے ان کی تعلیم میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں - ان تک صرف ان مردوں کی رسائی ممکن ہوتی ہے جو ان کے بالکل قریبی عزیز ہوتے ہیں - مدارس نسواں کی تعداد بہت محدود ہے اور ان میں صرف ایک خاص طبقے کی عورتیں تعلیم حاصل کرتی ہیں - اگرچہ ہندوستانی عورتیں تعلیم حاصل کرنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتی ہیں لیکن رسوم و روایات ان کے تعلیم حاصل کرنے میں مانع آتے ہیں —

مسلمانوں میں عام طور پر ہمیشہ سے عربی اور فارسی کی تعلیم کا رواج رہا ہے اور مسلمان عورتیں بھی عربی فارسی سیکھتی تھیں اور آج بھی سیکھتی ہیں - ان زبانوں کے سیکھنے سے یہ خاص فائدہ ہوتا ہے کہ قرآن اور دوسری مذہبی کتب کے پڑھنے کے علاوہ ادبیات کی کتابیں بھی مستورات اپنی طویل فرصت کے اوقات میں پڑھتی ہیں - قرآن اور دوسری مذہبی کتب کے پڑھنے سے انہیں روحانی تشفی حاصل ہوتی ہے - لیکن اعلیٰ طبقوں کی عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں بالکل جاہل رہتی ہیں اور انہیں کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہوتی - ان کی تعلیمی آزادی انگریزی حکومت کی رہین منت ہے —

ہندوستان میں بالعموم انگریزی تعلیم کے خلاف ردعمل پیدا ہو گیا ہے اور خاص طور پر صوبۂ شمال مغربی میں مشرقی علوم اور السنہ کی طرف توجہ کی جا رہی ہے - اس مقصد کے حصول کے لیے اہل ہند ایسے ادارے قایم کر رہے ہیں جہاں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا انتظام

کیا جائے تاکہ یورپین اثرات سے بچاؤ ممکن ہو - یہ مدارس باوجود سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے خوب ترقی کر رہے ہیں - جس طرح یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے وقت یونانی اور لاطینی سیکھنے کا لوگوں کو شوق پیدا ہوگیا تھا بالکل اسی طرح آج کل ہندوستان میں سنسکرت اور عربی کا چرچا بڑھ گیا ہے - ان دیسی مدرسوں میں قابل اساتذہ پڑھاتے ہیں اور ان کے درسوں میں لوگ شوق سے شرکت کرتے ہیں - ان مدرسوں میں صرف کلاسکی علوم ہی نہیں پڑھائے جاتے بلکہ اس کے ساتھ جدید ادبیات کی تعلیم کا بھی انتظام ہے تاکہ جدید طرز کے انشاپرداز پیدا ہوں * —

جیسا کہ کرنل نسولیز نے کہا ہے اہل ہند کی یہ خواہش ہے کہ وہ مغربی علوم و فنون حاصل کریں لیکن اپنی مروجہ زبانوں کے ذریعہ سے نہ کہ انگریزی کے توسط سے - وہ انگریزی زبان اپنی خوشی سے سیکھنا چاہتے ہیں - وہ یہ نہیں چاہتے کہ انہیں اس زبان میں امتحان کامیاب کرنے پر مجبور کیا جائے جو ان کی اپنی زبان سے بالکل مختلف ہے - بنگال میں یورپین تعلیم کا رواج بہ نسبت ہندوستان کے دوسرے حصوں کے زیادہ پایا جاتا ہے لیکن بنگال کل ہندوستان نہیں ہے - شمالی ہند کے باشندے جو اہل بنگال کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہیں اپنی زبان اور اپنی روایات کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں - مسلمان اور ہندو دونوں اپنی قدیم زبانوں اور ادبیات کا احترام کرتے ہیں - وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچے انگریزی کی تعلیم کی خاطر اپنی روایات سے بیگانہ رہیں اور اپنے

---

* ڈاکٹر لیٹنر کے زیر سرپرستی لاہور سے ایک عربی رسالہ جاری ہوا ہے جسکا نام " النفع العظیم " ہے -

مذہب اور اپنی رسوم سے انہیں ایک طرح کی نفرت پیدا ہو جائے - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کو اس میں سہولت ہوتی ہے کہ اپنی زبان دیسی لوگوں کو سکھائیں بجائے اس کے کہ ان کی زبان خود سیکھیں - شمال مغربی صوبے کے لوگوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ حکومت انگریزی داں بنگالیوں کو اعلیٰ خدمات پر مامور کرتی ہے بجائے اس کے کہ مقامی لوگوں کو اعلیٰ عہدے سپرد کیے جائیں جو بالعموم انگریزی زبان سے واقف نہیں ہیں - بنگالی لوگ واقعی نہایت ذہین ہوتے ہیں - انہوں نے بڑے شوق سے انگریزی تعلیم حاصل کی ہے - لیکن جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے اہل بنگال ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے پست حالت میں ہیں * - مسلمانوں کا حکومت سے یہ مطالبہ ہے جیسا کہ امیر علی خان نے اپنی لندن کی تقریر میں کہا تھا کہ ان کے اور ہندوؤں کے درمیان غیر جانبدارانہ برتاؤ کیا جائے —

کلکتہ یونیورسٹی نے اپنے امتحانات کی جانچ انگریزی زبان میں رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں - (۱) کوئی اورینٹل کالج ایسا موجود نہیں جہاں تاریخ، سائنس اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو اور امتحانات کی تیاری کی جا سکے - (۲) اعلیٰ جماعتوں کے لیے انگریزی کے علاوہ کسی زبان میں کتابیں موجود نہیں ہیں - (۳) مترجمین کی نا اہلیت - (۴) دیسی زبانوں میں سائنٹفک اصطلاحوں کو ادا کرنے کی عدم صلاحیت - لیکن اگر یہ سب وجوہ درست بھی ہوں تو کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ دیسی زبانوں کے ذریعہ امتحان میں

---

* The Oriental Movement in the North- West, p. 3.

شرکت کرنا چاہتے ہیں انہیں ایسا کرنے کا موقع نہ دیا جائے - لیکن حقیقت میں جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں · دیسی زبانوں میں نہ کتابوں کی کمی ہے اور نہ مترجموں کی - اردو میں مغربی علوم اچھی طرح ادا کیے جاسکتے ہیں اور اس میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت موجود ہے کہ قوانین فطرت' فلسفہ اور سائنس کے مطالب بیان کیے جاسکیں - مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے پیشتر اس کے کہ دوسرے طریقوں کی چھان بین کرے من مانے طور پر یہ فیصلہ کرلیا کہ انگریزی زبان ذریعہ تعلیم ہونی چاہیے اور یہ طریق تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی ہونا چاہیے · کلکتہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ آیا دیسی زبانوں میں سائنٹفک اصطلاحات ادا کی جاسکتی ہیں یا نہیں ؟ - اس کا ثبوت اس وقت اچھی طرح مل سکتا تھا جب کہ یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں طلبا کو اس کا موقع دیا جاتا کہ وہ دیسی زبان میں اپنے مطالب ادا کریں - شمالی ہند کے ہندوستانی لوگ صرف یہی چاہتے ہیں کہ انہیں یہ موقع دیا جائے - اگر حکومت اس تجویز کو منظور کرلے تو ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ وہ فوائد حاصل کرسکے گا جو اب تھوڑی سی تعداد کے لیے مخصوص ہوگئے ہیں - اس سے یہ بھی ہوگا کہ اعلیٰ عہدوں پر یورپ زدہ ہندوستانیوں کا اجارہ ختم ہوجائے گا - اس تجویز کو منظور کرنے سے حکومت اہل ہند کے ایک بڑے طبقے کو اپنا گرویدہ بنالے گی جو انگریزی زبان کی لازمی تعلیم کو پسند نہیں کرتے - بہت سے لوگ جو اب انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں جانے سے احتراز کرتے ہیں مشرقی مدارس میں خوشی سے شرکت کریں گے اور جدید تمدن کی برکتوں سے

مستفید ہوسکیں گے جس کے متعلق ہندوستانی زبان کے ذریعہ انہیں معلومات حاصل ہوں گی - ہندوستانی زبان سے ان لوگوں کو جو دلی تعلق ہے وہ انگریزی سے کبھی نہیں ہوسکتا - اگر حکومت نے اپنے نظام تعلیم میں یہ تبدیلی قبول کرلی تو انگریزی اداروں کی انصاف پسندی اور انسانیت دوستی کا اہل ہند کو احساس پیدا ہوگا درآنحالیکہ اب انہیں اداروں کے متعلق ان کی واقفیت ناقص ہے اور اسی لیے وہ ان سے نفرت کرتے ہیں - ہندوستانی زبان میں تعلیم ہونے سے اہل ہند کی تعلیم عامہ کو بہت فروغ حاصل ہوگا - مغربی خیالات کی بدولت ان کے ادب کو ترقی حاصل ہوگی اور ان کی زبان کے نشو ونما میں مدد ملے گی - اب اندھا دھند انگریزی الفاظ ہندوستان میں ٹھونسے جارہے ہیں لیکن اگر زبان کی ترقی ہوئی تو اس بات کی تمیز بھی پیدا ہوگی کہ کونسے لفظ مفید ہیں اور کونسے بیکار ہیں اور زبان میں نہیں کھپ سکتے - مولوی اور پانڈت لوگ جب مغربی علوم و فنون کے ترجموں کو پڑھیں گے تو انہیں احساس ہوگا کہ تمام انسانی علوم صرف سنسکرت اور عربی زبان تک محدود نہیں ہیں جیسا کہ وہ اس وقت یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے —

انگریزی درسگاہوں میں ہندوستانی لوگ جو مغربی علوم حاصل کرتے ہیں اسکا اثر بہت محدود رہتا ہے - قوم کی زندگی میں اسکا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا - انگریزی داں طبقے کی گویا ایک علحدہ ذات سی بن گئی ہے - یہ انگریزی داں اپنے خیالات سے اپنے ہم وطنوں کو اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعہ مستفید نہیں کرتے - ان کی معلومات انہیں تک محدود رہتی ہیں - یہ لوگ دیسی زبانوں کی ادبی مجلسیں

قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتے اس واسطے کہ وہ اپنے ادب اور اپنی زبان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں - یہ لوگ انگریزی سے ہندوستانی میں ترجمہ تک نہیں کرسکتے اور اگر کرتے ہیں تو ہندوستانی محاوروں کے ساتھہ انگریزی محاورے اسطرح ملا دیتے ہیں کہ وہ صاف طور پر نظر آتے ہیں - وہ انگریزوں کی طرح انگریزی لکھنے پر فخر کرتے ہیں —

مشرقی مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبا کی استعداد اچھی خاصی ہوتی ہے لیکن وہ مغربی علوم سے بے بہرہ ہوتے ہیں - انگریزی درسگاہوں سے بعض نہایت لائق طلبا نکلے ہیں جن کی سائنس کی معلومات اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں لیکن مشرقی ادب سے وہ بالکل بیگانہ ہوتے ہیں - مجھے اس کی توقع ہے کہ کچھہ عرصے بعد دونوں قسم کی درسگاہوں میں ایک طرح کی مفاہمت کی صورت پیدا ہوجائیگی - یہ صحیح ہے کہ انگریزی درسگاہوں میں قدیم مشرقی علوم رائج کیے گئے ہیں لیکن نہایت محدود طریقے پر - اسی طرح مجھے توقع ہے کہ مشرقی درسگاہوں میں انگریزی کی تعلیم رائج کی جائیگی - اس طرح دونوں طریقہ ہائے تعلیم میں ایک قسم کی خوشگوار مسابقت پیدا ہوجائیگی —

کلکتہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے قطعی طور پر فیصلہ کیا ہے کہ وسطانیہ کے امتحانات ہندوستانی اور دوسری مروجہ زبانوں میں ہونے چاہییں - وسطانیہ کے آخری امتحان کے بعد امیدوار کو اس کی قابلیت کی تصدیق کا صداقت نامہ دیا جائیگا - اس قسم کا پہلا امتحان یکم مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع منعقد ہوگا * - اردو میں سید احمد خان کی " آثارالصنادید " اور " دیوان غالب " نصاب میں شامل ہیں - اس سے یہ ہوگا کہ خالص

* علیگڑہ اخبار - مورخہ ۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع —

انگریزی تعلیم کا اثر جسے ہندوستان میں لارڈ میکالے نے جاری کرایا کچھہ کم ہوجائیگا - بھلا مشرق کو مغرب بنانا' چاہے اس کے نتائج کچھہ بھی نکلیں ' ایک ناممکن بات کی کوشش کرنا نہیں تو کیا ہے —

پنجاب اور صوبۂ شمال مغربی کے ہندوستانیوں کی یہ دیرینہ آرزو ہے کہ ان کے لیے ایک مشرقی جامعہ قایم کی جائے - دیکھیے یہ آرزو کب پوری ہو ؟ - فی الحال انہیں یونیورسٹی کالج لاہور کے قیام پر صبر شکر کرنا چاہیے - ڈاکٹر 'لیٹنر' نے جو اس کالج کے پرنسپل ہیں اپنی رپورٹ میں اس کالج کی ترقی کے نہایت امید افزا حالات بیان کیے ہیں *- مجھے پوری توقع ہے کہ عنقریب یہ کالج خوب فروغ حاصل کرے گا - اس کالج کا سرمایہ جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع میں ۱۰۵۶۰۳ روپیے تھا اور اب ۲۹۴۴۶۷ روپیے ہے - اس کی سالانہ آمدنی پہلے ۲۲۶۸۰ روپیے سالانہ تھی اور اب ۴۲۲۲۰ روپیے سالانہ ہے - اس درسگاہ کی بدولت پنجاب میں سرکاری کالجوں کی تعداد اب ۳۴ ہوگئی ہے - اس میں طلبا کی تعداد ۱۷۶ ہے جو سب ۱۶ سال کی عمر سے زیادہ کے ہیں - رپورٹ میں ان امیدواروں کی تعداد درج ہے جنھوں نے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے - اب انہیں وہ فوائد حاصل ہوں گے جن کے وہ متوقع تھے - کامیابی حاصل کرنے والے امیدواروں میں ۱۷ مسلمان ہیں ۴۹ ہندو اور سکھہ ہیں —

اس درسگاہ میں تعلیم کا طریقہ تینوں سرکاری یونیورسٹیوں سے مختلف ہے جہاں ریاضی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے - یہاں یونان و رومہ

---

* ڈاکٹر لیٹنر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں شہرت رکھتے ہیں - ان کی علمی خدمات کے صلہ میں ملکۂ معظمہ نے انہیں سی آئی ای کے خطاب سے سرفراز کیا ہے - مجھے توقع ہے کہ بہت جلد وہ اسٹار آف انڈیا کے خطاب سے سرفراز ہوں گے -

کی تاریخ کے بجاے سرکاری یونیورسٹیوں کے دستور کے خلاف ایشیا کی تاریخ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس لیے کہ یورپ کی تاریخ کے مقابلے میں اہل ہند کے لیے یہ زیادہ مفید ہے —

ہزار روپیے ان مصنفین و مولفین کی امداد کے لیے حکومت کی طرف سے رکھے گئے تھے جن کی کتابیں سلیس ہندوستانی زبان میں ایسے موضوع پر ہوں گی جو عام طور پر مفید ہوں - ان کتابوں کی طباعت کے لیے ایک ہزار سات سو روپے علحدہ تھے - اس کے علاوہ ہزار روپے کے دو انعام رکھے گئے جو علوم فطرت اور علوم صحیح پر بہترین مضمون لکھنے والوں کو دیے جائیں گے —

لاہور کا شعبۂ طب جس کا افتتاح ۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کو ہوا یونیورسٹی کالج کا ایک حصہ ہوگا - علم طب کے طلبا اور دیسی اطبا کے لیے یہاں کیمیا ' علم الاجسام اور دائی کے کام کی تعلیم دی جاے گی - یہاں درس ہفتہ وار ہوا کریں گے - ایام حمل ' زچگی اور بچوں کے متعلق ہندوستانی زبان میں جو رسائل لکھائے گئے ہیں وہ صوبے کے سب سول اسپتالوں میں تقسیم کیے گئے ہیں - اردو میڈیکل گزٹ جو ماہوار نکلتا ہے اس کے نسخے تین سو کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں - مغربی علم طب اور جراحی کے متعلق ایک مستند کتاب اردو میں لکھائی جارہی ہے اور عنقریب شائع ہوجاے گی —

ہندوؤں کے مدارس میں الہ آباد کا "دھرم گیان اپدیش پاٹ شالہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے - یہ مدرسہ جولائی سنہ ۱۸۷۰ ع میں قائم کیا گیا - یہاں ہندی ' سنسکرت ' ریاضی اور انگریزی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - انگریزی کی تعلیم پنڈت کاشی ناتھ کے سپرد ہے جو اس کام

کے اہل ہیں - ۸ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس مدرسے میں پنڈت ہردیودت کے زیر صدارت جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا - صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں ان والدین کی خوب خبر لی جو اپنے بچوں کی مذہبی اور دھلی تعلیم کی مطلق پروا نہیں کرتے - اس کے بعد طلبا نے قدیم مذہبی کتابوں میں سے مناجاتیں پڑھیں جنھیں حاضرین جلسہ نے بہت پسند کیا - یہ مناجاتیں ایسی ہیں کہ ان کے خلاف کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا اور ان سے بچوں کی مذہبی تعلیم کا مقصد بدرجہ اتم پورا ہوجاتا ہے * —

مہاراجہ کشمیر و جمو نے اپنی ریاست میں ایک کالج قایم کرنے کے لیے ایک لاکھ روپیہ دیا ہے - اس کے علاوہ اتنی ہی رقم دو مدرسوں کے لیے سالانہ دینے کا وعدہ کیا ہے جہاں پنڈت بخشی رام کی نگرانی میں پانچ سو طلبا کی تعلیم کا انتظام کیا جاے گا تاکہ ریاست کے آئندہ عہدہ دار ان مدارس کے تعلیم یافتہ ہوں - ان مدرسوں میں انگریزی اور ہندوستانی کے علاوہ قدیم زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہوگا - سائنٹفک کتابوں کے ترجمے اور طباعت کے لیے ۳۰ ہزار روپے کی منظوری دی گئی ہے † —

راجکوٹ (کاٹھیاواڑ) میں راجکماروں کے کالج کا ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کو سر ایس فٹزجیرلڈ گورنر صوبہ بمبئی نے افتتاح کیا - افتتاحی رسم نہایت شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی - میں سنہ ۱۸۷۰ کے مقالے میں اس کے متعلق ذکر کر چکا ہوں کہ کرنل کیٹنگ کو سب سے پہلے اس کالج کے قایم

---

* علی گڑھ اخبار - مورخہ ۱۷ فروری سنہ ۱۸۷۱ م -

† اخبار عالم - مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع (میرٹھ) -

کرنے کا خیال آیا تھا - اس جلسہ میں مسٹر پیل ناظم تعلیمات صوبہ بمبئی نے بھی شرکت کی - موصوف اب اپنے عہدے کے فرائض سے سبکدوش ہوچکے ہیں اور مسٹر چسٹر مکنا ئٹن ان کی جگہہ ناظم تعلیمات مقرر ہوے ہیں - کاٹھیاواڑ کے والیان ملک کے ولیعہد اور دوسرے راجکمار تعلیم و تربیت کی غرض سے اس کالج میں شریک ہوچکے ہیں - اس کالج کے سرمایہ میں ابھی حال میں ۴ لاکھہ ۵۰ ہزار فرانک کا مزید اضافہ ہوا ہے * -

'کچھہ' کے راؤ صاحب کامدت سے ارادہ تھا کہ 'مندوی' میں ایک ہائی اسکول قایم کیا جاے - اس کے لیے ڈیڑھ لاکھہ روپے کی رقم علحدہ رکھہ دی گئی تھی - حال ہی میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوگا - راؤ صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پانچ ہزار روپے سالانہ اس مدرسہ کی داشت کے لیے دیں گے تاکہ اس رقم میں سے طلبا کو بھی وظائف دیے جاسکیں اور طلبا کی ایک مقررہ تعداد کے بہم پہنچنے کا اطمینان ہوسکے † —

مہاراجہ پٹیالہ نے جو علاوہ ستانی والیان ریاست میں نہایت روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہیں' اپنی ریاست میں تعلیم عامہ کو بہت فروغ دیا ہے - مہاراجہ کے وزیر اعظم خلیفہ سید محمد حسین نے تعلیم کا ایک خاکہ تیار کیا ہے جس کے مطابق عمل ہورہا ہے - خلیفہ سید محمد حسین کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے بھی رکن ہیں - انہوں نے ریاست کے محکمۂ تعلیمات کے لیے ایک علحدہ وزیر مقرر کیا ہے - پٹیالہ کالج میں ذریعہ تعلیم اردو ہے اور انگریزی' فارسی' عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - ریاست پٹیالہ کے بارہ شہروں میں بھی مدارس قایم کرنے کا حکم ہوچکا ہے -

---

* انڈین میل مورخہ ۲۶ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع -

† علی گڑہ اخبار مورخہ ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

ان مدارس میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جاے گا - وزیر اعظم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت کی مستند کتب کا اردو میں ترجمہ کرایا جاے اور مترجموں کو اس کا معاوضہ دیا جاے - نیز ان کتابوں کی طباعت کا ریاست کی طرف سے انتظام ہو —

مہاراجہ پٹیالہ نے ڈیوک آف اڈنبرا کی تشریف آوری کے موقع پر لاہور کی شرقی جامعہ کے قیام کے لیے ۷۶ ہزار روپے کا عطیہ دیا ہے -

تعلیم عامہ کے دیسی مدارس میں ضلع مرزا پور کا مدرسہ بھی قابل ذکر ہے - گزشتہ فروری کے مہینے میں ایک طالب علم کو عربی کی سند دی گئی ہے - سند کے ساتھ دستار بھی دی جاتی ہے - یہ دستور اس قسم کا ہے جس طرح ہمارے یہاں ''لورئے'' کے پھولوں کا تاج پہناتے ہیں * —

۶ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع کو سر ولیم میور، لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغربی نے 'گورکھپور' میں ایک دربار منعقد کیا جس میں بڑے بڑے امرا نے شرکت کی - اس دربار کا مقصد یہ تھا کہ امرا اور زمینداروں کے مادی اور اخلاقی مفاد کے متعلق غور کیا جاے - لفٹنٹ گورنر نے حسب معمول ہندوستانی زبان میں تقریر کی اور حاضرین سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی طرف متوجہ ہوں اور حکومت کی حتی الامکان مدد کریں تاکہ بچوں کو مارتالنے کی رسم قبیحہ اور دوسری معاشرتی خرابیوں مثلاً شادی کے فضول اخراجات وغیرہ کی اصلاح ممکن ہو - موصوف نے کہا کہ ضلع کے امرا کے باہمی تعاون ہی سے یہ ممکن ہوگا کہ شہری زندگی کی آسائش میں اضافہ ہو اور ضلع گورکھپور مرفہ الحالی اور علم کی ترقی

* ملی گزٹ اخبار ۲۶ فروری سنہ ۱۸۷۱ م -

میں ملک کے دوسرے حصوں کے دوش بدوش کھڑا ہو سکے * —

سر ولیم میور نے ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع بنارس میں ایک اور دربار منعقد کیا جس میں دیسی امرا اور رؤسا نے شرکت کی - موصوف نے نہایت سلیس ہندوستانی میں اس موقع پر تقریر کی اور کہا کہ صوبۂ شمال مغربی کو احاطۂ بنگال پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس صوبے میں زراعت پیشہ لوگوں کی ابتدائی تعلیم کا گاؤں میں خاص انتظام کیا گیا ہے - ان ابتدائی مدرسوں میں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں - لیکن صوبۂ شمال مغربی میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام اتنا اچھا نہیں ہے - بلا شبہ شہر بنارس میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں موجود ہیں اس لیے کہ یہ شہر صوبے کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے اور پھر نسبتاً کلکتہ سے قریب بھی ہے - الہ آباد میں سنٹرل کالج یا یونیورسٹی کالج قایم کرنے کی جو تحریک ہے وہ امید ہے کہ بار آور ہوگی - اس کالج کے قیام کے لیے مہاراجہ بنارس اور دوسرے امرا نے بڑی فیاضی سے عطیات دیے ہیں - یہ بھی تجویز ہے کہ الہ آباد میں ایک طبی (میڈیکل) کالج بھی قایم کیا جاے جس کے لیے مہاراجہ وزیانگرم نے عطیہ عنایت کیا ہے - جلسے کے اختتام پر سر ولیم میور نے ملکہ معظمہ کی جانب سے دو ہندو عالموں کو اسٹار آف انڈیا کے خطاب عطا کیے - یہ دونوں ہندو عالم راجہ جے کشن داس بہادر اعزازی معتمد مجلس ادبی ' علی گڑھ اور بابو شیو پرشاد ہیں - بابو صاحب کے اوصاف میں ایک یہ بھی ہے کہ آپ ہندوستانی کے فصیح شاعر ہیں اور ' وھبی ' تخلص کرتے ہیں —

---

* علی گڑھ اخبار ۳ فروری سنہ ۱۸۷۱ ع

ھاتھرس میں ایک جدید مدرسہ کے افتتاح کے موقع پر راجہ جے کشن داس نے ایک نہایت موثر تقریر کی جسے حاضرین نے بہت پسند کیا - راجہ صاحب کی تقریر کے بعد مسٹر ابچ ایم چیز' مجسٹریٹ ضلع' نے نہایت فصیح ھندوستانی میں حاضرین کو خطاب کیا - موصوف کی تقریر میں ایسی روانی تھی جیسی کہ کسی اھل زبان کی تقریر میں ھوتی - موصوف نے دوران تقریر میں وھی مشرقی تشبیھیں استعمال کیں جو حاضرین کے دلنشین ھوسکتی تھیں اور کہا کہ مجھے یہ دیکھکر بڑی مسرت ھوتی ھے کہ تعلیم عامہ کو ترقی دینے کے لیے حکومت کی مساعی میں خود اھل ھند شریک ھیں جیسا کہ اس جلسے سے ظاھر ھے - تعلیم ھی وہ ذریعہ ھے جس سے لوگوں کی اخلاقی بہتری پیدا ھوسکتی ھے - یہ جلسہ عبدالرزاق کی نظم پر ختم ھوا * —

سید احمد خان بہادر انگلستان میں دو سال تک رھے - ان کا جس طرح خیر مقدم کیا گیا اور جس طرح سب لوگ خوش اخلاقی سے ان سے پیش آئے اس سے سید صاحب بہت متاثر ھوئے ھیں - سید صاحب نے صاف صاف لکھا ھے کہ میری دلی تمنا ھے کہ میرے ھم وطن بھی اخلاق واطوار کے وہ طریقے سیکھیں جو انگریزی قوم میں پائے جاتے ھیں - سید صاحب نے اس باب میں جو رائے ظاھر کی ھے اس کے سبب سے ھندوستان میں ان کے بہت سے دشمن ھوگئے ھیں - لیکن ایک ھندوستانی مضمون نگار نے میرٹھ کے "اخبار عالم" میں سید صاحب کی تائید کی ھے اور وجاھت علی نے اس اخبار کے مدیر کو جو خط لکھا ھے اس میں بھی سید صاحب کے خیالات کو سراھا ھے - لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ھے کہ ھندوستانیوں

علیگڑھ اخبار - ۳۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

کو کسی طرح انگریزوں کے مقابلے میں کمتر اور پست نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ ایسے بہت سے ہندوستانی موجود ہیں جو کسی اعتبار سے بھی انگریزوں سے تعلیم و اخلاق میں کم نہیں ہیں - یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسے ہندوستانیوں کی تعداد بہت محدود ہے حالانکہ انگلستان میں ایسے انگریزوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کی تعلیم اور جن کے اخلاق کا معیار بلند ہے - سید صاحب کے خیالات کی تائید یا تنقید کے ضمن میں ضروری ہے کہ موصوف کے ذاتی تجربے کو پیش نظر رکھا جائے - سید صاحب نے شملہ، کانپور اور امرتسر کے سفر کے دوران میں مقامی انگریز حکام سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی - ہر جگہ انگریز حکام نے نہایت خوش خلقی سے سید صاحب کی درخواست کا جواب دیا - لیکن اس کے برخلاف سید صاحب نے اسی طرح کی ملاقات کی درخواست چار دیسی رئیسوں سے کی تو ان میں سے کوئی اخلاق سے پیش نہ آیا - پھر اس کے بعد اور تین سے ملاقات کی درخواست کی - ان میں سے ایک نے اپنے ملازم کے ہاتھ زبانی جواب کہلا بھیجا کہ کل صبح تشریف لائیے - دوسرے نے لکھا کہ فلاں وقت آئیے ورنہ کسی دوسرے وقت ملنا ممکن نہیں - تیسرے صاحب نے جواب دیا کہ دوسرے مشاغل کے باعث ملنا ممکن نہیں ہے —

یہ خط جس کا تجزیہ میں نے یہاں پیش کیا ہے تین کالموں میں ہے - اس پر مدیر نے اپنے تین کالم لکھے ہیں جن میں کم و بیش وہی مضمون پیش کیا گیا ہے - اس مضمون میں ہندوستانی رئیسوں کی خوب خبر لی گئی ہے اور ان کے غرور اور نکمّے پن کو صاف صاف بیان کیا ہے - ان کا برتاؤ اُن لوگوں سے جو دولت یا معاشرتی رتبے میں ان سے کمتر ہوتے ہیں اچھا نہیں ہوتا، چاہے وہ لوگ علم و فضل اور اپنی نیک اعمالی

کے باعث ان سے بلند تر مرتبہ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں - یہی لوگ جو اہل علم و فضل سے ملنے میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں بجائے اچھوں کی صحبت کے احمقوں اور مسخروں کی صحبت میں اپنا وقت گذارتے ہیں - اگر یہ لوگ اچھوں کی صحبت میں رہیں تو ان کی نصیحتوں اور مشوروں سے مستفید ہو سکیں —

اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ سید احمد خان نے اپنے ہم مذہبوں سے اپیل کی ہے کہ وہ بھی ان کی طرح اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کے لیے انگلستان بھیجیں بالخصوص وہ جو متمول ہیں اور معاشرہ میں حیثیت رکھتے ہیں - سید صاحب نے " علیگڑھ اخبار " مورخہ ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع میں ایک مضمون میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر ان کے بچے عیسائیوں کے ساتھ رہیں گے تو کوئی چیز مانع نہیں کہ وہ اپنے مذہب کے پابند نہ ہوں - اس کے ساتھ ایک خط انہوں نے اپنے صاحب زادے کا بھی نقل کیا ہے - یہ خط اصل میں ہندوستانی زبان ہی میں لکھا گیا ہے ' ترجمہ نہیں ہے - اس خط میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہم لوگ روزہ نماز کی ولایت میں رہ کر بھی پابندی کر سکتے ہیں اور شراب ' جوے اور سور کے گوشت سے احتراز کر سکتے ہیں - اس خط میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے مسلمان والدین کو پورا اطمینان ہونا چاہیے کہ ان کے بچوں کا دین ایمان ولایت جانے سے خطرے میں نہیں پڑ جاتا - وہ انگریزوں کی رواداری اور خوش اخلاقی پر بھروسہ کریں تو انہیں اپنے بچوں کو انگلستان بھیجنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے - وہ سید احمد خاں کی آزاد خیالی کا تتبع کر سکتے ہیں جن کی عزت نہ صرف مسلمانوں کے دل میں

ہے بلکہ اہل یورپ بھی ان کا احترام کرتے ہیں —

ہندوستان میں ادبی اور علمی انجمنیں اہل ہند کی ذہنی ترقی میں ممد و معاون ہیں - بالخصوص ان لوگوں کے لیے یہ انجمنیں بڑی دلچسپی اپنے اندر رکھتی ہیں جو تعلیم یافتہ ہیں - بقول فارسی شاعر کے :

بنی آدم از علم یابد کمال
نہ از حشمت وجاہ ومال و منال

کلکتہ میں ابھی حال میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام "اہل ہند کی اصلاح کی انجمن" (انڈین ریفارمیشن سوسائٹی) ہے - اس انجمن کا یہ مقصد ہے کہ اہل حاجت کی امداد کی جائے، متوسط طبقے کے لوگوں اور غریبوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور صنعت و حرفت کی ہر طرح ہمت افزائی کی جائے - تمام تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال ہندوستانی شوق سے اس انجمن کی رکنیت قبول کر رہے ہیں اور اپنے چندے داخل کر رہے ہیں تاکہ انجمن کو اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں تھوڑی بہت امداد ملے - مغل سرائے کی ادبی مجلس کے سب ارکان اس انجمن میں شریک ہو رہے ہیں - توقع کی جاتی ہے کہ دوسری ادبی اور علمی انجمنوں کے ارکان بھی اس انجمن میں شرکت کریں گے * —

کلکتہ کی مسلمانوں کی مجلس ادبی کے علاوہ جس کی نسبت میں پیشتر متعدد مرتبہ ذکر کر چکا ہوں دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع میں بنارس میں بھی ایک انجمن سید احمد خاں کے مقاصد کے تحت قایم ہوئی ہے جس کا نام "کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" رکھا گیا

* علیگڑھ اخبار - ۱۰ فروری سنہ ۱۸۷۱ م —

ہے - اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے قدیم علوم کا احیا مغربی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ جاری رہنا چاہیے - اس کے لیے انجمن کی طرف سے مسلمان مصنفین کے لیے انعام مقرر کیے جائیں گے جو مسلمانوں کے قدیم علوم پر اپنی تحقیقات شائع کریں گے - ۶ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع کے "علی گڑھ اخبار" میں اس انجمن کے قواعد شائع ہوئے ہیں - ارکان کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ سب مسلمان ہوں لیکن وہ انگریز بھی شریک ہو سکیں گے جو مسلمانوں کی علمی اور ادبی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کے متعلق ہیں - اسی اخبار میں ان ارکان کے نام درج ہیں جو اس انجمن کے اب تک رکن بن چکے ہیں - سید احمد خاں اس کے معتمد ہیں - اس اخبار میں ان مضمونوں کی بھی فہرست درج ہے جن کے متعلق انجمن مضامین لکھوانے والی ہے - آئندہ اس اخبار میں انجمن کی کارروائیوں اور جلسوں کی روداد عام اطلاع کی غرض سے شائع ہوا کرے گی —

۱ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کے "علی گڑھ اخبار" میں بنارس کی مذکورہ بالا انجمن کی ذیلی کمیٹی کا اعلان کیا گیا ہے - اس کمیٹی کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ اردو کی تمام کتابوں کی، چاہے وہ اصل ہوں یا ترجمے ہوں مطبوعہ ہوں یا غیر مطبوعہ، ایک مضمون واری فہرست تیار کی جائے جس میں مختصر طور پر کتاب اور مصنف یا مترجم کا نام ہوگا - ایسی کتابوں کی علحدہ فہرست تیار کی جائے گی جو دستیاب ہو سکتی ہیں اور ان کی علحدہ جو دستیاب نہیں ہو سکتیں - وہ کتابیں علحدہ رکھی جائیں گی جو یونیورسٹیوں کے امتحانات میں کام آتی ہیں - ذیلی کمیٹی کی تمام کارروائیاں بعد میں انجمن کے عام جلسے میں پیش ہوں گی جو ہر کام کے متعلق قطعی فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا - انجمن ان اسباب کی تحقیق کرے

گی جن کے باعث سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبا کی تعداد کم ہے - اس کے اسباب کی بھی تحقیق کی جائے گی کہ مسلمانوں کے قدیم علوم کیوں کس مپرسی میں پڑے ہوئے ہیں اور جدید علوم کی طرف انہوں نے اب تک کیوں توجہ نہیں کی ہے - ان موضوعوں پر بہترین مضامین لکھنے والوں کے لیے تین انعام بھی رکھے گئے ہیں - ایک ۵۰۰ روپے کا' ایک ۳۰۰ کا اور ایک ۱۵۰ روپے کا - یہ مضمون ہندوستانی زبان میں ہونے چاہییں اور معتمد انجمن کے نام بھیجے جائیں - مضمون نگاروں کے لیے مسلمان ہونا لازمی ہے - ان مضامین کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ ایک خاص کمیٹی کرے گی جو اسی غرض کے لیے مقرر کی جائے گی - ان مضامین میں اصلاح حال کے جو مشورے دیے جائیں گے ان کو انجمن کی ذیلی کمیٹی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی —

لکھنؤ کی انجمن تہذیب بدستور اچھی حالت میں ہے - اس میں بعض نہایت قابل قدر لوگ شریک ہیں - اس کے ارکان میں نواب شجاع الدولہ کے ایک پوتے بھی ہیں جن کا نام مرزا امام علی خان ہے - اس انجمن کے معتمد بابو شیونارائن نے سالانہ رپورٹ بابتہ سنہ ۱۸۷۰ ع انجمن کے ماہوار رسالے میں شائع کی ہے - اس رپورٹ میں ان تمام کارروائیوں کی روداد شامل ہے جو انجمن کے مقاصد کے حصول کے لیے کی گئیں - رپورٹ میں اس بات کی یاد دہانی کی گئی ہے کہ انجمن سنہ ۱۸۶۸ ع میں ایک درجن ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعاون عمل سے وجود میں آئی - انجمن کے ان اصلی بانیوں کے نام بھی درج ہیں - ان میں سے ہر ایک اپنے علم و فضل کے باعث شہرت رکھتا ہے - اس کا پہلا جلسہ ۹ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع منعقد ہوا - اس چار سار کے عرصے میں انجمن

نے بہت ترقی کی ہے اور اب اس کی بنیادیں مضبوط ہوگئی ہیں - حکومت نے بھی اس کی مدد کی اور انفرادی طور پر اس کے لیے چندے جمع کیے گئے جن کی بدولت اس کا کام چلتا رہا —

انجمن اپنے اصلاحی خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے تین ذرائع اختیار کرتی ہے - یہ معمولی اور غیر معمولی جلسے منعقد کرتی ہے ' رسالے شائع کرتی ہے اور اپنے کتب خانہ کے ذریعہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے - معتمد نے انجمن کے جلسوں کا ذکر کرتے ہوے بتایا ہے کہ گزشتہ سال ۱۹ موضوعوں پر مقالے پڑھے گئے - ایک مقالے کا عنوان " حقوق انسانی " تھا - یہ عنوان ہندوستانی سے زیادہ امریکی رنگ کا ہے - اس پر بابو رام چندر نے مقالہ پڑھا - ایک دوسرا مقالہ بابو سلن سنگھ نے " ہندوستان کی گزشتہ اور موجودہ حالت " پر پڑھا - مجھے یہ عنوان نسبتاً زیادہ پسند ہے - ایک اور مقالہ مولوی امام اشرف نے " مسلمانوں میں سائنس کی ترقی " پر پڑھا تھا - میں یہاں اُن دوسرے مقالوں کا ذکر غیر ضروری سمجھتا ہوں جو ہم لوگوں کے لیے باعث دلچسپی نہیں ہیں —

" انجمن تہذیب لکھنؤ " کے ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کے جلسے میں مولوی مسیح الدین خان نے انگلستان کی سیاسی قوت پر ایک مضمون پڑھا - موصوف ایک زمانے میں انگلستان میں نواب اودھ کے سفیر تھے - یہ مضمون نہایت مفید اور دلچسپ تھا اور حاضرین نے بہت پسند کیا - مضمون کے ختم ہونے کے بعد صدر جلسہ نے لائق مقرر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ قدیم زمانے میں ہندوستان کے بادشاہ مطلق العنان ہوا کرتے تھے - چنانچہ جب ہندوستانیوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ انگلستان کی

حکومت نیم شاہی اور نیم جمہوریت ہے اور یہاں کے بادشاہ مروجہ قانون کی خلاف ورزی کے مجاز نہیں ہوتے تو انہیں بڑا تعجب ہوا - انہیں تعجب اس پر تھا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہوں - مولوی مسیح الدین کے اس مضمون سے لوگوں کو انگلستان کے بادشاہ کی دستوری حیثیت کے متعلق علم ہوگا اور انہیں معلوم ہوگا کہ باوجود محدود ہونے کے اس کے اختیارات بہت وسیع ہیں --

انجمن کے جلسوں میں جو تجاویز ملاحظہ ہوئی ہیں اور جن امور پر بحث ہوئی ہے ان کے متعلق معتمد انجمن نے حکومت کی توجہ مبذول کرائی ہے - زیادہ تر یہ امور عام اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تفصیل معتمد کی رپورٹ میں موجود ہے - ہمیں توقع ہے کہ حکومت ان تمام امور پر ہمدردانہ غور کرے گی - ان میں سے چند یہ ہیں - تعلیم عامہ کی سہولتیں ؛ لکھنؤ میں ایک پبلک کتب خانہ کا قیام ' گاؤں میں ڈاکٹروں کا تقرر وغیرہ —

اس کے بعد معتمد نے اپنی رپورٹ میں ان اخبارات کی فہرست درج کی ہے جو انجمن میں آتے ہیں - ان میں ۳۴ ہندوستانی ہیں - بعض روزانہ ' بعض ہفتہ وار اور بعض ماہوار - دس انگریزی کے اخبار آتے ہیں جن میں "دی ہندو پٹریٹ ' (The Hindu Patriot) ' "دی وِنڈ آف انڈیا ' (The Wind of India) اور " دی پایس گزٹ " (The Pious Gazette) شامل ہیں - اس کے علاوہ انجمن میں پنجاب ' بریلی ' میرٹھ اور سیتاپور کی علمی اور ادبی انجمنوں کی مطبوعات آتی ہیں - انجمن کو توقع ہے کہ عنقریب ان سب انجمنوں کی مطبوعات جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں حال میں قایم ہوئی ہیں ' اس

کے ہاں آنے لگیں گی —

جو اخبار اور رسالے انجمن میں آتے ہیں وہ پہلے انجمن کے دفتر میں کچھہ روز رکھے جاتے ہیں پھر اس کے بعد مختلف ارکان کو بھیجدیے جاتے ہیں - ہر اخبار کو کم از کم بارہ اشخاص ضرور پڑھتے ہیں· رپورٹ لکھنے کے وقت کتب خانہ میں کئی ہزار کتابیں موجود تھیں جن میں سے تقریباً سو خریدی ہوئی تھیں اور باقی انجمن کو تحفتاً دی گئی تھیں توقع کی جاتی ہے کہ عنقریب کتب خانے کی کتابوں میں اضافہ ہوگا لوگ کچھہ تحفتاً کتابیں دیں گے اور اس کے ساتھہ انجمن اپنے ارکان کے چندوں سے اس قابل ہوسکے گی کہ خود بھی کچھہ کتابیں خریدے —

بعض لوگ اعتراضاً کہتے ہیں کہ بھلا انجمن قایم کرنے سے کیا فائدہ ہوا - انجمن کے معتمد نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انجمن کی مساعی اور اس کے نتائج کا حال سالانہ رپورٹ سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے - اور نتائج تو دراصل آئندہ برآمد ہونے کی توقع ہے جن کی تیاری انجمن کی موجودہ کارروائیوں کے ذریعہ عمل میں آرہی ہے —

انجمن نہایت احتیاط اور دانشمندی سے اپنا کام کررہی ہے - اگر انجمن کسی معاملے میں انتہا پسندی اختیار کرے گی تو یہ اس کی بڑی غلطی ہوگی - پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ انجمن اپنے ارکان کی شخصی زندگی کو بہتر بنانے کی طرف توجہ کرے پیشتر اس کے کہ حکومت کی اصلاح کا بیڑا اٹھا یا جائے - اس باب میں انجمن اپنے حدود میں رہکر جو کچھہ کرسکتی ہے وہ کررہی ہے اور حکومت اس کے جوش عمل اور خلوص کی پوری طرح قدر کرتی ہے —

بہرنوع ایک ایسی انجمن کا وجود بجائے خود جہاں تھوڑا سا چندہ

دیکر پڑھے لکھے لوگ ' جو علم و ترقی کو عزیز رکھتے ہیں ' آپس میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں ' جلسے منعقد کرسکتے ہیں ' اخبارات سے دنیا کا حال معلوم کرسکتے ہیں - اور کتابوں کے مطالعہ سے اپنے علم میں اضافہ کرسکتے ہیں - یہ انجمن صرف اودھ کے صدر مقام کے لیے ہی باعث برکت نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کے لیے عزت کا موجب ہے - لکھنؤ کی " انجمن تہذیب " کی دیکھا دیکھی سیتا پور اور کانپور میں بھی اسی نوعیت کی انجمنیں قایم ہوگئی ہیں —

اودھ کے ناظم تعلیمات مسٹر کوان براؤننگ نے جو سالانہ رپورٹ مجھے بھیجی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جبل پور میں تین ادبی اور علمی انجمنیں کام کررہی ہیں - ادبی انجمن جس میں مباحثے بھی ہوا کرتے ہیں سنہ ۱۸۶۸ ع میں قایم کی گئی تھی - ایک طبی انجمن ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ طبی معلومات کو پھیلایا جائے - اس انجمن میں دیسی ڈاکٹر شریک ہیں - ایک انجمن اشاعت علوم کے لیے ہے جس کے صدر مولوی صفدر علی ہیں جو ایک صاحب شہرت شخص ہیں اور مہتمم تعلیمات ہیں - اس انجمن کے جلسوں میں جو مضامین پڑھے گئے ان کی روداد پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں انجمن کے بعض ارکان نے اردو یا ہندی کی نظمیں پڑھیں —

رائے پور میں بھی ایک انجمن ہے جس کا مقصد مفید معلومات کی نشرواشاعت ہے - صرف اودھ میں لکھنؤ کی " انجمن جلسۂ تہذیب " کے ماسوا تین اور انجمنیں ہیں - ایک گونڈہ میں ' ایک فیض آباد میں اور ایک پرتاب گڑھ میں - گونڈہ والی انجمن کا نام " انجمن رفاہ " ہے - علیگڑھ میں ایک " انجمن اخلاق " قایم کی گئی ہے - اس کے ایک

جلسے میں اس کے معتمد درگا پرشاد نے انجمن کے مقاصد پر بہت دلچسپ مقالہ پڑھا - یہ مقالہ "علیگڑھ اخبار" کی ۳۰ جون سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں شائع ہوا ہے - شاہجہان پور میں ایک "انجمن اصلاح" ہے جس میں معاشرتی اصلاح کے متعلق تدابیر سوچی جاتی ہیں - کلکتہ کے قریب بارہ نگر میں ایک "انجمن اصلاح معاشرت" قایم کی گئی ہے جس کی بانی مس کارپنٹر ہیں جو بہت قلیل عرصے کلکتہ میں رہیں اور جن کی مساعی جمیلہ کی نسبت "انڈین اسوسی ایشن" کی اشاعتوں میں آپ کو تفصیلی ذکر ملے گا - 'بے ہولا' کی انجمن کا نام "Improvement Society" (انجمن اصلاح و ترقی) ہے - اعظم گڈھ میں مولوی قربان علی مہتمم مدارس ضلع نے ایک مجلس مباحثہ قایم کی ہے تاکہ عام طور پر لوگ اس میں شرکت کرسکیں - اس میں ادبی اور علمی جلسے منعقد ہوتے ہیں اور اس انجمن کی علحدہ علحدہ خاص کمیٹیاں ہیں - مولوی قربان علی نے جبلپور میں اس سے قبل ایک انجمن کی بنا ڈالی تھی جس کا مقصد معاشرتی اصلاح تھا - یہ انجمن بہت مفید ثابت ہوئی - ہمیں توقع ہے کہ نئی انجمن بھی ترقی کرے گی اس لیے کہ اس کے ارکان میں خلوص اور جوش موجود ہے - انجمن کی ابتدا سے شہر کے ذی وجاہت اور علم دوست حضرات جنہیں علوم و فنون سے کچھ لگاؤ ہے، اس میں شرکت کررہے ہیں - راجہ محمد سلامت خان اس کے صدر اور مولوی قربان علی جو اس کے بانی بھی ہیں، معتمد مقرر ہوئے ہیں - انجمن کے پہلے جلسے میں جلسوں کے انعقاد کے متعلق قواعد و ضوابط منظور کئے گئے - پھر اس پر غور کیا گیا کہ جلسوں میں کس قسم کے موضوعوں پر بحث و مباحثہ ہوا کرے -

طے یہ ہوا کہ پہلے تعلیم نسواں کے مسئلہ پر بحث ہونی چاہیے * —

نینی تال کی انجمن اپنی ادبی اور اخلاقی خدمات میں مشغول ہے - گزشتہ اگست کے ایک جلسے میں ایک مسلمان فاضل نے عقد بیوگاں پر ایک مقالہ پڑھا اور اس ضمن میں اسلام میں مردوں اور عورتوں کی مساوات کا بھی ذکر کیا - لیکن مقالہ نگار نے عربی فارسی کے ایسے مغلق الفاظ اپنے مضمون میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر استعمال کیے تھے کہ جلسے کے صدر پنڈت گنگادت نے مقالہ نگار کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کرائی کہ آئندہ وہ عام فہم اور سادہ زبان لکھنے کی کوشش کریں - سر ولیم میور بھی اس جلسے میں شریک تھے - انہوں نے جلسے کے آخر میں انجمن کو مبارک باد دی اور توقع ظاہر کی کہ وہ آئندہ مزید خدمات کرسکے گی - موصوف نے دوران تقریر میں یہ بھی کہا کہ مقالہ نگار نے جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے وہ صرف نظریہ کی حد تک نہیں رہنی چاہییں بلکہ ان پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے - صدر کی طرح انہوں نے بھی توقع ظاہر کی کہ مقالوں میں ایسی آسان زبان استعمال کرنی چاہیے جو ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آسکے نہ کہ ایسی مشکل زبان جو صرف چند عالم لوگ سمجھ سکیں —

بہار کی ادبی اور علمی انجمن اس غرض کے لیے مظفر پور میں قائم کی گئی ہے کہ اہل ہند میں مغربی تعلیم کی نشر و اشاعت کرے - اس انجمن نے مجھے اپنا اعزازی رکن منتخب کرکے میری عزت افزائی کی ہے - یہ تعلیم مروجہ زبان میں ' جو اس علاقے میں سمجھی جاتی ہے ' دی جاے گی اور ہندوستان کی قدیم زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جاے گا - اس انجمن کے ارکان کی تعداد تین سو تک پہنچ چکی ہے -

* علیگڑھ اخبار ' مورخہ ۱۶ جون سنہ ۱۸۷۱ م -

اس وقت اس کے پاس دس ہزار روپیے کا سرمایہ موجود ہے جو چندوں اور عطیات سے ملا ہے - انجمن کی طرف سے ایک فاضل شخص کو تین سو روپیے ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے جس کے ذمے یہ کام ہے کہ وہ انگریزی زبان سے ہندوستانی میں ایسی کتابوں کا ترجمہ کرے جو طلبہ کے کام کی ہوں - اس انجمن کی پانچ شاخیں ہیں - ایک شاخ مظفر پور میں ہے جس کا نام " انجمن تہذیب ہے - یہ انجمن بہت اچھا کام کر رہی ہے - اس کی طرف سے ایک کالج قایم ہے جس میں سو کے قریب طلبہ تعلیم پاتے ہیں - اس کالج میں ذریعۂ تعلیم ہندوستانی ہے - عربی فارسی اور یورپین سائنس کے مبادیات کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے - اس کا بھی اہتمام ہے کہ روز مرہ کی زبان میں مختلف مضامین طلبہ کو پڑھائے جائیں - اس انجمن کا تیسرا سالانہ جلسہ گزشتہ سال ۲۴ مئی کو منعقد ہوا تھا جس سے اس کو زندگی کے چوتھے سال کا آغاز ہوتا ہے - اس جلسے کی وہی تاریخ رکھی گئی جو ملکہ وکٹوریہ کی پیدائش کی تاریخ ہے جب کہ تمام انگریزی علاقوں میں جشن منایا جاتا ہے - اس جلسے میں دو سو سے زائد اشخاص نے شرکت کی - ان میں ریورنڈ جے لانگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - موصوف اہل ہند کے سچے اور پکے دوست ہیں اور پورٹ رویال (Port Royal) کے درویشوں کے بڑے مداحوں میں سے ہیں - * اس موقع پر ہندوستانی زبان میں متعدد تقاریر ہوئیں - انجمن کے معتمد مولوی سید امداد علی نے انجمن کی کارگذاری پر تبصرہ کیا اور بتایا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ علم و ادب کی خدمت کرے اور

* پورت رویال فرانسیسی درویشوں کی مشہور خانقاہ تھی جہاں بعض اہل علم نے ترک دنیا کر کے سکونت اختیار کرلی تھی - پاسکال اور آرنو وغیرہ کی تصانیف یہیں لکھی گئیں - سیاسی وجوہ کی بنا پر سنہ ۱۷۰۵ع میں لوئی چہاردھم کے حکم سے اس خانقاہ کو بند کردیا گیا - (مترجم) —

اس کا اصول اب تک یہ رہا ہے کہ اپنے یہاں کی تقاریر اور تحریروں میں حتی المقدور مذہبی مسائل کو نہ چھیڑا جاے - یہی اصول انجمن کے اخبار "اخبارالاخبار" کی اشاعت میں بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے -

مغل سرائے کی ادبی انجمن معاشرتی مسائل کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں ہے - عقد بیوگان، تعدد ازدواج، اور لڑکوں اور لڑکیوں کی فروخت وغیرہ کے متعلق وہ لوگوں میں صحیح خیالات کی نشر و اشاعت کر رہی ہے - اس انجمن کے ایک جلسے میں بابو دینا ناتھ نے، جن کے متعلق میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، اشاعت تعلیم کے متعلق ایک عالمانہ تقریر کی - "علیگڑھ اخبار" مورخہ ۱۰ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس تقریر کے اقتباسات دس کالموں میں درج ہیں - بابو صاحب نے اپنے اہل وطن کو مبارک باد دی کہ ان کی بعض تقاریر اور مقالے ایسے تھے جو اہل یورپ کے معیار سے بھی بڑھے ہوئے تھے - یہ بات باعث فخر ہے کہ ان کے درمیان اعلیٰ درجے کے خطیب اور بلند پایہ اخبارات کے مدیر موجود ہیں - لیکن ان کی تعداد بہت محدود ہے - یہ ستارے مغرب کے سورج سے اپنی روشنی حاصل کرتے ہیں - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی لوگ نہایت ذہین ہوتے ہیں لیکن ابھی انہیں اہل یورپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے جن کی برتری مسلّم ہے - اہل ہند کو چاہیے کہ وہ صرف یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کرنے کے متمنی نہ ہوں بلکہ انہیں دنیا کے تمام مسائل سے دلچسپی رکھنی چاہیے اور اپنے اخلاق کو بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے - اس ضمن میں مبلغین مسیحیت کی بابو صاحب نے تعریف کی کہ وہ اہل ہند کو تعلیم دے رہے ہیں اگرچہ ان کے مذہبی عقائد کے خلاف اظہار ناپسندیدگی کیا - وہ طلبا جو ان مسیحی مدارس میں تعلیم پاتے

ہیں ان سے مختلف ہوتے ہیں جو سرکاری مدارس میں پڑھتے ہیں۔ آخرالذکر اکثر ہندو مذہب سے بیزار ہوجاتے ہیں اور تشکیک اور عقلیت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ بابو صاحب نے یورپ کے بعض صاحب فکر لوگوں کی طرح طریق امتحانات کی خرابیاں واضح کیں۔ ان امتحانات میں صرف حافظے کی جانچ کی جاتی ہے نہ کہ ذہانت کی۔ طلبا کو جو انعامات دیے جاتے ہیں ان میں ایسے انعام بھی ہونے چاہییں جو اچھے اخلاق و عادات کے لیے دیے جائیں۔ بابو صاحب نے ان ہندوستانیوں کی برائی کی جو انگریزی زبان سیکھنے کے بعد صرف قصے اور ناول پڑھا کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابو صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اہل ہند کو چاہیے کہ ہر ضلع اور ہر شہر میں انجمنہائے اصلاح قایم کریں جہاں اخلاقی موضوعوں پر مقالے پڑھے جائیں اور بحث مباحثہ ہو۔ اہل ہند کی بے سوچے سمجھے انگریزوں کی اندھی تقلید کو برا بتایا گیا۔ صرف اس بنا پر انگریزوں کی تقلید نہیں کرنی چاہیے کہ وہ حاکم قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اہل ہند کی روایات سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً شراب اور گوشت کا استعمال ہندوؤں کے مذہب کے بالکل خلاف ہے جو انگریزوں میں پایا جاتا ہے۔ دراصل کوشش اس کی ہونی چاہیے کہ انگریزوں کی اچھی صفات کی تقلید کی جاے جن کے باعث انھیں فوقیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ تعلیم پر کتب شائع کی جائیں اور بڑے بڑے لوگوں کے سوانح لکھے جائیں تاکہ ان کی سیرت کی اعلیٰ خد و خال ظاہر ہوں اور زندگی کے مختلف حالات میں دوسروں کے لیے باعث رہبری ہوں —

اسی جلسے میں بابو امبکاچرن چترجی نے ایک مقالہ پڑھا جس کی

سب حاضرین نے بہت تعریف کی - اس مقالے میں یہ بات ظاہر کی گئی کہ ہندو لوگ بہت مغرور ہیں اور یہی عیب ان کے سماج کی معاشرتی خرابیوں کا اصلی سبب ہے * —

علی گڑھ اخبار، مورخہ ۲۲ جون سنہ ۱۸۷۱ ع میں اخبار پانیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا پور کے رئیسوں کا ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ اس شہر میں ایک انجمن قایم کرنی چاہیے جس میں سیاسی اور علمی مسئل پر بحث مباحثے ہوا کریں - مہنت جے رام گرو نے جلسے کا افتتاح کیا اور پنڈت رادھا کرشن نے اپنی تقریر میں جلسے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ انجمن کے قایم ہونے سے اہل شہر کو بہت فائدہ ہوگا - یہ انجمن اسی نوعیت کی ہوگی جیسی بنارس، علی گڑھ، شاہجہاں پور اور مراد آباد میں انجمنیں قایم ہوئی ہیں - جب پنڈت تقریر ختم کر چکے تو بعض حاضرین نے اس تجویز کی موافقت کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ انجمن کا نام "مرزا پور سوسائٹی" رکھا جاے گا - پندرہ روز بعد انجمن کا پھر جلسہ منعقد ہوگا جس میں قواعد و ضوابط بنانے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جاے گی † —

لندن کی "انجمن فلون" کے گزشتہ مارچ کے جلسے میں مسٹر ہائڈ کلارک نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک "مشرقی کانگریس" قایم کرنی چاہیے جو خاص طور پر ہندوستان کے مسائل سے دلچسپی رکھے اور جس کے جلسے باری باری سے انگلستان کے مختلف بڑے صنعتی شہروں میں منعقد ہوا کریں - اس کے جلسوں میں ایسے موضوعوں پر تقریروں اور

---

* علی گڑھ اخبار، مورخہ ۱۰ و ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

† علی گڑھ اخبار، مورخہ ۷ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع —

مقالوں کا انتظام ہوگا جن سے ہندوستان کے مادی وسائل کے متعلق معلومات میں اضافہ ہو اور اس ملک کی سیاسی اور معاشرتی حالت سدھارنے کی تدابیر پیش کی جائیں - علم طبقات الارض، زراعت، علم حیوانات اور لسانیات کے متعلق خاص طور پر مقالے لکھے جائیں گے - مسٹر برنارڈ کوائتھ نے جو ایک مستشرق ہیں اس تجویز کی پر زور تائید کی اور کہا کہ اگر اس پر عمل کیا گیا تو ہندوستان کی مختلف زبانوں کی تحقیقات کو ترقی ہوگی - موصوف نے نہایت تفصیل سے ان زبانوں اور خاص کر ہندوستانی سیکھنے کے فوائد بیان کیے - بعض اور دوسرے مقررین نے نہایت مفید باتیں کہیں اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ مجوزہ "مشرقی کانگریس" کو جلد از جلد قایم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے —

بعض مشہور ہندو شادی کے متعلق اُن رسوم کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جن کے سبب سے اُن کے ہم مذہب لوگوں کو فضول خرچی کی عادت پڑتی ہے - ان کی مخالفت سے اب یہ رسوم کم ہو رہی ہیں - ضلع جونپور میں ایک جلسہ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع کو زیر صدارت سر ولیم میور منعقد ہوا تھا جس میں صدر نے ہندوستانی زبان میں تقریر کی اور شادی کے موقع پر فضول خرچی کی بری رسم کی خرابیاں بیان کیں - صدر کی تقریر کے بعد اسی مضمون کی چند اور تقریریں ہوئیں - ہمیں پوری توقع ہے کہ ان تقریروں کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلے گا اور اس انجمن کے ارکان جن خراب رسوم کو مٹانا چاہتے ہیں وہ بہت جلد ہندو سماج میں باقی نہیں رہیں گی —

کلکتہ میں ایک "زنانہ سوسائٹی" قایم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ طبقۂ نسواں میں ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے -

اس انجمن کا ایک جلسہ ۹ جون کو منعقد ہوا تھا - اس میں ان خواتین نے جو اس انجمن کی ارکان ہیں اُن طریقوں پر غور کیا جن پر عمل کرنے سے اُن عورتوں کو تعلیم کے فوائد سے بہرہ ور کیا جاسکے جو پردہ نشین ہیں * —

ان مختلف انجمنوں میں جن کی نسبت میں نے ذکر کیا ہے ' یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں لیکن وہ خاصے پیش پیش نظر آتے ہیں اور اکثر اوقات اس قسم کے جلسوں میں ان کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے زیادہ ہوتی ہے - اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ خواہش موجود ہے کہ وہ انجمنوں سے پورا فائدہ اٹھائیں اور جدید تہذیب و تمدن میں ترقی کریں —

اس کی ضرورت ہے کہ اہل ہند کی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے ہر طرح ہمت افزائی کی جائے - یورپین لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی ہر طرح امداد کریں - اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنہ ۱۸۷۰ ع میں 'برسٹل' میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام " ہندوستان کی معاشرتی ترقی کی قومی انجمن " ہے - یہ وہی مقام ہے جہاں ہماری صدی کے سب سے بڑے ہندو مصلح راجہ رام موہن رائے نے انتقال کیا - اس انجمن کا قیام راجہ موہن رائے کے جانشین بابو کیشب چندرسین کے دوران قیام میں عمل میں آیا - اس انجمن کا ایک ماہوار رسالہ یکم جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع سے شائع ہونا شروع ہوا ہے - اس انجمن کی بانی اور روح و رواں مس کارپنٹر نے ازراہ کرم اس رسالے کا ایک نسخہ مسز مگلفن کے توسط سے مجھے بھیجا ہے - اس رسالے میں اس امر کی وضاحت کی

* اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۲۳ جون سنہ ۱۸۷۱ ع —

گئی ہے کہ یہ انجمن کن ذرائع سے اہل ہند کی معاشرتی بہتری کرنا چاہتی ہے - چنانچہ اس ضمن میں تین ذرائع پیش کئے گئے ہیں - (۱) اہل ہند میں تعلیم کا رواج بڑھانا اور ان کی اخلاقی زندگی کو سدھارنا - (۲) ہندوستان کے متعلق صحیح حالات انگریزوں کو بتانا اور اس ملک میں ان کی دلچسپی پیدا کرانے کی تدابیر کرنا - (۳) اُن ہندوستانی لوگوں سے تعاون عمل کرنا جو اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں - اس رسالے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کچھ نہ کچھ کام کیے جارہی ہے - انجمن نے بمبئی اور کراچی کے مدارس کے لیے ہر قسم کی مفید اشیا بھیجی ہیں تاکہ یورپین چیزوں کے متعلق طلبا کی واقفیت میں اضافہ ہو - ان میں جغرافیہ کے نقشے اور مختلف قسم کی تصاویر شامل ہیں - اس انجمن نے اہل ہند کی اب تک جو خدمت کی ہے اور جو آئندہ اس سے توقعات وابستہ ہیں ان کا اظہار ہندوستان کے مشہور وکیل مسٹر آئی ٹی پریچرڈ نے اپنی گزشتہ ۱۴ اپریل والی تقریر میں بخوبی کیا تھا - یہ تقریر ایک بہت بڑے جلسے کے روبرو کی گئی - ان کے علاوہ چار مسلمان اور ایک ہندو مقرر نے اپنی تقریروں میں انجمن کی خدمات نہایت تفصیل سے بیان کیں —

اس انجمن کے علاوہ لندن اور ویلز اور شمالی انگلستان کے مختلف شہروں میں اسی قسم کی انجمنیں قایم ہوئی ہیں جن کا مقصد اہل ہند میں تعلیم کو فروغ دینا خاص کر تعلیم نسواں کو بڑھانے کی تدابیر کرنا ہے - اگر اس مقصد میں کامیابی ہوئی تو اہل ہند کی آئندہ نسلیں روشن خیال ہو جائینگی اور بہت سی رسوم قبیحہ اور توہمات کا خاتمہ ہوجائیگا - بعض انجمنیں اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ اہل ہند کے لیے ہر قسم کی سہولتیں

بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر کریں - اہل ہند کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ اُنھیں اس کا موقع حاصل ہو کہ وہ ہمارے بڑے بڑے تمدنی مرکزوں کی زندگی کا مشاہدہ کریں * - لندن کی انجمن نے اس کا انتظام کیا ہے کہ جو ہندوستانی لوگ اپنے بچوں کو انگلستان تعلیم کی غرض سے بھیجیں انھیں ہر طرح کی سہولتیں میسر آئیں اور ان کی نگرانی کا اہتمام کیا جائے - اس انجمن کا یہ اصول ہے کہ مذہبی معاملات میں بالکل غیر جنبہ دار رہے گی - انجمن نے جان بوجھکر اس اصول کو اپنا رہنما بنایا ہے اسواسطے کہ اس سے بہت سے جھگڑوں بکھیڑوں سے نجات مل جائیگی اور دنیاوی معاملات میں مذہب کو نہیں داخل کیا جائیگا - انگلستان کی سب انجمنوں کو اس اصول پر عمل کرنا ضروری ہے —

گزشتہ جولائی کے مہینے میں لندن میں ہندوستان کے متعلق دو تقاریر ہوئیں جن میں پروفیسر گولڈاسٹکر کی قایم کی ہوئی مثال پر عمل کیا گیا - ایک تقریر ایس ان بنرجی نے کی جس کا موضوع بنگال کے ہندو سماج کی خرابیوں کے متعلق تھا - دوسری تقریر سر بارٹل فریر نے کی جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی رائے عامہ کی کسطرح تنظیم کی جائے پیشتر اس کے کہ اس کی نمائندگی باقاعدہ طور پر پارلیمنٹ میں کی

---

* اہل ہند کو یورپ کے سفر میں سہولتیں بہم پہنچانے کے متعلق بابو گردھاری لال نے جو نظام حیدرآباد (دکن) کے ایک عہدہ دار ہیں ایک تجویز پیش کی ہے جو علیگڑھ اخبار مورخہ ۹ جون سنہ ۱۸۷۱ ع میں تفصیل سے شائع ہوئی ہے - موصوف کا خیال ہے کہ ایک جہاز خاص طور پر ان سہولتوں کا انتظام کرے جو اہل ہند چاہتے ہیں ۔ اس جہاز پر کھانے وغیرہ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو بھی اس پر سفر کرنے میں مطلق تامل نہ ہو اور انہیں اپنی ذات کھونے کا اندیشہ نہ رہے —

جائے جیسا کہ اہل ہند کے ہوا خواہوں کی خواہش ہے - اس مسئلے کے متعلق بہت بحث ہوئی - سید محمد محمود نے جو (سر) سید احمد خان کے قابل اور ہونہار فرزند ہیں اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں ' اس مسئلے کے متعلق نہایت بصیرت افروز تقریر کی - یہ تقریر انگریزی اور ہندوستانی اخباروں میں شائع ہو چکی ہے - علیگڑھ اخبار مورخہ ۸ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع میں پوری تقریر چھپی ہے - سید محمد محمود نے دوران تقریر میں کہا کہ ہندستانیوں کی رائے عامہ کو دیسی اخباروں کی رائے سے نہیں جانچنا چاہیے اس واسطے کہ دیسی اخبار حکومت کے خلاف چوں نہیں کرسکتے - یہ اخبار حکومت پر تنقیدیں اس لیے نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے آپ کو حکومت کی مطلق العنانی کے سامنے بالکل بے بس تصور کرتے ہیں - یہ بھی واقعہ ہے کہ حکومت پر تنقید کرنا ایک دشوار کام ہے - چونکہ اہل ہند ابھی یورپین تہذیب و تمدن سے اسقدر بے بہرہ ہیں کہ وہ حکومت کے مسائل اور اس کے کاموں کے متعلق صحیح رائے قایم کرسکیں - لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خود حکومت کے لیے یہ بات ناگزیر اور اہم ہے کہ وہ اہل ہند کی رائے عامہ کو معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگائے کہ عام طور پر اہل ہند حکومت کے کاموں کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں - دراصل اگر انگریز عہدہ داروں کو اس کا علم ہوتا کہ اہل ہند کے خیالات اور احساسات کیا ہیں تو سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کا پہلے سے سد باب کیا جاسکتا اور لوگوں کو بہت سی مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا - اسی طرح اگر اہل ہند کو حکومت کے متعلق صحیح واقفیت ہوتی جو ان کے وابستہ کی مختار ہے تو وہ یقیناً بغاوت نہ کرتے - سید محمد محمود

کا خیال ہے کہ اس وقت ہندوستان کی رائے عامہ روس کے ہندوستان پر حملہ کی متوقع ہے اور اس کی خواہش ہے کہ یہ حملہ ہو اس واسطے کہ یہ ان مظالم کا انتقام ہو گا جو سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے بعد بپا کئے گئے - اگر روس کا حملہ ہوا تو یقیناً اہل ہند حملہ آور کا ساتھ دیں گے تاکہ ایک آقا کی تابعداری چھوڑ کر دوسرے کے آگے اپنا سر جھکائیں - اس کی سخت ضرورت ہے کہ ان امور کے متعلق اہل ہند کو صحیح واقعات بتائے جائیں اور ان کی توقعات کو غلط ثابت کیا جائے - بد قسمتی سے حکومت اس کے شور و شغب سے لاعلم ہے یا دیدہ و دانستہ اس کی کچھ پروا نہیں کرتی —

ہندوستان کی رائے عامہ کے خیال میں حکومت ہند کے محکمۂ مال کے انتظامات ناقابل اطمینان ہیں - اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہندوستانی لوگوں کو محکمۂ مالیات میں کام کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا —

سید محمد محمود کے کہنے کے مطابق ہندوستانیوں کی رائے عامہ کو معلوم کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہوگی کہ ضلع واری مجالس قایم کی جائیں جن میں ان سب لوگوں کو حق رائے دہندگی حاصل ہونا چاہیے جو کچھ تھوڑی بہت ملکیت رکھتے ہیں - ان مجالس کے ذریعہ جن کے ارکان تعلیم یافتہ ہوں گے حکومت رائے عامہ کا یقین کر سکے گی - یہ ضروری نہیں کہ ان لوگوں کی تعلیم انگریزی زبان کے توسط سے ہوئی ہو - ہندوستانی یا صوبوں کی دوسری زبانوں کے ذریعہ سے بھی یہ تعلیم یافتہ بن سکتے ہیں —

ہندوستان کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی جو انجمنیں انگلستان میں

قایم ہورہی ہیں اسی طرح کی انجمنیں ممالک متحدہ امریکہ میں بھی قایم کی جارہی ہیں - چنانچہ ایک انجمن 'بوسٹن' میں قایم ہوئی ہے جس میں نہایت عمدہ تقاریر کا انتظام کیا گیا ہے - اس انجمن میں ان ہندوستانیوں کی تقریریں بھی ہوتی ہیں جنھوں نے برہمو سماج کے اصلاحی خیالات قبول کرلیے ہیں —

بوسٹل کی "انڈین ایسوسی ایشن" میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے متعلق خاص طور پر بحث مباحثے ہوتے ہیں - اس انجمن کے ماہواری رسالے کی اپریل کی اشاعت میں بنگال کے مشہور مصلح کیشب چندر سین کی اس تقریر کے اقتباسات درج کیے گئے ہیں - جو انہوں نے کلکتہ میں گزشتہ فروری میں کی تھی - مقرر نے دوران تقریر میں کہا کہ بنگال میں عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم خود منو شاستر کی رو سے ناجائز ہے - بنگال میں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں یہ رسم مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں میں بھی رائج ہوگئی - منوشاستر کے بموجب ہندو عورتوں کو اس کی اجازت ہے کہ وہ مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جائیں اور ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں - بابو صاحب نے کہا کہ اس کے لیے تو کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ ہندوستانی عورتیں پردے میں رہکر تعلیم حاصل کریں - ان کی تعلیم اُن استادنیوں کے سپرد ہوسکتی ہے جنھوں نے نسوانی نارمل اسکولوں میں تعلیم پائی ہے - اس طرح ممکن ہوگا کہ ہندوستانی عورتیں انگریز عورتوں کی طرح اخلاقی اور ادبی ترقی کرسکیں گی اور یورپ کی اعلیٰ اور متوسط سوسائٹی کی عورتوں کے ہم پلہ ہوسکیں گی - عورتوں کی ترقی ہی کے باعث آج انگلستان کو یورپین اقوام میں

اس قدر بلند مرتبہ حاصل ہے - اسی اخبار کی مئی کی اشاعت میں اسی قسم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جو ایک دکنی برہمن کا لکھا ہوا ہے جو آج کل انگلستان میں قانون کی تعلیم پا رہا ہے - اُس نے بھی کرشب چندرسین کی طرح عورتوں کی تعلیمی اصلاح اور برہمو سماج کی اصلاحی تحریک کی تائید کی ہے - اپنے مضمون میں اس نے بتایا ہے کہ انگریزی تعلیم کے ذریعہ سے جو ایک زبردست پانی کے دھارے کے مثل ہے ہندو سماج کی تمام غلاظتیں صاف ہوجائیں گی - یہ جذبات قابل تعریف ہیں اور خود اہل یورپ اس سے بہتر طور پر ان معاملات کو نہیں پیش کرسکتے —

گلاسگو میں اس انجمن کی ایک شاخ موجود ہے جہاں ہندوستان کے مشہور فاضل گوپال چندر راے نے ان اصلاحات کے متعلق متعدد تقاریر کیں جن کی اشاعت مقصود ہے - موصوف نے دعا کے متعلق چند جملے کہے جو یہاں نقل کیے جاتے ہیں :- "اگرچہ یہ سچ ہے کہ مادی عالم میں فطرت کے قابل تغیر قانون نافذ ہیں - لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کی زندگی میں روحانی قوانین کی بھی کارفرمائی ہے - روحانی عالم کا انحصار بالا تر قوت پر ہے جسے خدا کہتے ہیں - بغیر توفیق الہی کے انسان اپنی بہتری کی تدابیر بھی نہیں کرسکتا - انسان کو جو کچھ طاقت اور اختیار ملتا ہے وہ خدا سے مانگنے سے ملتا ہے - دن کے بعد رات نہایت پابندی سے آتی ہے - اس کے لیے ہمیں اس کے طالب کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن روحانی عالم میں مظاہر کی یکسانیت نہیں ملتی اس لئے کہ وہ مادی قوانین سے بالا تر ہے - توفیق انسان کے شامل حال اسی حد تک ہوتی ہے جس حد تک اس

کی طلب صادق ہوتی ہے - یہ چیز انسان کو دعا ہی سے مل سکتی ہے ۔ ہم چاروں طرف دنیاوی خواہشات کے ناپاک اور پر فریب جال میں پھنسے ہوے ہیں - اس سے ہم اسی وقت بچ سکتے ہیں جب خدا کی مدد شامل ہو - مکروہات دنیوی سے محفوظ رہنے کے لیے ہم قوت کہاں سے حاصل کرسکتے ہیں ؟ کیا ہم بدی کا مقابلہ خود اپنی قوت سے کرسکتے ہیں ؟ یہ صحیح ہے کہ صرف تعلیم ہی کے ذریعہ سے ہم اپنے جذبات پر قابو پاسکتے ہیں لیکن کیا اس کا بھی امکان ہے کہ مذہبی اصول اور سائنٹفک علوم کے درمیان مطابقت پیدا کردی جائے ؟ ہمیں ضرورت اس کی ہے کہ مذہبی تعلیم کا علحدہ انتظام کیا جاے جس کے ذریعہ ہم خدا کی طرف مائل ہوسکیں اور تمام مخلوقات کے پیدا کرنے والے کے سامنے اپنی نیازمندی کا اظہار کرسکیں - بغیر توفیق الہی کے اس کا امکان نہیں نظر آتا کہ ہم ان آندھیوں میں اپنے توازن کو قایم رکھہ سکیں جو ہمارے چاروں طرف چل رہی ہیں - اسی وجہ سے ہماری روحانی بہتری کے لیے دعا ضروری چیز ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہم دنیاوی مکروہات کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اپنے خالق کے آگے اپنی عبودیت اور شکر کا اظہار کرسکتے ہیں " —

" ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن " کے معتمد دادا بھائی نوروجی گذشتہ جون کے مہینے میں ہندوستان واپس گئے ہیں - موصوف نے بمبئی ' احمدآباد ' کاٹھیاواڑ اور کچھ کا دورہ کیا تاکہ وہاں کے امراء کو اس انجمن کی رکنیت میں شامل کریں - موصوف انجمن کے کام کو فروغ دینے کے لیے نہایت گرمجوشی کا ثبوت دے رہے ہیں * - اس انجمن کی

* علی گڑھ اخبار - مورخہ ۷ جولائی سنہ ۱۸۷۱ م -

ہندوستان میں متعدد شاخیں ہیں اور بہت سے لوگوں نے اس میں شرکت کی ہے - مشہور لوگوں میں جو انجمن کے رکن بنے ہیں نواب صاحب جونا گڑھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں - نواب صاحب نے سالانہ ایک ہزار روپیے چندہ کے علاوہ ۱۵ ہزار روپیے کی رقم بطور عطیہ دی ہے —

بابو کیشب چندر سین کے انگریز احباب اس خیال سے کہ بابو صاحب کلکتہ کے اپنے مندر میں عبادت کے وقت موسیقی کی وہ لے استعمال کرنا چاہتے ہیں جو کلیسا کی بعض دعاؤں میں استعمال کی جاتی ہے ' انہیں ایک ارگن باجا بھیج رہے ہیں - برہمو سماج کی بیالیسویں سالگرہ پر جو جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع میں ہونے والی ہے ' یہ پہلی مرتبہ بجایا جائے گا - برہمو سماج کے جلسوں میں جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں وہ ان دعاؤں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں جو انقلاب فرانس کے وقت لکھی گئی تھیں جن میں خدا کا تخیل بغیر مذہبی عقائد کے پیش کیا گیا تھا برہمو سماج کی دعائیں مختلف مذہبوں سے ماخوذ ہیں - ان میں ہندوؤں ' مسلمانوں اور پارسیوں کے مذہبی خیالات کے اجزا ملتے ہیں —

۲۸ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع برہمو سماج کے پیروؤں نے اپنی مذہبی جماعت کے قایم ہونے کی کلکتہ میں ۴۱ ویں سالگرہ منائی - اس روز اس جماعت کے ہزاروں ارکان نے کلکتہ کی سڑکوں پر ہاتھوں میں جھنڈے لیے جلوس نکالے - جلوس کے وقت وہ اپنی دعائیں پڑھتے جاتے تھے - دوسرے روز وہ سب اپنے مندر میں جمع ہوئے اور ان کے امام نے ان کے روبرو تقریر کی - تقریر اور دعاؤں کے بعد ' بقول اخبار " انڈین مرر " (Indian Mirror) جو غالباً برہمو سماج کے مقاصد کا ترجمان ہے ' سارے مجمع میں ایک

خاص روحانی کیفیت کارفرما تھی اور شرکا کے دل جوش مذھبی سے مملو تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا محبت خداوندی سے ان کے دل معمور ہوگئے ھیں اور بہت سے گناہ گار اپنے گناھوں کے جنجال سے چھٹکارا پاکر نیک راستہ اختیار کر لیں گے * —

راجہ کالی کرشن بہادر نے برھمو سماج کے ارکان کو دعوت دی تھی کہ وہ درگا پوجا کے موقع پر اس کے یہاں آکر جشن و رقص کی محفل میں شریک ھوں - لیکن ان لوگوں نے یہ ظاھر کرنے کے لیے وہ صرف نظری حیثیت سے ھی نہیں بلکہ عملاً اس قسم کی محفلوں کو خلاف اخلاق تصور کرتے ھیں اور بت پرستی سے تعبیر کرتے ھیں شرکت گوارا نہیں کی † -

شادی کے موقع پر جو بے جا اِسراف ھندوؤں میں کیا جاتا ھے اس کے خلاف تحریک زور شور سے جاری ھے - لالہ پیارے لال نے کایستھوں کی معاشرتی انجمن کی جانب سے ان قواعد کا تعین کر دیا ھے جو لاھور سے لے کر کلکتہ تک سب کایستھوں کے لیے واجب التعمیل ھوں گے - ان قواعد میں اس کی وضاحت کی گئی ھے کہ دعوتیں وغیرہ کس طرح اور کتنے خرچ کے اندر ھونی چاھییں - اسی موضوع کے متعلق منشی سرائے کی "ادبی انجمن" نے ایک رسالہ اردو میں شائع کیا ھے - ۵ مئی کو انجمن کا جو جلسہ منعقد ھوا اس میں اس اردو رسالے کا ھندی ترجمہ پڑھا گیا - اسی جلسے میں ایک اور اردو رسالہ پڑھا گیا جو بنارس کی ادبی انجمن کی طرف سے شائع ھوا ھے جس کے مقاصد

---

* انڈین میل - ۲۸ جنوری سنہ ۱۸۷۱ ع -

† انڈین میل - ۱۴ نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

میں معاشرتی اصلاح بھی شامل ہے * —

ہندوستان میں عقدبیوگان کی تحریک جاری ہے - اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ہندو بیواؤں کو نذرآتش کرنے کے بجائے زندہ رہنے دیا جائے اور دائمی عبادت و توبہ کی زندگی کے بجائے انہیں دنیاوی زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے - برہمو سماج کے ارکان خاص طور پر اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں - مغل سرائے کی انجمن بھی اس تحریک میں دلچسپی لے رہی ہے - بنارس کے ایک مخیر شخص سیٹھ ٹھاکرسی دیوجی نے وعدہ کیا ہے کہ برہمن اور بھات لوگوں کی بیواؤں کے عقد ثانی کے کل اخراجات اپنے پاس سے ادا کریں گے —

" نیشنل انڈین ایسوسی ایشن " کے اخبار کی ستمبر کی اشاعت میں ایک صنعتی اسکول کے قیام کے متعلق تفصیلات درج ہیں - یہ اسکول جبل پور میں حکومت کی طرف سے قایم کیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ٹھگوں کے بچوں کو دستکاری سکھانے کا انتظام کیا جائے - ٹھگ لوگ راہگیروں کو لوٹتے کھسوٹتے اور انہیں قتل کر دیا کرتے تھے - انگریزی حکومت نے ان کا استیصال کر دیا - ان کے جو بچے باقی رہ گئے ہیں رحم و کرم کے مستحق ہیں - اس مدرسے میں انہیں اپنے ہاتھ سے کسب کرنے کی تعلیم دی جائیگی تاکہ وہ اپنے باپ دادا کے طریقوں کو چھوڑ دیں اور پرامن شہریوں کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھیں —

مذہبی اصلاح کے خیالات سب ہندوستانیوں نے ابھی تک قبول نہیں کئے ہیں - بعض ہندو امراء کو لندن اور نیویارک میں اپنے مندر قایم کرنے کا خیال دامنگیر ہے - چنانچہ بمبئی گزٹ کی روایت کے بموجب

* علیگڑھ اخبار - ۵ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع -

ہندو امراء کا ایک جلسہ فروری سنہ ۱۸۷۱ ع میں جوناگڑھ میں ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ چندے کے ذریعہ رقم جمع کی جائے تاکہ ان ہندو طلبہ کی امداد اور ہمت افزائی ہوسکے جو تعلیمی اغراض کے لیے انگلستان جانا چاہتے ہیں - اس کے ساتھ لندن میں ایک مندر تعمیر کرایا جائے جو ہری (وشنو) اور مہادیو (شیوا) کے نام پر وقف ہو تاکہ قدیم ہندو دیومالا کے دونوں خداؤں کے عقید تمند مطمئن ہوں اور انہیں شکایت کا موقع نہ رہے - اس مندر کے لیے ایک لاکھ روپیے کی رقم علحدہ رکھدی جائے گی - اس مندر میں شیوا اور وشنو دونوں کے بت ہوں گے - اس طرح ہندو نوجوان اپنے نئے ماحول میں بھی مذہبی عقاید پر عمل کرسکیں گے * —

جیسا کہ عام طور پر یورپ میں خیال کیا جاتا ہے اہل ہند کے لیے یہ بات اس قدر آسان نہیں ہے کہ وہ ہندو مصلحین کی تعلیم پر عمل پیرا ہوسکیں - ذات باہر ہونے کے خطرے سے لوگوں کو نئے خیالات قبول کرنے میں بہت تامل ہوتا ہے - بمبئی کے ایک جج نے جو ذات سے برہمن تھا کیشب چندر سین کے خیالات قبول کرلیے تھے - اس سال جو اُس کا حشر ہوا وہ ایک بڑی درد ناک مثال ہے - اس جج کی بیوی مرچکی تھی اور وہ کئی بچوں کا باپ تھا - اُسنے ایک نوجوان بیوہ سے شادی کرلی - اس شادی کے بعد اس کے ذات والوں نے اس کو سخت تکلیفیں دینا شروع کیں اس لیے کہ اس نے آن کے تعصبات کے خلاف آزادی رائے سے عمل کیا - حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ بیچارہ اپنی زندگی سے تنگ آگیا - اس کی پہلی بیوی کے بیٹے نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا تاکہ

* Allen's Indian Mail - مورخہ ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

قانوناً وہ اس کی بیوی اور اُس کا بچہ جو اس دوسری بیوی سے تھا، ذات باہر کردیے جائیں - یہ بیچارہ ان سب باتوں سے مجبور ہو گیا اور اپنی ذات والوں کے ہاتھوں زچ ہوگیا - اس بدقسمت ہندو کے فلسفۂ حیات نے اس کو دھوکا دیا - اس نے بالآخر خود کشی کا عزم بالجزم کرلیا اور اپنی بیوی کو بھی اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ بھی اس کے ساتھہ خود کشی کرلے - گزشتہ سال ۱۸ فروری دونوں اپنے گھر کے کنوے میں کود پڑے - دونوں کی نعشیں اس کنوے سے برآمد ہوئیں ان دونوں نے اپنی ذات والوں کے تعصب کی وجہ سے اپنی جان دے دی * —

بابو سیپد بارجی نے جو 'براہ نگر' کی معاشرتی انجمن کے معتمد ہیں، اسی قسم کے حالات میں صبر و استقامت سے کام لیا - موصوف نے بت پرستی ترک کردی ہے اس لیے ذات والوں نے انہیں ذات باہر کردیا - اس کے والدین اور احباب نے تعلقات منقطع کرلیے - اس کے گھر کے دروازے اس کے لیے بند کردیے گئے اور دو دن تک اسے اور اس کی بیوی کو فاقہ کرنا پڑا - ہر قسم کی مصائب برداشت کیں - اس کے صبر اور استقلال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھہ عرصے بعد وہی لوگ جو اسے طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے اس کے ہم خیال بن گئے † —

اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ ہندو لوگوں میں مذہبی تعصب ابھی تک موجود ہے - یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہندو لوگ گائے (اور ایک حد تک بیل) کو مقدس خیال کرتے ہیں - اگرچہ

---

* دیلی نیلیگراف ۲۹ مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

† جرنل آف دی انقین ایسوسی ایشن - مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع -

انگریز لوگ اور مسلمان عام طور پر گائے کا گوشت کھاتے ہیں لیکن اس کا ہندوستان میں انتظام کیا گیا ہے کہ گائے کو عام شاہراہوں پر ذبح نہ کیا جائے اور اس کے گوشت کو کھلا نہ رکھا جائے تاکہ ہندو لوگوں کی اس پر نظر نہ پڑے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے پچھلے دنوں پنجاب میں اس قسم کی احتیاط نہیں کی گئی۔ سکھوں کے ایک فرقے کو جسے کوکا کہتے ہیں یہ بات ناگوار گذری اور انہوں نے کئی قصائیوں کو قتل کر ڈالا۔ حکومت کی مداخلت سے فساد رفع کیا گیا اور کئی ملزم گرفتار کیے گئے۔ 'کوکا' لوگوں کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ہے۔ ان کے گرو کا نام رام سنگھ ہے جس کی وہ بلا چون وچرا اطاعت کرتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ امرتسر میں گائے ذبح کرنا موقوف کردیا جائے۔ تاکہ پھر ان سے جھگڑا نہ ہو۔ حکومت کو اس کے متعلق کچھ انتظام کرنا ہوگا * —

ہندوؤں کی ترقی پسند جماعت برہمو سماج جس کے لیڈر کیشب چندر سین ہیں حکومت سے یہ مطالبہ کررہی ہے کہ اس کے اراکین کو اپنے اصلاحی خیالات کے مطابق شادی کی اجازت دی جائے۔ یہ لوگ سول شادی کے قائل ہیں جو ان تمام ملکوں میں رائج ہے جہاں عقائد کی آزادی موجود ہے۔ چنانچہ اس باب میں ایک مسودۂ قانون تیار کیا گیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ان مصلحین کی قدیم شاخ جس کے سربراہ بابو دیبندرا ناتھ ٹگور ہیں، سول شادی کی مخالف ہے۔ وہ ہندوؤں کی قدیم طرز کی مذہبی شادی کی تائید میں ہے اگرچہ ہندوؤں کے دوسرے عقائد میں یہ جماعت بھی یقین نہیں

* Allens Indian Mail - مورخہ ۱۲ و ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

رکھتی - اس مسئلے پر برھمو سماج کی دونوں شاخوں میں اختلاف راے اور نا اتفاقی پیدا ہو گئی ہے —

ہندوستان کے لیے یہ ایک زبردست انقلاب ہو گا اگر یہ ملک انگریزی اثر سے مسیحیت کو قبول کرلے - انگلستان ایک مسیحی ملک ہے اور اس کا دعوی بھی ہے کہ وہ مسیحیت کی نشر و اشاعت میں کوشاں ہے - لیکن اگر ہندوستان مسیحیت قبول کرے گا تو اس کے لیے وقت درکار ہے - اگر واقعی مسیحیت حقیقی معنوں میں اہل ہند کی زندگی میں تبدیلی کرے گی تو یہ بتدریج ہی ممکن ہو گا - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسیحی مبلغین سعی و جہد میں منہمک ہیں - وہ اپنا مستحسن کام کیے جارہے ہیں اگرچہ گلیڈسٹن کی وزارت نے نہ صرف اُن کی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ کھلم کھلا ان سے مخالفت کا اظہار کیا ہے * —

لدھیانہ کے امریکی مسیحی مشن کی طرف سے متعدد ہندی کے رسالے شائع کیے گئے ہیں - ان میں سے اکثر ریورنڈ ای ڈبلو وھیری، ریورنڈ ایس ایچ کلوگ اور ڈاکٹر ولسن کے لکھے ہوے ہیں - اسی مشن نے سات ہندوستانی زبانوں میں کتابیں شائع کی ہیں —

جلوبی بنگال کے "امریکن فری بپتسمت مشن" کی رپورٹ جو مارچ سنہ ۱۸۷۱ ع میں شائع ہوئی ہے ہر طرح قابل اطمینان معلوم ہوتی ہے - دیسی عیسائیوں نے، جن میں سے اکثر سنتالون پر مشتمل ہیں، ایک کلیسا عبادت کے لیے اپنے آپ تعمیر کیا ہے - اس مشن کے مدارس میں سات سو سے زائد طلبہ تعلیم پا رہے ہیں † —

---

* انڈین میل - ۱۹ اور ۲۶ ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

† Allen's Indian Mail مورخہ ۲۹ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع -

کلیسائے ویلز کی خواہش ہے کہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے کام میں ہندوستان میں کچھہ حصہ لے - بریشن کے اسقف ' ریورنڈ ڈاکٹر فوربس اور اس کے بھائی ریورنڈ جی ایچ فوربس اس کلیسا کے زمرے میں شامل ہیں - یہ دونوں بھائی اپنی قابل قدر تصانیف کی بدولت ادبی اور مذہبی حلقوں میں بہت عرصے سے شہرت رکھتے ہیں - اس کلیسا نے اپنا ایک مشن ہندوستان میں ' چندا ' کے مقام پر قائم کیا ہے اور عنقریب دوسرے مقامات پر بھی اس کی شاخیں قایم ہوجائیں گی - کلکتہ کے اسقف ریورنڈ آرملین نے بجاے مخالفت کے کلیسائے ویلز کے مشن کی ہر طرح ہمت افزائی کی ہے —

" کرسچین ورنا کلر ایجوکیشن سوسائٹی " سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے بعد قائم کی گئی تھی - اس کی تیسری رپورٹ میرے پیش نظر ہے - اس انجمن نے ۲۰ ہزار پونڈ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے کتابیں چھپوانے پر صرف کیے ہیں - یہ کتابیں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں' جو ۱۸ کروڑ اہل ہند بولتے ہیں ' طبع ہوئی ہیں - ان کتابوں کے نسخوں کی تعداد تیس لاکھہ ہے - یہ کتابیں کولمبو تک بھیجی جاتی ہیں - اس انجمن کے اس وقت ۱۱۷ مدارس چل رہے ہیں جن میں ۶۲۲۰ طلبا تعلیم پا رہے ہیں - ان مدارس میں عیسائی مدرس دنیاوی اور مذہبی تعلیم دیتے ہیں —

" انجمن اشاعت انجیل " کی بمبئی کی شاخ کا سالانہ جلسہ ۲۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع بمقام ٹاؤن ہال منعقد ہوا - جلسے کی صدارت ریورنڈ ایچ اے ڈگلس نے کی جو بمبئی کے اسقف ہیں - اس جلسے میں مسٹر پلٹ نے جو انجمن کے معتمد ہیں اپنی رپورٹ پڑھ کر سنائی -

اس رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ احاطۂ بمبئی میں مسیحیت کی تبلیغ قابل اطمینان رہی ہے اور اس علاقے میں آئندہ اینگلی کن کلیسا کی ترقی کے اور زیادہ امکانات ہیں —

جرمن مبلغین بھی مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے کام میں منہمک ہیں - ان کا سرگروہ برلن کا مبلغ 'گوسنر' ہے - اس نے 'کول' لوگوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی ہے - 'کول' لوگ چھوٹا ناگپور کے علاقوں میں آباد ہیں - اس وقت اس علاقے میں تقریباً ۱۴ ہزار عیسائی اس شخص کی مساعی کی بدولت موجود ہیں - چونکہ جرمن مبلغین کا تعلق حاکم قوم سے نہیں ہے اس واسطے غالباً دیسی لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں —

ایسا معلوم ہوتا ہے مشرق کے ایک حصے میں روس خدا کی طرف سے بھیجا گیا - تاتار اور چین میں روسی مبلغین جو نہایت پر جوش ہیں مسیحیت کی تبلیغ کر رہے ہیں - بعض روسی مبلغ ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئے ہیں —

رومن کیتھولک مشن ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں - ان کی کامیابی کا حال جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہو رہی ہے "حالات تبلیغ مذہب" سے معلوم ہوا - سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس مشن کے مبلغین نے کراچی میں ایک پارسی کو مسیحی زمرے میں شامل کیا یہ نوجوان غالباً پہلا شخص ہے جو پارسیوں کی ملت میں سے مسیحی حلقے میں داخل ہوا* —

---

* انڈین میل - ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ م —

مسٹر جان مردوش نے اپنے رسالے " ہندوستان میں مسیحی ادب پر تبصرہ " میں تفصیل سے ان مذہبی کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے جو مبلغین مسیحیت نے سنہ ۱۸۷۰ ع میں ہندوستان میں شائع کی ہیں - سنہ ۱۸۷۰ ع میں صرف مظفرپور کے جرمن مشن نے ۴۱۷۶۰ نسخے ہندی رسائل کے اور ۳۵۰۴ نسخے اردو کے شائع کئے - مرزا پور میں بھی اشاعت کی رفتار خاصی تیز رہی - الہ آباد میں ریورنڈ جے جے والش اردو زبان میں " خزینہ مسیحیت " بدستور شائع کر رہے ہیں - اس ماہوار رسالے کی زبان اردو ہوتی ہے لیکن اس کا رسم خط رومن ہوتا ہے تاکہ دیسی عیسائی لوگ اسے بہ سہولت پڑھ سکیں —

" میتھوڈسٹ امریکن مشن " نے مسیحی ہندوستانی ادب کی متعدد کتب شائع کی ہیں - اس سال سات نئی کتابیں ہندوستانی زبان کی شائع ہوئیں اور چار ہندوستانی کتابوں کو دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی - جب سے یہ مشن ہندوستان میں قایم ہوا ہے ' جسے بہت زیادہ زمانہ نہیں گذرا ' اس نے اردو اور ہندی میں ۶۰ مطبوعات شائع کی ہیں - اس مشن کے دو اردو کے رسالے نکلتے ہیں جن میں سے ایک ماہوار ہے اور دوسرا مہینے میں دو مرتبہ نکلتا ہے —

علوم مسیحی کی ترقی کے لیے جو انجمن ہندوستان میں کام کر رہی ہے اس کی شاخیں تین پریسی ڈنسیوں میں موجود ہیں - اس انجمن نے جو خاص کتاب شائع کی ہے وہ " Common Prayer Book " کا اردو اور ہندی ترجمہ ہے - اس کے علاوہ انجمن نے صرف مدراس میں ہندوستانی زبان کی کتابیں اور رسالے پانچ سو کی تعداد میں شائع کیے ہیں - ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا مفید کام اور دوسری

انجمنیں بھی انجام دے رہی ہیں - لاہور کے " ڈونیٹی اسکول " کے متعلق میں گزشتہ سال اپنے مقالے میں ذکر کر چکا ہوں - اس اسکول کے بانی ریورنڈ جے ڈبلو ناپ تھے جن کا ابھی حال میں انتقال ہوگیا - ان کے ساتھ اس کام میں ریورنڈ جے ڈبلو فرنچ اور ریورنڈ آر کلارک بھی شریک تھے - ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے غلط عقاید کی انجیل مقدس کی تعلیم سے تکذیب کریں - اس مدرسے کے فارغ التحصیل انجیل مقدس اور اس کی تفاسیر کے مطالعہ ' مسیحیت کے خلاف جو تحریریں ہیں ان کے رد اور ان قدیم زبانوں کی تحقیق سے جن میں یہ تحریریں لکھی گئی ہیں ' مسیحی حقائق کو اجاگر کرسکیں گے - اس ادارے کو جدید اصول پر چلایا جائے گا - یہاں کے طلبا فریب ہندوستانی طلبا کی طرح سے زندگی بسر کریں گے - کسی قسم کی مغربی نمود و نمایش نام کو نہ ہوگی - ان طلبا کا فرض ہوگا کہ دیسی لوگوں کی زبانیں سیکھیں اور ان کے رسوم و عادات اختیار کریں تاکہ ان میں کام کرسکیں - وہ سب کے سب سینٹ پال کے نمونے کو اپنے سامنے رکھیں گے تاکہ دوسروں کو مسیحی زمرے میں شامل کرکے ان کی ارواح کو نجات کا راستہ بتائیں - وہ سینٹ پیٹر کی طرح حکیم ہوں گے جب کہ اس نے " کورنئی " کو اس کی اجازت تک نہ دی کہ اس کے سامنے جھکے - جو لوگ ان کے دین میں شامل ہوجائیں گے چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہوں وہ ان کے بھائی بن جائیں گے —

فیروزپور کے بابو مایا داس کے عیسائی ہونے سے لوگوں میں سنسنی پیدا ہوگئی ہے - بابو صاحب کا اس شہر کے ذی وجاہت لوگوں میں شمار ہوتا ہے جن کی ہر چھوٹا بڑا عزت کرتا تھا - اس ضمن یہ بات

قابل لحاظ ہے کہ کسی مسیحی مبلغ کے توسط سے بابو صاحب نے مسیحی مذہب نہیں قبول کیا بلکہ خود اپنے ذاتی مطالعہ اور غور و فکر سے انہوں نے اس مذہب کی حقانیت کو پہچانا - اگرچہ بابو صاحب کے بعض ہم وطنوں نے انہیں عیسائی ہونے سے روکنے کی کوشش کی لیکن موصوف نے انہیں اپنے مذہب بدلنے کی وجوہ اچھی طرح سمجھا دیں —

لکھنؤ کی قدیم برہمو سماج جماعت کے تین ممتاز ارکان نے مسیحیت کی تعلیم قبول کرلی ہے - ان میں بابو چندرسین قابل ذکر ہیں جن کے نام کو بابو کیشب چندرسین مصلح برہمو سماج کے نام کے ساتھہ گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے - بابو چندرسین نے 'وزلی' کے پروٹسٹنٹ مسلک کو اختیار کیا ہے —

مخلص عیسائیوں کو یہ سنکر خوشی ہونی چاہیے کہ ایشیا اور افریقہ میں عیسائی مذہب کو خوب فروغ حاصل ہورہا ہے - اس کے ساتھہ انہیں یہ بات دیکھہ کر دکھہ ہونا چاہیے کہ مسیحی تعلیم کا اثر خود یورپ میں دن بدن کم ہوتا جاتا ہے - یورپ میں جسے "علم مذہب" کہا جاتا ہے وہ "علم لا مذہبی" کے مترادف ہے - یہ "علم مذہب" (Science of Religion) ایمان کا دشمن ہے اور گزشتہ صدی کے نظری اصول اور مضحکہ خیز بے اعتقادی کے ساتھہ موجودہ صدی کی تشکیک سے اس کی ساخت ہوئی ہے - اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کیتھولک مذہب کی ترقی ہورہی ہے اور اس پر جو حملے ہوتے ہیں وہ ان سے اپنا بچاؤ کرلیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں اندر ہی اندر گھن لگنا شروع ہوگیا ہے — خوشی کی بات ہے کہ ہندوستانی لوگوں کو ان تمام باتوں کا علم نہیں ہے - پس ہمیں خواہش کرنے دو کہ وہ مسیحیت کے سچے مذہب کو

قبول کریں گے اور اس راستے میں داخل ہوں گے جو دنیاوی طوفانوں سے بچنے اور نجات کی طرف سے جانے والا ہے —

جس طرح زندگی کا انجام موت ہے اسی طرح میں اپنے تبصرے کو ان بزرگوں کی موت کے ذکر پر ختم کرتا ہوں جو گزشتہ سال اس دنیا سے گذر گئے —

سب سے پہلے میں الکزنڈر کاظم بے کے انتقال پر ملال کا ذکر کروں گا - وہ روس کے نہایت ممتاز باشندوں میں تھے اور علمی دنیا میں ان کی شہرت تھی - اگرچہ انہیں ہندوستانی زبان سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ایک علم دوست مستشرق کی حیثیت سے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے - انہوں نے تاتاری زبانوں پر اپنی تحقیقات شائع کیں جن کے متعلق فرانس میں موسیو پاوے دے کورتئی کام کر رہے ہیں جو مشہور مستشرق سلوستر دے ساسی کے پوتے ہیں - الکزنڈر کاظم بے اسلامی ہند کی کلاسکی السنہ یعنی عربی اور فارسی اچھی طرح جانتے تھے جیسا کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے - میں ذیل میں مرحوم کی زندگی کے حالات لکھتا ہوں جو ان کے فرزند سے مجھے حاصل ہوے ہیں - ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کی زندگی کس قدر مشغول رہی - سرکاری ملازمت، مختلف اکاڈمیوں کی رکنیت، شاہی نوازشیں اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا —

مرزا کاظم بے 'دربند' کے ایک اعلیٰ خاندان کے رکن تھے - وہ ایک فاضل اور پارسا شخص تھے - گزشتہ صدی کے آخری ایام میں قاف کے علاقوں میں جو شورشیں ہوئیں ان کے باعث وہ ترک وطن کر کے مکہ چلے گئے اور پھر وہاں سے مدینہ پہنچے - بالآخر ایران میں 'رشت' کے

مقام پر سکونت پذیر ہوئے جہاں انہوں نے ایک خاتون سے شادی کرلی۔ سنہ ۱۸۰۲ میں ان کے ہاں ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام محمد علی بیگ رکھا۔ سنہ ۱۸۰۸ ع میں وہ تنہا 'قاف' آے اور بیوی بچے کو ایران ہی میں رہنے دیا۔ جب وہ شیخ الاسلام مقرر ہوگئے اور 'دربند میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی تو اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی ایران سے قاف بلا لیا۔ کچھ عرصے بعد ان کے دشمنوں نے حکومت روس کو ان سے بد ظن کردیا۔ ان پر انقلابی رجحانات کا الزام قایم کیا گیا اور مقدمہ چلایا گیا۔ ان کا سارا مال اسباب اور ملک بحق سرکار ضبط کرلی گئی اور انہیں 'استرا خان' جلا وطن کردیا گیا۔ یہ واقعات سنہ ۱۸۷۰ ع میں گذرے۔ اگلے سال ان کا بیٹا بھی ان کے پاس 'استرا خان' آگیا۔ اس کی عمر اس وقت ۱۸ سال تھی۔ اس کی ابتدائی تعلیم مکان ہی پر ہوئی تھی اور اس نے قرآن حفظ کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ فقہ اور عربی' فارسی اور ترکی ادب کی واقفیت بھی بہم پہنچائی تھی۔ اتفاق سے استرا خان میں اس کی ملاقات اسکاٹ لینڈ کے مبلغین مسیحیت سے ہوئی جنھوں نے اس کو ترکی اور عربی پڑھانے کی ترغیب دی۔ وہ انہیں عربی اور ترکی سکھانے پر آمادہ ہوگیا بشرطیکہ وہ اس کو انگریزی پڑھائیں۔ اس طرح اس کا تعلق مبلغین مسیحیت سے قایم ہوگیا۔ چونکہ وہ ایک جوشیلا نوجوان مسلمان تھا اس لیے حتی المقدور وہ ان مشنریوں سے مذہبی بحث مباحثہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ مسیحیت کے مقابلے میں مذہب اسلام کی فوقیت ثابت کرے۔ چنانچہ اس خواہش کے تحت اس نے انجیل کا مطالعہ شروع کیا۔ انجیل کی تعلیم سے واقف ہونے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے اسلامی عقاید کمزور

ہونا شروع ہوگئے اور حقیقت کی چبھن اس کے دل میں رہنے لگی - بالآخر وہ مسیحیت کے زمرے میں شامل ہوگیا - اس کے باپ نے ہر چند کوشش کی کہ وہ مذہب اسلام کو ترک نہ کرے لیکن اس کا کچھہ اثر نہ ہوا - چنانچہ اس کے باپ نے اس سے ترک تعلق کرلیا اور مرتے وقت اس کو معاف کیا - اس کے عزیز و اقارب نے بھی اس کو طرح طرح سے ستایا اور دھمکیاں دیں لیکن وہ مسیحیت کے جدید عقاید پر قایم رہا - اسنا تلیفذ کے مشنری نے اسے بپتسما دیا اور اس کا نام مرزا الکزنڈر کاظم بیگ تجویز کیا - بپتسمے کی رسم ایک بڑے جلسے میں ۲۹ جون سنہ ۱۸۲۳ ع کو منائی گئی - الکزنڈر کاظم بیگ کا خیال پہلے مبلغ مذہب بننے کا تھا لیکن اس کو یہ خیال بہت جلد ترک کرنا پڑا اسواسطے کہ روسی حکومت نے اس کے پاس احکام روانہ کیے کہ ایک امیر زادہ اور روسی رعایا کی حیثیت سے اس کو کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہیے - اِس پر اس نے حکومت سے درخواست کی کہ اسے وزارت امور خارجہ میں کچھہ کام دیا جاے تو مناسب ہے اس لیے کہ وہ ترجمانی کے فرائض بخوبی انجام دے سکتا ہے - لیکن امسک (سائبیریا) کے مدرسہ شرقیہ میں استاد کی حیثیت سے اس کا تقرر کیا گیا - جب وہ امسک جا رہا تھا تو راستے میں 'کازان' میں سخت بیمار ہوگیا - جب وہ اچھا ہوا تو 'کازان' میں اس کے بعض قدر دانوں نے اس سے وہیں کی جامعہ میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی - چنانچہ وہ کازان کی جامعہ میں مشرقی زبانوں کا استاد مقرر ہوگیا اور کچھہ عرصے بعد ادبی شعبہ کا صدر ہوگیا - سنہ ۱۸۵۰ ع میں سینٹ پیٹرس برگ بلا لیا گیا اور امپیریل اکاڈمی کا اسے رکن بنا دیا گیا -

اس کے علاوہ جامعہ کے شعبۂ ادبی کا صدر اور مشیر خصوصی کے عہدے سے سرفراز کیا گیا —

میں (گارساں دتاسی) تقریباً بیس سال سے خط و کتابت کے واسطے سے الکزنڈر کاظم بیگ سے واقف تھا - سنہ ۱۸۶۹ ع میں جب وہ پیرس آے تو مجھے ذاتی طور پر ان سے ملاقات کرنے کا موقع حاصل ہوا - وہ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے - چنانچہ لندن اور پیرس میں جو لوگ ان سے ملے وہ ان کے بڑے مداح ہو گئے - ان کا علم و فضل اور فطری ذوق قابل تعریف تھا - اس زمانے میں جب ان سے ملا تھا تو ان کی طبیعت کچھہ ناساز تھی - چنانچہ ناسازیء مزاج کا سلسلہ جاری رہا اور ۲۷ نومبر سنہ ۱۸۷۰ ع کو ان کا انتقال ہو گیا -

مرزا محمد وجاہت علی کو جو "اخبار عالم" اور "سماچار درپن" کے مدیر ہیں سنہ ۱۸۷۰ ع کے آخری ایام میں سخت صدمے پہنچے - ان کا ایک بچہ جس کی عمر تین سال تھی اور دوسرا بچہ جو صرف چند ماہ کا تھا ضائع ہو گئے - موت نے دونوں بچوں کو چند ہفتوں کے فصل سے ان کے ہاتھوں سے چھین لیا - مرزا صاحب کے احباب اور ان کے اخباروں کے پڑھنے والے ان کے ساتھہ رنج میں شریک ہیں - ان بچوں کی موت کی تاریخ بھی نکالی گئی ہے جو ظاہر ہے غمزدہ والدین کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہوسکتی - لیکن والدین کو یقین ہے کہ قیامت کے دن وہ اپنے بچوں کو دیکھیں گے - قیامت کا یہ انجیلی عقیدہ قرآنی تعلیمات میں بھی موجود ہے —

پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر ہنری ڈیورنڈ نے یکم جلوری سنہ ۱۸۷۱ ع

کو ہاتھی پر سے گر کے انتقال کیا - وہ 'اڈسکومب' کے اسکول کے ہونہار طالب علم تھے - اس اسکول میں انہوں نے اپنے استاد جان شیکسپیئر سے ہندوستانی زبان سیکھی تھی جو میرے بھی استاد تھے - سر ہنری ڈیورنڈ سنہ ۱۸۲۸ ع میں فارغ التحصیل ہو کر ہندوستان گئے - غزنی کی فتح میں وہ شریک تھے - پھر لارڈ ایلن برو کے معتمد ہوگئے جن کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے - اس کے بعد سول سروس کے مختلف اہم عہدوں پر مامور رہے - سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے موقع پر وہ اندور میں ریزیڈنٹ تھے - اس کے بعد انگلستان میں انڈیا کونسل کے رکن مقرر ہوے - پھر وہاں سے ہندوستان واپس آے اور لارڈ کیننگ کی حکومت میں معتمد اور خارجی کے عہدے پر سرفراز ہوے - سنہ ۱۸۶۵ ع میں وائسرائے کی کونسل کے رکن مقرر ہوے اور سب سے آخر میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر بنائے گئے - آج انگلستان اور ہندوستان میں سر ہنری ڈیورنڈ کی ہر طرف تعریف ہو رہی ہے - ان کی خدمات' ان کی فوجی قابلیت اور نظم و نسق کی صلاحیت کو ہر کوئی تسلیم کر رہا ہے - ان کے تدبر' خوش فہمی اور وسیع اخلاق کے متعلق ہر طرف لوگ ذکر کر رہے ہیں - وہ ان لوگوں میں سے تھے جو موت کو زندگی کا دروازہ تصور کرتے ہیں - درحقیقت "موت ایسی چیز ہے جس پر جری لوگ قابو پالیتے ہیں' عقل مند لوگ اس کے منتظر رہتے ہیں' غمزدہ لوگ اس کی خواہش کرتے ہیں اور نیک لوگ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اسواسطے کہ وہ جانتے ہیں کہ ابدی روشنی کا راستہ قبر ہی کی تاریک گلی سے ہو کر جاتا ہے" —

میں نے اپنے سنہ ۱۸۷۰ ع کے تبصرے میں ان مختلف قصوں کی نسبت ذکر کیا تھا جن کی اشاعت مدراس کے مہجر مارک ولیم کار نے اپنے ذمہ لی تھی یہ قصے دکنی زبان کے ہیں - آج مجھے افسوس کے ساتھہ لکھنا پڑتا ہے کہ اس فاضل مستشرق کا انتقال ہوگیا - اس کی موت کے سبب سے وہ کام رک جاے گا جسے اس نے شروع کیا تھا - مہجر کار کو متعدد مشرقی زبانوں پر جو قدرت حاصل تھی اس کو دیکھہ کر تعجب ہوتا تھا - تلنگی زبان کی ضرب الامثال پر جو کتاب اس نے شائع کی تھی وہ بہت مشہور ہوئی اور اس سے اس کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے - مہجر کار کو خاص طور پر ہندوستانی زبان سے لگاؤ تھا - اس کے انتقال سے اس محدود طبقے میں بڑی کمی پیدا ہوگئی جو ہندوستانی زبان کے قدر دانوں کا ہے - اس کا ایک خط مورخہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ ع بمبئی سے میرے نام آیا تھا - اس خط میں اس نے لکھا تھا کہ وہ دو ایک ماہ کے لیے بمبئی سیر و تفریح کے لیے آیا ہوا ہے - اس کے بعد وہ مدراس چلا جاے گا - غالباً سمندری راستے سے وہ "جنرل آؤترم" نامی جہاز سے واپس ہوا اور راستے میں ڈوب کر مرگیا - میرے اور مہجر کار کے تعلقات بہت گہرے اور قدیم تھے - نہ صرف ادبی مشاغل کی یکسانیت کے باعث بلکہ مذہبی عقائد مشترک ہونے کی وجہ سے میرے وہ بڑے مخلص دوستوں میں سے تھے - وہ اپنی مذہبیت کی وجہ سے مدراس کی سوسائٹی میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے —

یکم اپریل سنہ ۱۸۷۱ ع مسز مہلنگ کا انتقال ہوگیا جو "ہند قدیم و وسطیٰ" کی مصنف تھیں - یہ اِس زمانے کی نہایت فاضل اور خوش اخلاق انگریز عورت تھیں - یہ خاتون سنہ ۱۸۰۳ ع میں پیدا ہوئیں

مس کارپنٹر کی طرح انہیں بھی راجہ رام موہن رائے کی دوستی کی وجہ سے ہندوستان کے ساتھہ شغف پیدا ہوگیا - راجہ رام موہن رائے اپنے قیام انگلستان کے دوران میں مسز میننگ کے والد کے یہاں اکثر جایا کرتے تھے - مسز میننگ نے اپنے پہلے شوہر ڈاکٹر اسپیئر کی معیت میں ہندوستان میں تین سال گذارے اور خود اپنی آنکھوں سے وہ تمام حالات دیکھے جو بعد میں ان کی تحریروں کا موضوع بنے - وہ ہندوستانی زبان بلا تکلف بول سکتی تھیں اور اہل ہند سے گفتگو کر سکتی تھیں - انگلستان میں واپسی پر انہوں نے اپنی کتاب "قدیم ہند کی زندگی" تصنیف کی - یہ ان کی پہلی تصنیف تھی جو دو جلدوں میں سنہ ۱۸۶۹ ع میں شائع ہوئی - اس کتاب کی اشاعت کے بعد انہوں نے مسٹر میننگ سے شادی کرلی جو مشہور قانون داں شخص تھے - مسز میننگ نے 'ہچن' کے مدرسۂ نسواں کے قیام میں اپنی فیاضی اور مشورہ سے بڑی مدد دی - گزشتہ سال جب بابو کیشب چندر سین انگلستان آئے تو مسز میننگ نے انہیں دعوت دی بالکل اسی طرح جیسے ان کے والد راجہ رام موہن لال کو اپنے ہاں مدعو کیا کرتے تھے - کچھہ عرصہ مسز میننگ نے "انڈین ایسوسی ایشن" کے قایم کرنے میں بڑی امداد کی تھی اور مس کارپنٹر کے ساتھہ تعاون عمل کیا تھا - ان کی بہو مس ای اے میننگ بھی ہندوستان کے ساتھہ ہمدردی رکھتی ہیں - وہ صرف "انڈین ایسوسی ایشن" ہی میں شریک نہیں ہیں بلکہ انہوں نے لندن میں اس قسم کی ایک اور انجمن قایم کی ہے جس کی وہ اعزازی معتمد ہیں —

گزشتہ ستمبر میں کلکتہ میں ایک مشہور مجسٹریٹ جے سی نارمن کو کسی نے قتل کر ڈالا - وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے - وہ اگرچہ اپنے

فیصلوں میں سخت تھے لیکن انصاف کو کبھی ہاتھہ سے نہیں جانے دیتے تھے - لوگ ان کے متعلق اچھی راے رکھتے تھے اور ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے - انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں - شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ کسی متعصب وہابی نے انہیں قتل کیا ہے - لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان کے قتل میں کوئی سازش نہیں تھی - ایک پٹھان نے جس کا نام عبداللہ تھا بھنگ کے نشے میں انہیں قتل کر ڈالا - اس کو جج سے یہ شکایت تھی کہ اس نے اس کی عرض داشت کو لینے سے انکار کیا - قاتل کو پھانسی دی گئی اور اس کی نعش کو نذر آتش کر دیا گیا - جب اس پٹھان کو پھانسی کے لیے لے جانے لگے تو وہ نماز پڑھ رہا تھا - چلتے وقت اس نے صرف ہندوستانی کا لفظ "اچھا" کہا اور بس —

مسٹر 'نارمن' کے قتل پر کلکتہ کے پورے شہر نے ماتم کیا - ان کی موت ایک عام نقصان خیال کی گئی - شہر کی دکانیں بند کر دی گئیں - شہر کے عیسائی' ہندو اور مسلمان ان کے جنازے کے ساتھہ قبرستان تک گئے - مسلمانوں نے خاص طور پر ان کے قتل پر اظہار رنج کیا اسواسطے کہ متوفی جج کو ان کی بہتری کا خیال رہتا تھا - مسلمانوں نے ایک عام جلسہ منعقد کیا جس میں قتل پر اظہار ملال کیا اور متوفی جج کی یادگار قایم کرنے کے لیے چندہ کیا - سید عبداللہ نے Allen's Indian Mail کی ۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا ہے اور اس میں یہ امر ثابت کیا ہے کہ اس قتل میں کسی قسم کی سازش نہیں تھی بلکہ وہ صرف ایک شخص کا ذاتی فعل تھا —

آخر میں میں اپنے ناظرین کو بتا دوں کہ جج نے مرتے وقت اتوار کے دن والی مناجات پڑھنے کو کہا اور خود یہ الفاظ دہرائے : "ہمارے قصور معاف فرما جس طرح ہم معاف کر دیتے ہیں" - بقول سینٹ جان "انہیں ابدی مسرت حاصل ہوگی جو خدا کے لیے مرتے ہیں" - ورڈزورتھ نے کیا خوب کہا ہے :

"اس جنت نعیم کی خوبیاں اور شان کون بیان کر سکتا ہے - جب خود خدا اس کے متعلق بہت کم کہتا ہے تو دانش مندی کا اقتضا یہ ہے کہ خموشی اختیار کی جائے" —

خطبۂ صدارت

از

عبد الحق

آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)

جو

(سندھ پراونشل اردو کانفرنس (کراچی) کے اجلاس منعقدہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ ع میں پڑھا گیا)۔

یہ زمانہ عجیب و غریب انقلابات و تغیرات اور عجیب و غریب اختراعات و ایجادات کا ہے۔ ہم وہ عجائبات دیکھ رہے ہیں جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تار برقی، ٹیلیفون، ایروپلین، اور دوربینی (Television) نے عالم میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ زمان و مکان جن کی وسعت اور بے پایانی انسانی فہم سے بالا ہے آج اس خاک کے پتلے کے سامنے سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ گھر بیٹھے ہزاروں کوس کی تقریریں اس طرح سنتے اور وہاں کے کھیل تماشے اس طرح دیکھتے ہیں گویا یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ ان ایجادات کی بدولت سفر میں حضر اور حضر میں سفر کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ آمد و رفت، خط و کتابت، حمل و نقل، تعلیم و تعلّم میں دنیا ایک ہوتی جاتی ہے۔ انسانی دماغ

نے یہ تو سب کچھہ کیا لیکن زبان کے معاملے میں یہ اب تک عاجز ہے - ہر ملک کی الگ الگ زبان اور ہر زبان میں کئی کئی بولیاں ہیں - جب دو غیر زبان یا غیر ملک والے ایک جگہ آملتے ہیں تو با وجود نطق کے جو قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے گونگے بن جاتے ہیں اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں - یہ اور بات ہے کہ اشاروں اور ہاتھہ آنکھہ کے چلانے سے دو ایک موٹی موٹی ضرورتیں پوری کرلیں - لیکن نہ معاملات پر گفتگو کر سکتے ہیں اور نہ اپنے دل کی بات دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں - اس کے علاوہ تمدنی ' تہذیبی اور علمی ضروریات اس امر کی مقتضی ہیں کہ دنیا کے پردے پر مختلف حصوں میں جو کچھہ ہو رہا ہے اس کا فوراً ہم تک پہنچنا ضروری ہے - آج تک حالت یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں جلد جلد تغیرات ہو رہے ہیں ' نئے نئے اکتشافات ' نئی نئی ایجادیں ' طرح طرح کے نظریے عمل میں آرہے ہیں اور ایک ایسے شخص کے لیے جو علم کا پیاسا ہے یا کسی تحقیقات میں مصروف ہے ان معلومات کا فوری علم لازم ہے - اور جب تک دوسرے ذرائع یا ترجمے کی وساطت سے یہ معلومات اُس تک پہنچیں دنیا آگے نکل جاتی ہے ' یہ پیچھے رہ جاتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عمر بھر کی کمائی اکارت جاتی ہے —

یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کے بعض ہمدردوں نے اس ابتری اور افراتفری کو دیکھہ کر ایک بین اقوامی زبان "یا جگت بھاشا" ایجاد کرنے کی کوشش کی - یہ کوششیں مختلف زبانوں میں ہوئیں اور بڑے اچھے اچھے دماغوں نے اس پر محنت کی لیکن اب تک اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی اور اس نقص کی وجہ سے انسان اب تک بہت سی خامیوں اور ناکامیوں کا شکار بنا ہوا ہے —

گو کوئی جگت بھاشا اب تک نہیں بنی اور نہ ابھی کوئی توقع ہے لیکن باوجود اس کے جب تجارت، کشور کشائی، جلاوطنی نے مختلف زبانوں کے لوگوں کو ایک جگہ لا ملایا تو باہم متواتر سابقہ پڑنے یا دوسرے دیس میں بس جانے سے ان لوگوں نے ایک دوسرے کی زبانوں کو گڈمڈ کر کے ایک نئی زبان بنالی اور اسی میں بات چیت، لین دین، کاروبار اور معاملات انجام دینے لگے - دنیا میں اس قسم کی متعدد زبانیں ہیں - انھیں میں سے ایک ہماری زبان بھی ہے جو اردو یا ہندوستانی کے نام سے موسوم ہے جو کسی بادشاہ کے خبط یا کسی حکیم کی حکمت یا کسی خوش فکر کے وہم کا نتیجہ نہیں بلکہ انسانی ضروریات کا اقتضا اس کا باعث ہوا —

جگت بھاشا نہیں تو نہ سہی، کم سے کم ہمارے پاس ایک ایسی زبان تو ہے جسے ہم "دیش بھاشا" کہہ سکتے ہیں - ایک ایسے ملک میں جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی تھیں اور بولی جاتی ہیں، ایک ایسی زبان کا ہونا لازم تھا - قانون قدرت نے اپنا کام کیا اور انسانی ضرورت نے اسے لبّیک کہا اور رواج نے اسے پھیلایا - اس لیے کہ جب اِسلامی سلطنت کو یہاں استحکام ہوا، حکومت کو وسعت ہوئی، امن وعافیت میں ترقی ہوئی، مختلف صوبوں میں ربط قائم ہوا، آمد و رفت اور میل جول کی آسانیاں پیدا ہوئیں، نئے سامان ظہور میں آئے، حالات و خیالات میں تغیر ہوا اور ایک جدید ماحول کا دور شروع ہوا تو ان حالات اور ماحول کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت واقع ہوئی کیونکہ اس وقت جتنی زبانیں ہندوستان میں رائج تھیں وہ سب اپنے اپنے حلقے میں محدود تھیں اور اس نئی خدمت کے

انجام دینے سے قاصر تھیں - فارسی ہر چند کہ سرکاری درباری زبان تھی اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان ' افغانستان ' ایران نیز مملکت روم تک چھائی ہوئی تھی مگر آخر غیر زبان تھی اور ملکی زبان نہیں ہوسکتی تھی (بعینہ جیسے اس وقت انگریزی) - اس لیے ایک زبان کی جگہ خالی تھی - اس خالی جگہ کو خود بخود اس نئی زبان نے پُر کیا جو ضروریات وقت کے لحاظ سے دونوں قوموں یعنے ہندو مسلم کی شرکت اور اتحاد سے بنی تھی- یہی ہماری دیش بھاشا ہے- یہی ہماری ملکی اور قومی زبان ہے کیونکہ اس کی تخلیق کی غرض و غایت ہی یہی تھی - اب کوئی دوسری ' خواہ نئی ہو یا پرانی ' اس سے یہ منصب نہیں چھین سکتی —

اس قسم کی مخلوط زبانوں کے بننے کے دوران میں ایک خاص بات عمل میں آتی ہے جو قابل غور ہے یعنے ان میں سے ہر زبان کو اس خیال سے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آسکے اپنی بعض خصوصیات کو ترک کرنا پڑتا ہے اور صرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لیے سہل ہوتا ہے اور اس طرح ان میں ایک توازن سا پیدا ہوجاتا ہے جو فریقین کے لیے سہولت کا باعث ہوتا ہے - اُردو یا ہندوستانی کے بننے میں بھی یہی ہوا - فریقین یعنی ہندو مسلمان دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں کتربیونت کی ' اپنی مخصوص خصوصیات کو ترک کیا اور اس قربانی کے بعد جو نئی زبان بنی اسے اختیار کیا جو ضرورت زمانہ کے مطابق اور حالات کے مناسب تھی اور جو اب ہماری ملکی اور قومی زبان ہے اور ہندوستان کی مشترک اور عام زبان کا درجہ حاصل کرچکی ہے - ہم نے اسے قربانی کرکے حاصل کیا ہے اور کسی کا یہ

منہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ہم سے اسے چھڑائے —

اس قسم کی مخلوط زبانیں دنیا میں جہاں جہاں ہیں ان میں سے اکثر اور غالباً سب کی سب بول چال اور کاروبار کی حد تک کام آتی ہیں - یہ امتیاز صرف اردو کو حاصل ہے کہ وہ لشکر اور بازار سے نکل کر مسند انشا تک پہنچی ' رونق محفل شعرا ہوئی ' علم و ادب کا سہارا بنی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آج یونیورسٹی کے اعلیٰ مضامین اور علم کا ذریعہ و تعلیم ہے - یہ وہ درجہ ہے جو اب تک ہندستان کی کسی زبان کو حاصل نہیں ہوا —

کہا جاتا ہے کہ اب نیا زمانہ آگیا ہے ' نئے حالات ہوگئے ہیں - نئے دور نے جنم لیا ہے ' نئے خیالات کی آمد ہے ' اس لیے اب زبان بھی نئی ہونی چاہیے - بے شک ایک زمانہ ایسا تھا کہ نئے حالات اور خیالات اور جدید ماحول کی وجہ سے بھی ایک جدید زبان کی ضرورت تھی اور وہ اس لیے کہ پہلے سے ملک میں کوئی زبان موجود نہ تھی - اب جب کہ ایک زبان بن چکی ' ملک میں رائج ہوچکی ' ملک کی عام اور مشترک زبان مانی جاچکی تو اس کے ہوتے کسی دوسری زبان کا بنانا سودائے خام اور خیال باطل ہے —

ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک ایسی زبان میں جو ملک بھر کی زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے اتنی صلاحیت اور استعداد ہونی چاہیے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور نئے خیالات اور افکار ادا کرسکے - یہ ہر زندہ زبان کے لیے لازم ہے ورنہ وہ زندہ نہیں رہ سکتی - یہ صلاحیت اس میں پوری پوری موجود ہے جس کے لیے مجھے اس وقت شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں - الفاظ کا ذخیرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے - نئے نئے

اسلوب بیان پیدا ہوتے جاتے ہیں - نظم و نثر کا رنگ بدلتا جاتا ہے ' نئی اصطلاحات وضع ہوتی جاتی ہیں - مغربی تصانیف کے ترجمے ہو رہے ہیں - مختلف علوم پر تالیفات کی جا رہی ہیں - یہ سب باتیں ہماری زبان کی زندگی پر دلالت کرتی ہیں —

ایک حکیم کا قول ہے کہ غیر اقوام کے لوگوں کو اپنی قوم میں اس طرح جذب کرلینا کہ اپنے اور غیر میں کوئی امتیاز نہ رہے بلاشبہ بہت مشکل کام ہے لیکن غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان میں اس طرح جذب کرلینا کہ معلوم تک نہ ہو کہ یہ غیر ہیں ' اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے - یہ استعداد اردو زبان میں بدرجہ کمال موجود ہے - اس میں سیکڑوں ' ہزاروں الفاظ غیر زبانوں کے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ بولنے ' پڑھنے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ یہ دیسی ہیں یا بدیسی ' اپنے ہیں یا پرائے —

میں علی الاعلان یہ کہتا ہوں اور اس کہنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ ہم ہندی ' سندھی یا ہندوستان کی کسی زبان کے بھی مخالف نہیں بلکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہر زبان کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا حق ہے - لیکن یہ امر مسلم ہے اور ہر طبقے اور ملت کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی ایک زبان ایسی ضرور ہونی چاہیے جو ہماری ملکی اور قومی زبان ہو - اب بحث اس میں ہے کہ وہ کونسی زبان ہو —

ہمارا کہنا یہ ہے اور ہم اس کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک ایسی زبان پہلے سے موجود ہے جسے اردو یا ہندستانی کہتے ہیں یہ وجود میں آئی ہی اس غرض سے تھی - اقتضائے وقت نے اسے پیدا ہی اسی لیے کیا تھا - یہ اب تک ملکی اور مشترکہ زبان سمجھی جاتی رہی اور

مشترکہ زبان کا کام دیتی رہی اور اس وقت بھی یہی خدمت انجام دے رہی ہے - میرا یہ دعویٰ اس لیے نہیں کہ یہ میری زبان ہے بلکہ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہوسکتا —

رہی ہندی ' سو اس کے مخالف تو ہم ہو ہی نہیں سکتے ' اس لیے کہ وہ ہماری ہی ساختہ پرداختہ ہے - ہمیں نے اس کو فروغ دیا اور پھیلایا کیونکہ جب مسلمان یہاں آئے تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے ہر علاقے کی بولی الگ الگ تھی - نہ ملک کی کوئی عام زبان تھی اور نہ کوئی ایک حکومت تھی اور نہ ذرائع آمد و رفت وسیع تھے اس لیے ہر بولی کا حلقہ محدود تھا - مسلمان فاتحوں کی زبان فارسی تھی - جب انھوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہاں کی ایک مقامی بولی سے جو اب کھڑی بولی کہلاتی ہے اور جس کے معنے عوام کی بولی کے ہیں فارسی کی مذبھیڑ ہوئی - جیسے جیسے ہندو مسلمانوں میں میل جول بڑھتا گیا ان دونوں زبانوں میں بھی ربط ضبط بڑھنا شروع ہوا - اور رفتہ رفتہ یہ دونوں ایسی گھل مل گئیں کہ فارسی اور کھڑی بولی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا اور جوں جوں اسلامی سلطنت پھیلتی گئی اس کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا اور یہ بولی جسے کوئی جانتا پہچانتا نہ تھا ہماری بدولت سارے ہندستان میں پہنچی - سلطنت کی فوجیں ' صوفی و درویش ' علما و شعراء ' عمال و حکام جہاں گئے اسے اپنے ساتھ لے گئے اور ہندستان کے گوشے گوشے سے اسے روشناس کرا دیا - ہم اس کی مخالفت کیونکر کرسکتے ہیں ؟ یہ ہماری زبان کی بنیاد ' ہماری زبان کی زینت اور رونق بلکہ اس کی جان ہے - اگر آج ہم اپنی زبان سے اسے خارج کر دیں تو ہماری زبان مہمل اور بے معنی ہو جائے گی —

لیکن ہاں ہم اس جدید ہندی کے بے شک مخالف ہیں جو ہندستان کی دو بڑی قوموں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنائی گئی ہے جس کی بنیاد نئی قومیت کے جوش اور فرقہ واری جذبے پر ہے جس کا منشا عربی فارسی الفاظ کو خارج کرکے ان کے بجائے سنسکرت اور ہندی کے نامانوس الفاظ رائج کرنا ہے حالانکہ وہ عربی فارسی الفاظ صدہا سال سے رس بس کی ہندستانی زبان کا جز ہوگئے ہیں —

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندستانی یا اردو مخلوط زبان ہے - یہاں کی خالص زبان نہیں - اول تو دنیا کی کوئی زبان خالص نہیں دوسرے ہماری زبان کا مخلوط ہونا عیب نہیں بلکہ اس کی خوبی ہے اس سے اس کا یہ دعویٰ اور بھی قوی ہو جاتا ہے کہ وہی ملک کی مشترکہ زبان ہے - نیز اس اختلاط کی وجہ سے اس میں ایک ایسی وسعت ، قوت اور فراوانی پیدا ہوگئی ہے کہ ادیب کو ہر قسم کے خیالات نئے نئے ڈھنگ سے ادا کرنے اور صحیح اور موزوں لفظ کے انتخاب میں جو سہولت ہے وہ شاید ہی ہندستان کو کسی دوسری زبان میں ہو —

مخلوط ہونے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ نئے الفاظ کے بنانے اور ترکیب دینے کے لیے ایک وسیع میدان ہاتھ آجاتا ہے - ایک ایسی زبان کے لیے جو علمی اور ادبی ہونے کی آرزو یا دعویٰ رکھتی ہے یہ بہت بڑی چیز ہے —

جدید ہندی کے حامیوں نے زبان کو خالص بنانے کی یہ ترکیب نکالی ہے کہ فارسی عربی کے لفظ چن چن کر نکال دیئے جائیں اور ان کی جگہ سنسکرت یا ہندی کے لفظ داخل کیے جائیں خواہ وہ مانوس ہوں یا نہ ہوں سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں - یہ نہایت احمقانہ خیال

ہے - انشا پرداز یا ادیب کے پیش نظر یہ اصول ہونا چاہیے کہ عام استعمال میں سب سے بہتر لفظ کونسا ہے خواہ کسی زبان کا ہو - الفاظ کے انتخاب میں لفظ کی نسل و اصل کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کونسا لفظ خیال کو صحت اور خوبی کے ساتھہ ادا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے - الفاظ کے انتخاب کی بنیاد اس اصول پر رکھنا کہ کوئی لفظ غیر زبان کا نہ آنے پائے خواہ کیسا ہی موزوں، صحیح اور عام فہم کیوں نہ ہو نہایت گمراہ کن اصول ہے اور زبان کے حق میں سخت مضر ہے —

میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں - کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوتا ہے میں میرٹھہ سے دھلی جارہا تھا - گاڑی ایک گانو کے اسٹیشن پر ٹھیری - وہاں سے دو ہندو صاحب سوار ہوئے - آج کل گنّے کی کاشت کا بہت رواج ہورہا ہے اُدھر بھی جگہ جگہ لوگوں نے سہولت کے لیے اسٹیشنوں کے قریب گنّے کی کاشت کے ساتھہ گڑ بنانے کے کارخانے قائم کر رکھے ہیں - گنے کا پھوک اور دوسرا کوڑا کرکٹ ریلوے لائن کے قریب پھینک دیتے ہیں جس سے بہت بدبو پھیل جاتی ہے چنانچہ جب گاڑی چلی اور بدبو آئی تو میں نے کہا کہ اس گانو سے بہت بدبو آرہی ہے اُن ہندو صاحب نے فرمایا کہ یہاں گڑ کا کارخانہ ہے اس کی وجہ سے سخت تعفّن پیدا ہوگیا ہے - اس گفتگو میں ان صاحب نے تعفن کا لفظ استعمال کیا اور میں نے بدبو کا - لیکن میں بدبو کو تعفن پر ترجیح دیتا ہوں اس لیے نہیں کہ یہ لفظ میں نے کہا تھا اور نہ اس لیے کہ تعفن عربی لفظ ہے اور بدبو ہندوستانی، بلکہ اس لیے کہ یہ زیادہ عام فہم اور سہل ہے اور بالکل وہی مفہوم ادا کر رہا ہے جو تعفن - لیکن اگر کوئی قیمت، دکان، کتاب کی جگہہ نامانوس ہندی یا سنسکرت

کے لفظ استعمال کرے گا تو میں کبھی روا نہ رکھوں گا - اگرچہ قیمت اور دکان عربی اور فارسی کے لفظ ہیں لیکن وہ اس قدر عام طور پر رائج اور اس قدر مختصر اور سہل ہیں کہ ان کی جگہہ ثقیل اور نامانوس الفاظ استعمال کرنا ذوق سلیم کا خون کرنا ہے —

ایک اور غضب آج کل یہ ہو رہا ہے کہ اچھے خاصے تھیٹ ہندی لفظوں کی جگہہ جان جان کر ثقیل نامانوس سنسکرت لفظ داخل کیے جا رہے ہیں یا ان اصل سنسکرت الفاظ کو ڈھونڈ ڈھونڈھ کر لایا جا رہا ہے جن سے ہندی لفظ بنے ہیں مثلاً برس کو ورش، گانو کو گرام کہیں گے حالانکہ برس اور گانوں خاص و عام سب کی زبان پر ہیں اور خالص ہندی ہیں یا مثلاً پیر نہیں پد کہیں گے - اس قسم کے سینکڑوں لفظ نئے نئے داخل کیے جا رہے ہیں جن کی تفصیل خواہ مخواہ موجب طوالت ہوگی - اس سے ان کی نیت کا پتہ چلتا ہے - میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں - میرا ایک ہندو طالب علم ریل میں سفر کر رہا تھا اسے دیا سلائی کی ضرورت ہوئی تو اس نے اپنے ہم سفر ہندو نوجوان سے مانگی - اس نے دیا سلائی تو دے دی مگر ساتھہ ہی یہ بھی کہا کہ اب اس کا نام دیا سلائی نہیں رہا - طالب علم نے حیرت سے پوچھا کہ پھر اب اسے کیا کہتے ہیں ؟ اس نے کہا "دھومرشلاکا" - اس حماقت اور بد ذوقی کی کوئی انتہا ہے ؟ دیا سلائی تھیٹ ہندی لفظ ہے اور اس کے دونوں جز ہندی ہیں پھر ایک نہایت عام فہم، سادہ اور خوبصورت لفظ ہے - اس کی جگہہ دوسرا ثقیل، نامانوس مہمل لفظ استعمال کرنا کس قدر حیرت انگیز ہے - آخر اس کا کیا مطلب ہے ؟ مطلب ظاہر ہے اور مجھے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں —

ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کا کانووکیشن ایڈریس پنڈت مدن موہن مالویہ جی نے ہندی زبان میں ارشاد فرمایا۔ اگرچہ میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ جامعۂ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اعلیٰ جماعتوں تک اردو ہے اور وہاں ہر سال کانووکیشن کا ایڈریس اردو ہی میں پڑھا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے بے انتہا خوشی ہوئی کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ برٹش انڈیا کی ایک پرانی یونیورسٹی میں کانووکیشن ایڈریس ایک دیسی زبان میں سنایا گیا - پنڈت جی نے شروع میں حاضرین سے انگریزی زبان میں دو باتوں کی اجازت چاہی ایک تو یہ کہ میں بیماری کی وجہ سے بہت کمزور ہوں' اپنی تقریر بیٹھ کر کروں گا - دوسرے یہ کہ میں اپنی تقریر اپنی مادری زبان میں کروں گا - اس کے بعد جو انہوں نے تقریر شروع کی تو وہ سنسکرت آمیز ہندی میں تھی - اس پر ایک طالب علم نے (خدا اس کی ہمت میں برکت دے) اُٹھ کر کہا "جناب میں آپ کی زبان نہیں سمجھ سکتا" اس پر پنڈت جی چونکے اور انہوں نے ایسی ہندی میں تقریر کی جو آدھی مادری زبان تھی اور آدھی پدری - پنڈت جی علاوہ سنسکرت اور انگریزی کے عالم ہونے کے ہندستانی زبان کے بھی ادیب ہیں - جن لوگوں نے کچھ عرصہ قبل ان کی تقریریں سنی ہیں وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ وہ کیسی شستہ اور فصیح ہندستانی یعنی اردو بول سکتے ہیں - لیکن ان اثرات اور حالات کی وجہ سے جو آج کل ہماری بدنصیبی سے ملک پر چھائے ہوئے ہیں انہوں نے اپنا رخ بدل دیا ہے - جب ایسے پختہ کار' دور اندیش اور ہمدرد بزرگ جن سے اصلاح و مصالحت کی توقع ہے مضر اثرات سے نہیں بچ سکتے تو نوجوانوں

اور بے خبر لوگوں سے کیا شکایت ہو سکتی ہے - ایک بات ان کی تقریر میں یہ نظر آئی کہ جب انہیں کوئی ہندی لفظ نہیں ملتا تھا تو اردو یا فارسی کا مروجہ لفظ نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ اس کی جگہ انگریزی لفظ کو ترجیح دیتے تھے - سنسکرت کے جو اقوال ان کی تقریر میں آتے تھے اس کا ترجمہ وہ ہندستانی میں نہیں بلکہ انگریزی میں فرماتے تھے - یہ سب باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے —

ہم ان باتوں کے روادار نہیں ہو سکتے - بدگمانی بری چیز ہے لیکن بدگمانی پیدا کرنے والوں کو کیا کہا جائے؟ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں صاف طور سے اس امر کا اعلان کیا ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہوگی لیکن اس معزز جماعت نے کبھی اس کو عمل میں لانے کی کوشش نہیں کی - اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے ممتاز ارکان ہندی کی اشاعت پر تلے ہوئے ہیں تو ہماری بدگمانی بالکل بجا ہے - ابھی حال میں ایک راجہ نے ایک بیش قرار رقم مسٹر سی راج گوپال اچاریہ کی خدمت میں اس غرض سے پیش کی ہے کہ وہ اسے ہندی کی اشاعت میں صرف کریں - سی راج گوپال اچاریہ کانگریس کے رکن اعظم اور صوبۂ مدراس کی کانگریس حکومت کے وزیر اعظم ہیں - انہیں چاہیے تھا کہ وہ شکریہ کے ساتھ اس رقم کو واپس کر دیتے اور صاف کہہ دیتے کہ کانگریس کے عقیدے اور اصول کے رو سے وہ اس رقم کو قبول نہیں کر سکتے ' ہاں اگر ہندوستانی کی اشاعت کے لیے دیے جاتے ہیں تو بسر و چشم قبول کرنے کے لیے تیار ہیں - لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا - اس سے ظاہر ہے کہ ہندستانی کا ریزولیوشن بھی ایک سیاسی چال تھی —

حضرات! زبردستی فاقے کرنے' پر جوش سیاسی تقریریں کرنے یا

خوشنما الفاظ میں ریزولیوشن منظور کرلینے سے دل نہیں بدلتے - دل بدلنے والی چیزیں اور ہی ہوتی ہیں —

حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے مسئلے پر ایک رسالہ شائع کیا ہے - اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ اردو شہروں کی زبان ہے اور ہندی دیہات کی - یہ بیان سراسر خلاف واقعہ اور غلطی پر مبنی ہے - پنڈت جی نے یا تو لاعلمی کی وجہ سے یا اُس عام پروپیگنڈے کی وجہ سے جو ہر طرف کیا جارہا ہے یہ لکھ دیا ہے ورنہ وہ جدید زبان جسے آج کل ہندی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ہندستان کے کسی دیہات میں نہیں بولی جاتی - مہرٹھہ یا دلی کے دیہات والے کے لیے بہار کے دیہات والی کی بولی ایسی ہی اجنبی ہے جیسے ایک لاہوری کے لیے ملتانی - ہندی کا لفظ مبہم ہے اور اس سے مغالطہ پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن ہم اس غلطی یا دھوکے میں نہیں آنا چاہتے - ہمیں قطعی طور سے یہ طے کرلینا چاہیے کہ ہندستانی یعنے اُردو ہمارے ملک کی زبان ہے اور اس کی اشاعت اور ترقی میں ہمارے ملک کی بہبودی ہے -

اے اہل سندھ! اگرچہ اردو کی ابتدا آپ کے ملک میں نہیں ہوئی لیکن سب سے پہلے مسلم ہندو تہذیبوں کی یکجائی آپ ہی کے ہاں شروع ہوئی اور آپ ہی نے یک جہتی میں وہ رنگ پیدا کیا جس کے نمونے کچھہ دنوں پہلے تک دونوں قوموں کے رفتار و گفتار، خوراک و پوشاک وغیرہ میں نظر آتے تھے - اب بھی آپ کی زبان میں ہزاروں عربی فارسی کے لفظ بے تکلف بول چال اور تحریر میں آتے ہیں - گویا آپ نے وہ زمین تیار کی جس پر آگے چل کر اردو کے چمن نے رونق اور سرسبزی حاصل کی - اگرچہ ہم دونوں کی یک جہتی اور اتحاد کی اور بہت

سی نشانیاں اب بھی موجود ہیں اور بہت سی مٹتی جاتی ہیں لیکن یہ زبان جو اردو یا ہندستانی کہلاتی ہے ہندو مسلم یک جہتی اور اتحاد کی سب سے بڑی اور زندہ یادگار ہے - اس کی ساخت اور ترکیب میں دونوں قوموں کے اعلیٰ دماغ اور افکار، دونوں قوموں کی بے ریا اور متحدہ کوششوں اور دونوں قوموں کے ادبی نتائج کا نچوڑ موجود ہے - اب بھی اگر کوئی چیز ہمارے اتحاد کا ذریعہ ہوسکتی ہے تو یہی ہے - اب بھی اگر ہمارے بکھرے شیرازے کو ایک رشتے میں منسلک کرسکتی ہے تو یہی ہے - اس کے قائم رکھنے میں ہماری سعادت مندی اور اس کے پھیلانے اور ترقی دینے میں ہماری قومی بہبودی ہے —

آپ کے صوبے کی زبان یو پی، پنجاب اور بہار کو چھوڑ کر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اردو سے قریب تر ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہزار رہا فارسی عربی کے لفظ آپ کی زبان میں رس بس گئے ہیں، فارسی زبان کا تسلط یہاں صدہا سال تک رہا ہے - عربی کی تعلیم اب تک جاری ہے، رسم خط تقریباً وہی ہے جو اردو کا ہے اور یہ سب سے بڑی سہولت ہے جو آپ کو حاصل ہے - جملے کی ترکیب اور ترتیب وہی ہے جو اُردو زبان کی ہے - آپ کے صوبہ میں سینکڑوں اردو کے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں - اُردو کے اخبار اور رسالے بھی نکلتے ہیں - مشاعرے بھی یہاں اسی دھوم دھام سے ہوتے ہیں جیسے ہندستان کے دوسرے شہروں میں - اس لیے آپ کو اس زبان کی تحصیل و اشاعت میں بہت سی آسانیاں حاصل ہیں جو ہندستان کے بعض دوسرے صوبوں کو حاصل نہیں - جب جنوبی آرکاٹ میں تلگو ونم اور شمالی آرکاٹ میں وانم باڈی اور نیلگری وغیرہ اضلاع کے لوگ اردو کو حاصل ہی

نہیں کرتے بلکہ اپنی مادری زبان کی طرح بولتے پڑھتے اور لکھتے ہیں تو میرے خیال میں اہل سندھ ان سے کہیں بہتر اس میں مہارت پیدا کرسکتے ہیں اور اگر وہ ذرا بھی اس طرف توجہ کریں گے تو چند ہی سال میں ان میں ایسے ایسے ادیب اور شاعر ہونے لگیں گے جیسے پنجاب، یوپی، بہار اور حیدرآباد دکن میں —

آپ نے سندھ پراونشل اردو کانفرنس کا اہتمام بڑی شان اور سلیقے سے کیا ہے - یہ بہت اچھا خیال ہے - اس کی سخت ضرورت تھی اور آپ کی یہ سعی قابل مبارک باد ہے - اس میں فصیح و بلیغ تقریریں ہوں گی، دلکش اور پُراثر نظمیں پڑھی جائیں گی، مفید اور ضروری ریزولیوشن پیش ہوں گے، اردو کی اشاعت و ترقی کی تجویزوں پر غور ہوگا، مشاعرے کی دھوم دھام ہوگی - بلا شبہ یہ تحریک بہت کارآمد اور قابل قدر ہے - اس سے اردو کا چرچا ہوگا، مطالعہ کا شوق بڑھے گا اور لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا - لیکن کیا آپ کی رائے میں ایک ایسی زبان کے لیے جسے آپ سارے ہندستان کی عام اور مشترک زبان خیال کرتے ہیں یا عام اور مشترک زبان بنانے کی آرزو رکھتے ہیں، اس قسم کے چند ہنگامے کردینے کافی ہوں گے؟

زمانے کی رفتار میں اس وقت غیر معمولی سرعت نظر آتی ہے - خود ہمارے ملک میں جو تغیرات گزشتہ چند سال سے رونما ہو رہے ہیں وہ کم حیرت انگیز نہیں ہیں - اس لیے اگر ہم اپنے مقصد کے حصول میں زیادہ تیزی، زیادہ مستعدی اور زیادہ تندہی سے کام نہ لیں گے تو ہم پہلے سے بھی پیچھے رہ جائیں گے —

اردو زبان کی اشاعت اور اردو ادب کی ترقی بجائے خود ایک

اہم مسئلہ ہے - اس معاملے میں ہر صوبے اور ہر علاقے کی حالت جدا جدا ہے اس لیے کام کی نوعیت میں بھی پوری یکسانی نہیں ہوگی - لیکن میں اپنے ذاتی تجربے نیز اُن اطلاعات کی بنا پر جو مجھے مختلف مقامات سے وصول ہوتی رہتی ہیں ' یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہر صوبے اور ہر علاقے میں کثرت سے لوگ اردو زبان کے سیکھنے کے خواہاں ہیں - لیکن کام کرنے والے نہیں اور کہیں ہیں تو یہ نہیں جانتے کہ کیا کیا جائے - اور کیونکر کیا جائے - دوسری مشکل یہ ہے کہ ہر جگہ اس کا رونا ہے کہ سرمایہ نہیں - انجمن ترقی اُردو (ہند) کے پیش نظر یہ مسئلہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی اشاعت کے لیے ہندستان کے ہر صوبے اور علاقے میں کیونکر تنظیم کی جائے - چنانچہ اس غرض سے اردو زبان کے جائزے کا کام شروع کیا گیا جس کا مقصد ان امور کا معلوم کرنا ہے کہ ہر صوبے اور ہر علاقے میں کتنے اُردو بولنے اور سمجھنے والے ہیں - کتنے اُردو لکھ، پڑھ سکتے ہیں' کتنے ایسے ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے - کتنے اُردو مدارس ہیں اور اردو پڑھنے والوں کی کیا تعداد ہے - کتنے کتب خانے ہیں ' کتنے اردو اخبار' رسالے اور مطبع ہیں' اردو نصاب تعلیم کی کیا حالت ہے - سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو کا کہاں تک دخل ہے - کون کون لوگ اُردو سے ہمدردی رکھتے اور اردو کی خدمت کرتے ہیں - غرض اسی قسم کے اور استفسارات ہیں جن کے جواب مہیا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے - ان سب کا منشا یہ ہے کہ ہم ہر صوبے اور علاقے کے مخصوص حالات پیش نظر رکھ کر وہاں کام شروع کریں - لیکن صدر انجمن کچھ نہیں کرسکتی اگر خود ان علاقوں کے لوگ اس کی مدد نہ کریں یا

اس کام میں اس کا ہاتھہ نہ بٹائیں - انجمن کی شاخیں ہر علاقے میں اسی غرض سے قایم کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات سے زیادہ باخبر اور اپنی ضروریات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں - صدر انجمن نے زبان کی اشاعت اور ترقی ادب کا خاکہ تیار کردیا ہے - اب یہ ہر شاخ کا کام ہے کہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے - البتہ یہ ضرور ہے کہ جب کوئی مشکل آپڑے گی یا ضرورت محسوس ہوگی تو صدر انجمن اپنی شاخوں سے تعاون کرنے اور امداد اور مشورہ دینے میں کبھی دریغ نہیں کرے گی —

عام طور پر شاخوں کے لیے یہ کام تجویز کیا گیا ہے : —

۱ - مناسب مقامات پر اُردو کے مکاتب قایم کرنا —

۲ - بالغوں کی تعلیم کے لیے مدارس شبینہ قائم کرنا —

۳ - لوگوں کے دلوں میں اردو زبان کی ضرورت اور اہمیت کا احساس پیدا کرنا —

۴ - مطبوعات انجمن ترقی اُردو وغیرہ کی اشاعت میں کوشش کرنا —

۵ - مختلف مقامات پر کتب خانے اور مطالعہ خانے قائم کرنا —

۶ - حسب ضرورت ادبی جلسے کرنا —

۷ - اپنے اپنے علاقے میں میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مدارس ، نیز سرکاری مدارس اور مکاتب میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا —

۸ - اپنے اپنے علاقے کے اچھے اردو لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنا —

۹ - اپنے اپنے علاقے کے سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اُردو زبان کے رواج کی کوشش کرنا —

۱۰ - مقامی ضروریات کے مطابق اردو کے تحفظ و ترقی کی مناسب تدابیر اختیار کرنا —

یہ شاخوں کے کام کا مجمل خاکہ ہے - اس بنیاد پر تفصیلی کام ہر ایک شاخ کو اپنے اپنے علاقے کے مخصوص حالات کے مطابق کرنا ہوگا —

کراچی میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ ایک مدت سے قایم ہے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے کچھہ کام نہیں کیا لیکن اس زمانے کے لحاظ سے اسے ابھی بہت کچھہ کرنا ہے - اس کے کام کی موجودہ رفتار بالکل ناکافی ہے - آپ نے جس شوق سے اس کام کی ابتدا کی تھی اسے انجام تک پہنچانے کے لیے پوری کوشش اور پوری قوت اور کامل تندھی کی ضرورت ہے —

یوں تو ہم میں سینکڑوں اختلافات موجود ہیں لیکن غالبا زبان ہی کا مسئلہ ایسا ہے جس میں ہم سب متفق ہیں مگر اختلافات پیدا ہوتے کچھہ دیر نہیں لگتی - اس لیے آپ کو ہر قسم کے اختلافات اور مشکلات کے مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے - کرنے کے قابل ایسے ہی کام ہوتے ہیں اور اسی میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں —

حضرات ! اگر آپ کو اپنی زبان عزیز ہے اور آپ اسے قومی زبان خیال کرتے ہیں تو اس کی ترقی کے لیے ایسی ہی کوشش کیجیے جیسے آپ اپنی زندگی کے لیے کرتے ہیں کیونکہ یہ ہماری زندگی کا جز ہے اور ہمارا تمدن اور تہذیب اور معاشرت اس سے وابستہ ہے —

اس لیے میں اپیل کرتا ہوں تمام اہل سندھ سے - میں اپیل کرتا ہوں تمام اردو کے بہی خواہوں اور ہمدردوں سے اور اپیل کرتا ہوں ملک و قوم کے ہوا خواہوں سے اور خصوصا مسلم ہوسٹل کے طالب علموں

سے کہ وہ اپنی قومی زبان کی اشاعت و ترقی میں دل و جان سے کوشش کریں اور سب سے آخر میں اور سب سے زیادہ زور اور ادب کے ساتھہ میں علمائے کرام اور مشائخان عظام کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے ارادتمندوں اور عقیدتمندوں کو اس طرف متوجہ کریں تاکہ ان کے اثر اور ہدایت کی بدولت زبان کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ ہمارے قومی اتحاد کو بھی استحکام اور ترقی نصیب ہو —

' ہندستانی '

(خطبہ جو آنریبل مسٹر یعقوب حسن نے ۲۹ دسمبر
سنہ ۱۹۳۷ ع کو دکھشنا بھارت ہندی پر چار سبھا کے
ساتویں جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر مدراس میں پڑھا) -

جدید معاشرت

اس وسیع براعظم کو جو افغانستان اور بلوچستان کے مشرق میں واقع ہے عربوں نے ' ہند ' اور ایرانیوں نے ' ہندستان ' کا نام دیا ' اِنھوں نے سندھ (دریائے سندھ کے علاقے) پنجاب (پانچ دریاؤں کے علاقے) اور راجپوتانہ (راجپوتوں کے وطن) میں کوئی امتیاز نہیں کیا بلکہ سب کے لیے انہوں نے ایک ہی نام کافی سمجھا - دھلی جو اس بڑے ملک کا دارالسلطنت بھی تھا سارے ملک کے لیے تمدنی و سیاسی مرکز بنا رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ ہندستان کا سارا افسوں اسی ایک نام سے جگا یا جاتا رہا کیونکہ دراصل دھلی کو ہندستان میں وہی درجہ حاصل ہے جو سلطنت روما میں روم کو حاصل تھا - پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں عربوں ' ایرانیوں اور مغلوں کے گروہ کے گروہ ہندستان میں وارد ہوتے رہے ' ان میں تجار بھی تھے اور صناع و دستکار بھی ' طالب علم اور علماء بھی تھے اور مذہبی مبلغ بھی ' ان میں بعض سیاح تھے اور بعض تلاش معاش میں جانباز قسمت آزما بن کر آئے ' ایک بڑی تعداد سپاہیوں کی تھی ' انھی میں وہ شریک تھے جو فاتح بن کر آئے

اور حاکم بنے لیکن ان سب نے هندستان آکر واپس جانے کا خیال تک چھوڑ دیا اور یہیں رس بس گئے، یہیں شادی بیاہ کیا اور یہیں ان کی نسلیں چلیں - ان مسلمانوں نے اپنا بدیسی قوم ہونے کا امتیاز بالکل مٹادیا اور بہت جلد هندؤں کے ساتھہ ایسے گھل مل گئے کہ نہ صرف یک رنگ اور هم نوع معلوم ہونے لگے تھے بلکہ خط و خال اور چہرے مہرے میں بھی متجانس ہوگئے - هندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کا لباس اختیار کرلیا اور ایک دوسرے کے رسوم و رواج اپنی معاشرت میں شامل کرلیے اور اس طرح معاشرت اور نظام ماند و بود میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہوا - یہ ایک واقعہ ہے هندستان کے باشندے جوق کے جوق اس طرح مسلمان نہیں ہوئے تھے جس طرح ترکستان، عجم، اور افغانستان کے باشندے بلکہ دور دراز کی دیسی ریاستوں میں جہاں نہ مسلمانوں کی فوجوں کا گذر ہوسکا تھا اور نہ وہاں ان کی حکومت تھی، اچھی خاصی تعداد میں لوگ مسلمان ہوگئے - خود میرا تعلق جس فرقے سے ہے یعنی کچھی میمن فرقہ، یہ در اصل لوھانا فرقے کی ایک جماعت تھی جس کو ایک برگزیدہ مسلمان بزرگ نے جن کا مزار کچھہ میں واقع ہے، دائرۂ اسلام میں شامل کیا تھا - خود هندو مت اسلام کے اصول وحدانیت کو نہ روک سکا، بلکہ خود اس سے بہت کچھہ متاثر ہوا - نہ صرف 'کبیر'، 'نانک'، 'دیانند سرسوتی'، اور 'رام موھن راے' کی تعلیم و تبلیغ سے سکھہ، آریا سماج اور برھمو سماج ایسے فرقے وجود میں آئے جن کا اصل اصول توحید ہے بلکہ اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال هندؤں کی ایک بڑی جماعت عقائد کے اعتبار سے موحد بن گئی جیسا کہ پہلے نہ تھا —

اردو

مسلمانوں کے دور حکومت تک فارسی درباری اور سرکاری زبان تھی، ہندو مسلمان دونوں اس کو بڑے استقلال اور محنت سے سیکھتے تھے اور عام طور سے اسی کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی بولی یعنی پراکرت نے فارسی سے متاثر ہوکر نیا چولا بدلا، اس کی درشتی جاتی رہی اور اس کے صوتی محاسن میں بہت اضافہ ہوا - سنسکرت کے حروف میں فارسی زبان سے خ، ز، اور ژ اور عربی زبان سے 'غ' اور 'ق' کے حروف شامل کرلیے گئے جن کی بدولت ہندستانی حروف تہجی اس قدر مکمل اور جامع ہوگئے کہ کوئی ایسی آواز باقی نہیں رہی جو دنیا کے کسی حروف تہجی کے ذریعہ ادا کی جاسکتی ہو اور ہندستانی حروف تہجی اس کو ادا کرنے سے قاصر رہیں - اس کے باوجود اوپر کے طبقوں میں فارسی ہی بول چال کی زبان رہی، لیکن بازاروں اور فوجی چھاؤنیوں میں جو نئی زبان بولی جانے لگی تھی اس کا نام اردو پڑگیا - اردو ترکی لفظ، چھاؤنی کا مرادف ہے - غرض اردو کی ابتدا اس طرح ہوئی - ادب کو چمکانے والے پہلے بھات ہوتے ہیں اور اس کے بعد اسے شائستہ بنانا شعرا کا کام ہوتا ہے - چنانچہ ولی دکھنی نے اردو میں پہلے پہل غزل کہنی شروع کی، اس کے ساتھ ہی ان تمام شعرا نے جو اس وقت تک فارسی زبان میں خیال آرائی کیا کرتے تھے اس کی تقلید شروع کردی اور بہت جلد ہندستانی شاعری فارسی شاعری کے بلند مرتبہ تک پہونچ گئی، حتیٰ کہ 'غالب' جو ہندستانی زبان کا شاعر ہے مشرق کا ایک بڑا شاعر تسلیم کیا جانے لگا - ابھی اسّی نوے برس پیشتر تک سرکاری دفتروں میں فارسی زبان ہی رائج تھی اور خانگی خط و کتابت بھی اسی زبان

میں ہوتی تھی ' اس لیے جب ہندستانی نے فارسی کی جگہ لی تو رسم الخط فارسی ہی کا باقی رہا کیونکہ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان دونوں بہ نسبت دیوناگری رسم الخط کے فارسی حروف سے زیادہ واقف اور مانوس تھے ' بنیے بقال اور مہاجن بیشک اپنے بہی کھاتے دیوناگری رسم الخط ہی میں لکھتے رہے - سندھی زبان کے لیے بھی عربی حروف کا ہی انتخاب کیا گیا اور تامل ناڈ کے مسلمان باشندوں نے تامل زبان کو انہی حروف میں لکھنا شروع کیا ' چنانچہ اس وقت بھی وہ تامل زبان کی کتابیں عربی رسم الخط میں لکھتے اور چھپواتے ہیں اور یہ عرب تامل کہلاتی ہے —

ہندستانی

عام طور پر اردو ابھی حال تک اردو قصبات اور شہروں میں بولی جاتی تھی اور دیہاتوں میں ہندی رائج تھی ' گویا ایک شہری زبان تھی اور ایک دیہی - لیکن جیسے ہی اردو زبان نے فارسی کو بالکلیہ نکال پھینکا تو مسلمانوں نے بھی اسلوب بیان میں سادگی اور سلاست اختیار کرلی ' فارسی عربی الفاظ سے عمداً اجتناب کرنے لگے ' لیکن ہندوؤں نے علمیت کے اظہار کی خاطر مسلمانوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ عربی و فارسی الفاظ اپنی تحریروں تقریروں اور گفتگو میں استعمال کرنا شروع کردیے ' چنانچہ اردو زبان میں عربی و فارسی کے جو اسقدر الفاظ نظر آتے ہیں اس کی یہی وجہ ہے اور اسی لیے اب لوگ ان الفاظ سے بہ نسبت ان کے سنسکرت و پراکرت مرادفات کے زیادہ مانوس ہوگئے ہیں - البتہ مسلمانوں کے علما اور مولوی لوگوں نے کہ جن کی تعلیم کا جزو اعظم فارسی کے بجائے قران و حدیث کی عربی تھی ' ایسی اردو لکھنا اور بولنا شروع کی جو خالص عربی آمیز تھی مگر ان کی تحریریں

عوام میں کبھی مقبول و معروف نہ ہوئیں - لیکن جب مولوی سر سید احمد خان بانی علی گڑھ کالج نے ایسی سلیس اور مقبول اردو میں اصلاح مذہب و معاشرت کا کام شروع کیا جو ہر شخص سمجھ سکتا اور پسند کرتا تھا تو یہ لوگ (علما) ان کا مقابلہ نہ کرسکے - سر سید اور ان کے رفقا نے اس طرح اردو کی بہت بڑی خدمت کی، اور خالص اردو کی نشو و نما کا صحیح طریقہ اختیار کیا اور اس کی ترقی میں جو کام ان لوگوں نے کیا وہ کوئی دوسری جماعت نہ کرسکی - ڈاکٹر نذیر احمد کی دو کتابیں 'مراۃ العروس' اور " بنات النعش " جو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے لکھی گئی تھیں، کئی نسلوں تک نصاب میں شریک رہیں - خالص اردو کی جتنی اچھی مثال مولانا حالی کی 'مناجات بیوہ' میں ملتی ہے اور کہیں نہیں ملتی - اس نظم نے ہزارہا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں سوز اور درد پیدا کیا اور اس سے عقد بیوگاں کی تحریک کو بڑی مدد ملی - اسی طرح نواب محسن الملک کی تقریروں نے اردو خطابت کا ایک ایسا بلند معیار قائم کیا کہ جس کی نظیر مللی مشکل ہے - پروفیسر ذکاء اللہ خاں نے سادہ سلیس زبان میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس ریاضیات اور اخلاق پر سوسے زائد کتابیں لکھیں، رتن ناتھ سرشار نے 'فسانۂ آزاد' میں اپنے زمانے کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی - یہ ضخیم ناول افسانہ کی سعیاری کتابوں میں سروانٹراسکات کی ویورلی ناولز کے سلسلے کے برابر جگہ پانے کی مستحق ہے - اس سارے ادب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو کسی رسم الخط میں بھی لکھا جائے اس کی غایت میں کوئی فرق نہ آئے گا —

هندستانی تہذیب

اب اگر ہم سنہ ۱۸۸۰ کے هندستان کا تصور کریں جب کہ باغ جنت میں سیاست کے سانپ نے گھس کر ہمارے قومی اتحاد میں پھوٹ نہیں ڈالی تھی تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جس طرح ساری دنیا میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی انسانوں کے دو گروہوں میں باہم اختلاط و ارتباط پیدا ہوا اور دونوں کو یک جا رہتے صدیاں گذر گئیں تو ان کے تمدن و تہذیب کی امتیازی خصوصیات ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں اور ایک نیا مشترکہ تمدن وجود میں آیا اور ایک نئی زبان پیدا ہوئی' وہی یہاں بھی ہوا کہ شمالی ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی الگ الگ قومیت فنا ہوگئی دونوں نے مل کر ایک متجانس قوم " هندستانی " کی بناء ڈالی اور 'هندستانی ان کی واحد مشترکہ زبان اور قومی تہذیب کا مشترکہ ذریعہ قرار پائی' اگرچہ اس کی ایک غلط تفریق غلط ناموں کے ساتھ کر دی گئی تھی یعنے شہری زبان کو 'اردو' اور دیہاتی زبان کو 'هندی' کہا جانے لگا - اس وقت هندستان خاص مشتمل تھا مشرقی پنجاب' دهلی' ممالک متحدہ' بہار' صوبجات متوسط کے شمالی علاقوں' وسط هند اور راجپوتانہ پر جس کی سرحد گجرات تک پہنچتی تھی - اگرچہ پنجاب میں روز مرہ کی زبان پنجابی تھی مگر تعلیم یافتہ اور مہذب طبقوں میں هندستانی ہی رائج تھی ——— شمالی سرحدی صوبہ اور سندھ میں بھی جہاں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں امید ہے کہ کم از کم یہ صورت حال بہت جلد پیدا ہوجائے گی ——— هندستانی مسلمانوں نے هندستانی زبان اور تہذیب کو مغرب میں گجرات' مہاراشٹر' کرناٹک اور مالیبار تک پہنچا دیا' جنوب میں آندھرا اور تامل ناڈ کے علاقوں

میں اور مشرق میں بنگال اور آسام تک پھیلا دیا - ان علاقوں کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا اور وہیں رس بس گئے، لیکن یہ جہاں کہیں بھی گئے ہندستانی زبان اور ہندستانی تمدن اپنے ساتھہ لیتے گئے اور وہاں ان کو رواج دیا - ان علاقوں کے اصلی مسلم باشندے بڑی تیزی سے ہندستانی زبان اور تہذیب کو جذب کر رہے ہیں کیونکہ وہ اس کو خالص اسلامی چیز سمجھتے ہیں اور اردو کو "مسلمانی" کہتے ہیں —

ہندستانی قومیت

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندستانی قومیت کی بنا اور اس کا ارتقا برطانوی حکومت اور انگریزی تعلیم کے رواج کی بدولت ہوا وہ سخت غلطی پر ہیں - ہندستان کو ایک واحد ملک کی حیثیت مسلمان کے دور اقتدار میں حاصل ہو چکی تھی جب کہ کشمیر سے لے کر جنوب میں ٹیپو سلطان کی سلطنت تک اور جونا گڑھ سے لے کر آسام تک سارا علاقہ ایک ہی شمار ہوتا تھا - ہندستانی قومیت بھی اسی مشترکہ زبان اور تہذیب کا نتیجہ ہے جو ہندستان کے ہر حصے پر چھائی ہوئی تھی اور جس کو مسلمانوں نے ملک کے ہر گوشے میں اپنے ساتھہ لے جا کر رائج کیا، اسی لیے مسلمان پھر ہندستانی صوبوں کے ہندوؤں کے مقابلے میں بجا طور پر یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ ان کا زاویۂ نگاہ اپنے صوبے تک محدود نہیں ہے بلکہ قومیت پسندی میں وہ ان سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں —

قومیت اور صوبہ پرستی

ان تمام ذرائع کی فہرست میں جو ہندستان جیسے وسیع ملک کی ایسی آبادی کو جو متعدد لسانی علاقوں میں منقسم ہے متجانس و متحد کرنے کے پیش کیے جا سکتے ہیں ایک مشترکہ زبان کا ذریعہ سر فہرست لکھا جائے گا، یہ سب سے زیادہ اہم اور قوی

ذریعہ ہے - خیر ہندستانی صوبے کے لوگ جب ہندستانی سیکھہ لیتے ہیں تو وہ صوبہ پرستی کے تنگ دائرہ سے نکل کر، قومیت کے وسیع اقلیم میں داخل ہوجاتے ہیں میں ان ایک سو پینتالیس حضرات کی خدمت میں جو اس سال اپنی سند کامیابی لینے کے لیے اس جلسۂ تقسیم اسناد میں شریک ہوے ہیں و نیز ان آٹھہ ہزار دو سو تیرہ بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں جنھوں نے امسال ہند کے تین ابتدائی امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے، بڑی مسرت اور خلوص سے "تاج محل" والا ہندستان پیش کرتا ہوں، وہ 'تاج محل' جو صدیوں کی مشترکہ تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا مرقع ہے اور جس میں اسلاف کے صدیوں کے اتحاد اور کارناموں کی جھلک اب بھی موجود ہے - اب وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ " ہنوز دلی دور است " —

ہندی ادبی زبان کی حیثیت سے

ہندی کو ادبی زبان بنانے کی کوشش ابھی زیادہ سے زیادہ پچاس سال سے شروع ہوئی ہے اور چونکہ اس کوشش کی ابتدا اور قومی کانگرس کی ابتدا ایک ہی زمانہ میں تقریباً ساتھہ ہی ساتھہ ہوئی اس لیے مسلمان اس تحریک کو بھی اسی طرح شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جس طرح کانگرس کو - اور بدقسمتی سے 'اردو' 'ہندی' کا تنازع موجودہ فضا میں اور بھی نقصان رساں ہوگیا ہے مگر یہ دیکھہ کر بیشک کسی قدر اطمینان ہوتا ہے کہ اس کو رفع کرنے اور دونوں زبانوں کے مبلغین کو کسی ایک نقطے پر متحد کرنے کی کوشش شروع ہوگئی ہے - چنانچہ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب متعمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اور بابو راجندرا پرشاد کے مابین حال ہی میں جو سمجھوتہ ہوا ہے اس نے ایک ایسی زبان کے لیے میدان تیار کردیا ہے جس کو

ہندو اور مسلمان دونوں کی زبان کہا جاسکے گا اس مفاہمت کی رو سے ہندستانی وہ زبان کہلائی جاے گی جو شمالی ہندستان میں مشترکہ طور پر سب سے زیادہ بولی جاتی ہے، لغت میں الفاظ کے داخل و خارج کرنے کا معیار رواج کو قرار دیا جاے گا اور ہندستانی کو ملک کی مشترکہ عام زبان بنانے میں ہندو مسلمان دوش بدوش کوشش کریں گے، یہ زبان اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاے گی اور تمام دفتری و تعلیمی کاموں میں اسی کو استعمال کیا جاے گا نیز اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو نشو و نما اور ترقی کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ اور اس کی بھی کوشش کی جاے گی کہ ہندی اور اردو کے اہل زبان باہم مشورے اور تعاون سے اساسی ہندستانی کی لغت مرتب کریں یہ بھی تجویز ہے کہ ایک مختصر سی نمایندہ کمیٹی اس غرض سے قائم کی جائے کہ وہ ایسی لغت مرتب کرنے کی عملی تجاویز پیش کرے نیز زبان کے متعلق دوسرے اہم مسائل مثلاً فنی اصطلاحات وغیرہ کا فیصلہ کرے۔

مدرسوں میں اردو کا رواج

آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آندھرا کے علاقے، اضلاع مفوضہ، شہر مدراس اور سالم، کوئمبتور، نیلگری اور ترچناپلی وغیرہ اضلاع میں مسلمانوں کے ابتدائی مدرسوں میں ہندستانی ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ صوبۂ مدراس کے تمام ثانوی مسلم مدارس میں ہندستانی دوسری لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے سنہ ۱۹۳۱ ع میں جو مسلم ایجوکیشن کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس کی سفارش کی بنا پر حکومت نے منظور کرلیا ہے کہ ایسے تمام ورنا کیولر مدارس میں جہاں مسلمان طلبہ کی کافی تعداد ہو ان کے لیے ہندستانی کی تعلیم کا بندوبست کیا جاے۔ حکومت نے یہ بھی

قرار دیا ہے کہ ان مقامات پر جہاں مسلمانوں کے جدا مدرسے نہیں ہیں وہاں دوسرے غیر مسلم مدارس میں مسلمان طلبہ کے لیے اردو پڑھانے کے واسطے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور ان مدارس میں مسلمان مدرسین کی مناسب تعداد مقرر کی جاے - چنانچہ معلمین کی تعلیم کے لیے کئی مدرسے اس غرض سے قائم کیے گئے ہیں کہ وہاں مدرسین کو تمام مضامین اردو زبان میں پڑھانے کی مشق کرائی جاتی ہے لیکن اگر ان اساتذہ کو ساتھ ہی ساتھ دیوناگری بھی پڑھائی جایا کرے تو وہ ان طلبہ کو بھی تعلیم دے سکیں گے جو ہندستانی کو ہندی رسم الخط کے ذریعہ سیکھنا چاہتے ہیں —

مجھے تامل اضلاع کے اپنے حالیہ دورے میں یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ مسلمان اردو کی تعلیم کے لیے تو اس قدر مصر ہیں لیکن بعض مسلم مدرسوں میں بھی اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے - علاوہ بریں ملیبار میں اردو پڑھانے والوں کی شدید مانگ ہے مگر مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ اس کو پورا کرنے کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں کی گئی میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کو جس کی ایک شاخ ابھی حال ہی میں مدراس میں بھی قائم ہوئی ہے اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ صرف مدراس کے مسلم و دیگر مدارس میں اردو پڑھانے والوں کا انتظام کرے بلکہ اس کا بھی اہتمام کرے کہ لوگ اپنی فرصت کے اوقات میں ہندستانی کی تعلیم حاصل کرسکیں - مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ وہ طریقہ جو ان طلبہ کو ہندستانی لکھنا پڑھنا سکھانے میں اختیار کیا جاسکتا ہے جن کی مادری زبان ہندستانی ہے ان طلبہ کے لیے مناسب نہ ہوگا جو ہندستانی کو محض اجنبی

زبان کی حیثیت سے بالکل ابتدا سے سیکھنا شروع کریں گے اور یہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کے لیے جو درسی کتابیں ہوں گی وہ موخرالذکر کے لیے موزوں ثابت نہ ہوں گی —

ثانوی مدارس میں ہندستانی کی تعلیم

میں نے شروع سے ہی ہندی پرچار کی تحریک کو خوش آمدید کہا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس ذی اثر ادارہ کی کوششوں کی بدولت مدراس میں ہندستانی زبان اچھی طرح رواج پا جائے گی اور میں اس کامیابی پر جو اس تھوڑے ہی عرصہ میں ہوئی ہے اس کے کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں' حال ہی میں مدارس کی کانگرسی کابینہ نے یہ طے کیا ہے کہ تمام مدارس میں اردو اور ہندی دونوں رسم الخط کے ساتھ 'ہندستانی' کو لازمی مضمون قرار دیا جائے - اس اقدام سے مسلمانوں کی اس کوشش میں بھی کہ پورے صوبہ مدراس میں مسلمانوں کے تمدنی ارتقا کے لیے اردو کو ذریعہ بنائیں بڑی مدد ملے گی علاوہ بریں حکومت کے اس اقدام کی بدولت مسلمانوں کو تامل ناڈ' کناڑا' کرالا اور آندھرا کے اضلاع میں ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے اور ان سے ربط بڑھانے میں بھی بہت مدد ملیگی بلکہ شمال اور جنوب کے باشندوں میں فی الوقت جو اجنبیت سی پائی جاتی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی - میں اس تجویز کو ان لوگوں کے غور کے واسطے پیش کرتا ہوں جن کو اس مسئلہ سے خاص طور پر دلچسپی ہے —

ہندستانی کلچر سوسائٹی

میری رائے میں انجمن ترقی اردو اور ہندی پرچار سبھا کو اس مشترک مقصد کے حصول میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا چاہیے کہ ہندستانی کو سارے ملک کی مشترکہ

قومی زبان بنا دیا جاے ' میں ایک عرصہ سے اس فکر میں تھا کہ مدراس میں ایک ہندستانی کلچر سوسائٹی قایم کروں مگر اب وقت آگیا ہے کہ میری یہ دیرینہ تمنا پوری ہو —

میری راے میں طلبہ کی حد تک رسم الخط کا انتخاب اختیاری رکھا جائے مگر مدرسین کو دونوں رسم الخط سے واقف ہونا ضروری ہونا چاہیے - اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو اور ہندی زبانوں میں فی زمانا جو بہترین کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی ان سے وہ ہندو اور مسلمان دونوں استفادہ کرسکیں گے جو اپنے رسم الخط کے علاوہ دوسرے رسم الخط سے بھی واقف ہیں —

ہندستانی یونیورسٹی

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ہی حقیقی معنوں میں ایک ایسی جامعہ ہے جس کو صحیح طور سے ہندستانی جامعہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ وہاں ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے - اور اب بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ بنارس کی ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کے بجائے ہندستانی ہی ذریعۂ تعلیم ہو جائے گی اور یہ تینوں جامعات مل کر مستقبل کے عظیم تر ہندستان کے لیے اس کے شایان شان تمدن کا گہوارہ بنیں گی —

فرقہ واری اتحاد

میرا ایک خوشگوار فریضہ یہ بھی ہے کہ دکھشنا بھارت ہندی پرچار سبھا کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے اس عام جلسہ میں ایک ایسے موضوع پر خطاب کرنے کا موقعہ ملا جو مجھے بہت ہی عزیز ہے مجھے امید ہے کہ میرے اس خطبہ کو جو ایک پر خلوص دل کی صدا ہے ' ہندو اور مسلم دونوں اسی نظر سے دیکھیں گے - ساتھ ہی میری استدعا ہے کہ اس صوبے کے ہندو مسلمان آپس میں ایسے مناقشات و تعصبات

کو جگہ نہ دیں جن کا رنگ اور اثر شمالی ہند کی بعض تحریکوں میں بری طرح نمایاں ہے - نیز ہندستانی کی اشاعت سے ہمارا مقصد صرف یہ نہ ہونا چاہیے کہ ملک کے تمام صوبوں کے باشندوں کو ایک رشتہ میں منسلک کردیں بلکہ ہمارا بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہر صوبے کے مختلف فرقوں میں باہم اتحاد و محبت پیدا کردیں —

آخر میں میں اپنے تمام ہندو اور مسلمان دوستوں سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں " ہندستانی " کا لفظ استعمال کیا کریں تاکہ یہ معلوم ہو کہ جس زبان کی اشاعت اور ترقی مقصود ہے وہ ایک مشترکہ قومی زبان ہے اور کسی خاص رسم خط کی ترقی یا فروغ پیش نظر نہیں ! —

افکار و واقعات

۱ - الہ آباد کی شاخ

(از ادیٹر)

وسط دسمبر میں مجھے الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا - آل انڈیا اردو کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں یہ طے ہوا تھا کہ الہ آباد میں انجمن کی ایک مرکزی شاخ قائم کی جائے - اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی اور مولوی خلیل الرحمن صاحب کے مشورے سے بعض صاحبوں کو اس بارے میں گفتگو کرنے کے لیے مدعو کیا گیا - اس جلسے میں بیس صاحب شریک تھے - کچھ دیر تک انجمن ترقی اردو اور اس کی مرکزی شاخ قائم کرنے پر گفتگو رہی —

۱ - علی گڑھ کی اردو کانفرنس میں طے ہوا تھا کہ صوبۂ متحدہ میں تین مرکز قائم کیے جائیں (الہ آباد ، لکھنؤ اور علی گڑھ) ، مگر اضلاع کی تقسیم نہیں کی گئی تھی - بعد کافی بحث کے یہ قرار پایا کہ الہ آباد کے مرکز سے متعلق حسب ذیل ضلعے ہوں گے : -

الہ آباد ، کان پور ، فتح پور ، جھانسی ، اورئی ، باندہ ، ہمیر پور ، مرزا پور ، بنارس ، اعظم گڑھ ، غازی پور ، جون پور ، بلیا ، گورکھ پور اور بستی —

۲ - قرار پایا کہ مناسب ہوگا کہ اگر لکھنؤ اور علی گڑھ کی تقسیم حسب ذیل ہوگی :-

(ا) لکھنؤ، اناؤ، رائے بریلی، پرتاب گڑھ، سلطان پور، فیض آباد، گونڈہ، بارہ بنکی، کھیری (لکھیم پور) سیتا پور اور ہردوئی -

(ب) علی گڑھ، متھرا، آگرہ، ایٹہ، بلند شہر، اٹاوہ، فرخ آباد، مین پوری، مظفر نگر، بجنور، سہارن پور، بدایوں، مراد آباد، بریلی، پیلی بھیت، شاہ جہاں پور، نینی تال، الموڑا، گڑھوال، ڈیرہ دون اور میرٹھ —

۳ - قرار پایا کہ ضلع الہ آباد میں اردو سروے کا کام فوراً شروع کردیا جائے - کچھ اصحاب منتخب کیے جائیں کہ وہ دیہات میں جاکر ہر مقام کے متعلق دریافت کریں کہ وہاں کون کون سے مدرسے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے یا نہیں؛ اور اگر ہے تو کیا انتظام ہے - اردو کے طالب علموں کے لیے کیا سہولتیں ہیں اور کیا دقتیں یا موانع - سروے کا کام جہاں تک جلد ہو سکے ختم کیا جائے؛ مگر کسی حالت میں تین مہینے سے زیادہ نہ گزرنے پائیں-

۴ - قرار پایا کہ اردو نصاب کی کتابیں جو آج کل اس صوبے میں رائج ہیں ان کا ایک ایک نسخہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمت میں بھیجا جائے تاکہ صدر انجمن ترقی اردو ان پر تنقید کرے -

۵ - بعد بحث کے قرار پایا کہ اردو لکھنے پڑھنے کی تعلیم چھے ہفتے کی مدت میں بہ آسانی دی جاسکتی ہے - اس سلسلے میں ایک ذیلی کمیٹی قائم کی گئی جس کے رکن حسب ذیل اصحاب مقرر کیے گئے-

(ا) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب -

(۲) مفتی فخر الاسلام صاحب -

(۳) مولوی ظفر احمد صاحب انصاری -

۶ - اس جلسے میں انیس اردو الہ آباد کے معتمد اور متعدد اراکین موجود تھے، جن سے معلوم ہوا کہ یہ انجمن اردو ادب اور زبان کے لیے مفید کام کر رہی ہے - اور اگر انجمن ترقیٔ اردو اسے اپنی شاخ بنانا پسند کرے تو غالباً انجمن انیس اردو کی انتظامی کمیٹی اسے پسند کرے گی - اس بنا پر انجمن ترقی اردو کی طرف سے ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے انجمن انیس اردو کو دعوت دی کہ وہ بطور انجمن ترقیٔ اردو کی شاخ کے کام کرے - انجمن انیس اردو کے معتمد اختر حسن صاحب نیز اس کے رکن انتظامی مفتی فخرالاسلام صاحب نے یہ کام اپنے ذمے لیا کہ وہ اس کی تحریک انجمن انیس اردو کی انتظامی مجلس میں کریں گے -

۷ - حسب ذیل اصحاب انجمن اردو، شاخ انجمن ترقیٔ اردو کے انتظامی کمیٹی کے رکن تجویز کیے گئے؛ مگر الحاقی کارروائی کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا قطعی فیصلہ ملتوی رکھا گیا -

(۱) صدر　　مولوی مقبول احمد صاحب صمدانی -

(۲) نائب صدر　　مولوی سید حبیب احمد صاحب -

(۳) معتمد　　مولوی محمد خلیل الرحمن صاحب -

(۴) نائب معتمد　　مولوی سید اختر حسن صاحب -

(۵) ایک نمائندہ مسلم ہوسٹل کا جو وہاں کی یونین منتخب کرے گی -

(۶) مولوی محمد نعیم الرحمن صاحب پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی -

(۷) مولوی عبدالحفیظ صاحب، معلم گورنمنٹ کالج -

(۸) مفتی فخر الاسلام صاحب -

(۹) مجیب الرب صاحب -

(۱۰) حمید اللہ صاحب -

(۱۱) ظفر احمد صاحب انصاری -

۸ - جو صاحب اس جلسے میں شریک نہ تھے انہوں نے مختلف اضلاع کے بعض ایسے اصحاب کے نام لکھوائے جن سے یہ توقع ہے کہ وہ انجمن کے کام میں ہر طرح مدد دیں گے —

مسلم ہوسٹل کی دعوت پر میں وہاں کے طلبہ سے ملا - اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب اور میں نے طلبہ سے انجمن کے مقاصد کے متعلق گفتگو کی - طلبہ نے کام کرنے کی آمادگی ظاہر کی اور ان طلبہ کی فہرست مہیا کرنے کا وعدہ کیا تو تعطیلات میں اپنے اپنے ضلع میں کام کریں گے - کام کی نوعیت سے بھی انہیں آگاہ کیا گیا -

۲- سندھ میں اشاعت اردو

اس مرتبہ میں نے تقریباً دو ہفتے کراچی کے سفر اور قیام میں صرف کیے - میرا قیام کراچی میں دس روز رہا - انہیں ایام میں سندھ پراونشل اردو کانفرنس کے بھی اجلاس ہوے جس کی مختصر روئداد آگے آئے گی - اسی قسم کی کانفرنسیں اکثر ہوتی رہتی ہیں - عموماً کانفرنس کے بانیوں اور داعیوں کی نیت نیک ہوتی ہے - تجویزیں اور قرار دادیں بھی معقول ہوتی ہیں' تقریروں اور بحثوں سے گرمجوشی بھی پیدا ہوجاتی ہے - مل کر کام کرنے کا تجربہ بھی ہوجاتا ہے اور معلومات میں بھی کچھہ نہ کچھہ اضافہ ضرور ہوتا ہے' لیکن کانفرنس ختم ہونے

کے بعد سارا جوش بھی ختم ہوجاتا ہے - لوگ کانفرنس کے ہنگامے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کس مقصد سے کی گئی تھی اور اس کے بعد بھی کچھہ کرنا ہوگا - ہمارے کاموں میں ناکامی اکثر اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم ذریعہ کو مقصود بالذات سمجھہ لیتے ہیں - اس لیے ہم نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ کانفرنس میں قرار دادیں زیادہ نہ ہوں صرف چند ہوں جو ضروری اور قابل عمل ہوں اور پھر منظور ہونے کے بعد اُن پر فوراً عمل بھی شروع کردیا جاے - چنانچہ اسی غرض سے میں کانفرنس کے بعد بھی کراچی میں ٹھیرا رہا، مقامی حالات سے واقفیت حاصل کی اور وہاں کے با اثر اور معزز اصحاب سے ملاقاتیں کی اور بہت کچھہ غور و فکر کے بعد سندھ میں اردو کی اشاعت کے لیے مفصلہ ذیل اصحاب کی ایک مختصر مجلس قائم کی —

جناب خان صاحب بابو فضل الٰہی صاحب (صدر)

جناب شیخ عبدالمجید صاحب پارلیمنٹری سکرٹری لیجس لیٹیو کونسل صوبہ سندھ —

جناب ڈاکٹر حاجی عبدالمجید صاحب

جناب سیٹھہ طیب علی صاحب علوی

جناب مولانا محمد صادق صاحب فاضل دیو بند

جناب　　شعبان صاحب ایم - ایل - سی

جناب حاتم اے علوی صاحب (معتمد)

یہ سب صاحب اپنے اثر اور عمل کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں اور اِس کام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور کام کرنے کے لیے آمادہ ہیں - حاتم علوی صاحب معتمد مجلس کی مدد کے لیے ایک تنخواہ دار

مددگار بھی دیا - اس لیے محمد مجتبیٰ صاحب کا انتخاب کیا گیا جو اپنی مستعدی اور فرض شناسی کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں - اس مجلس کی ترتیب کے بعد عملی کارروائی بھی فوراً شروع کردی گئی اور مجھے پوری امید ہے کہ سندھ میں اشاعت اردو کے متعلق جو تدبیریں سوچی گئی ہیں اس میں ہمیں ضرور کامیابی ہوگی —

کراچی میں انجمن کی ایک شاخ تقریباً اٹھارہ سال سے قائم ہے اور اس کا ایک کتب خانہ اور مطالعہ خانہ بھی ہے - اور وہ ادبی جلسے اور مشاعرے بھی کرتی رہتی ہے لیکن بعض وجوہ سے وہ کراچی سے باہر کام کرنے سے قاصر ہے اس لیے اس کام کے لیے ایک خاص مجلس قائم کرنے کی ضرورت واقع ہوئی —

ایک شب کو مسلم ہوسٹل کے طلبہ نے مجھے مدعو کیا - میں نے اپنے مقصد کے متعلق اُن کے سامنے تقریر کی اور بعض طلبہ سے اس بارے میں گفتگو رہی جنھوں نے اردو کی اشاعت کے لیے کام کرنے کا وعدہ کیا -

میں بابو فضل الٰہی صاحب، شیخ عبدالمجید صاحب، سیٹھ طیب علی علوی صاحب، حاتم اے علوی صاحب، مولوی نورالحق صاحب، خان بہادر محمد دین صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے مشورے وغیرہ سے مجھے اس کام میں بہت مدد دی —

سندھ پراونشل اُردو کانفرنس

(کراچی)

ہم ۳۰ دسمبر کو کراچی میل کے ذریعے کراچی سٹی سٹیشن پر پہنچے - استقبالیہ کمیٹی کے ارکان پلیٹ فارم پر موجود تھے انھوں نے نہایت شاندار

استقبال کیا - خاں صاحب بابو فضل الٰہی گورنمنٹ کنٹریکٹر کے مکان پر ہمیں ٹھیرایا گیا - دن بھر مقامی لوگ آتے جاتے رہے - شام کو مقامی حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک خاص اجلاس کا انعقاد ہوا جس میں شیخ عبدالمجید صاحب ایم ایل اے - خان بہادر محمد دین صاحب اسسٹنٹ انجینیر - مولوی دین محمد صاحب وفائی ایڈیٹر "الوحید" - ڈاکٹر حاجی عبدالمجید صاحب صدیقی - مولانا نورالحق صاحب ندوی پروپگنڈ سکرٹری کانفرنس سیٹھ فدا حسین محمد علی کوئٹہ والے اور چند دیگر اصحاب نے شرکت فرمائی - پورے ایک گھنٹہ کی گفتگو کے بعد کانفرنس کے غور کے لیے تجاویز کا خاکہ تیار کیا گیا —

۳۱ دسمبر سنہ ۳۷ ع کو تین بجے سہ پہر خالقدینہ ہال میں کانفرنس کا پہلا اجلاس شروع ہوا - مسٹر عبدالرب نے "اُردو زبان ہماری" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی - محمد ہاشم صاحب گزدھر ایم ایل اے صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبہ پڑھا - گزدھر صاحب کی تحریک اور شیخ عبدالمجید صاحب کی تائید سے مولانا عبدالحق صاحب صدر جلسہ منتخب ہوے - راؤ بہادر شیورتن مہاتر نے اُردو میں تقریر کرتے ہوے مولانا کو پھولوں کا ہار پہنایا - صدر مجلس استقبالیہ نے ان اصحاب کی طرف سے آئے ہوئے پیغامات پڑھ کر سنائے جو اپنی بعض دیگر مصروفیتوں وغیرہ کی بنا پر کانفرنس میں شرکت نہ فرما سکے - مندرجہ ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں :- (۱) سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیر اعظم صوبہ سندھ - (۲) ہز ہائی نس سر آغا خان - (۳) سر عبداللہ ہارون - (۴) سید سلیمان ندوی - (۵) دیانرائن صاحب 'نگم' ایڈیٹر "زمانہ" کانپور - (۶) وزیر صاحب ریاست خیرپور —

مولانا عبدالحق صاحب نے خطبۂ صدارت پڑھا جو حاضرین کے لیے ایک زبردست پیغام عمل تھا - بعدہ سبجکٹ کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا —

شرکائے کانفرنس کی تفریح طبع کے لیے دوسرا اجلاس ۹ بجے شب طرحی مشاعرہ کی صورت میں رکھا گیا تھا جو علامہ سیماب اکبرآبادی کی صدارت میں ساڑھے گیارہ بجے تک رہا - بہت سے مقامی شعرا نے حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا —

یکم جنوری سنہ ۱۹۳۸ ع - صبح گیارہ بجے سبجکٹ کمیٹی کا خاص اجلاس شروع ہوا - آٹھ ریزولیوشن مرتب کیے گئے مختلف اصحاب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا —

دوسرا اجلاس تین بجے سہ پہر کو شروع ہوا - پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ 'کیفی' نے اپنی ایک خاص مسدس سناکر اجلاس کا افتتاح فرمایا - تمام ریزولیوشن یکے بعد دیگرے مدلل اور موثر تقاریر کے ذریعے بالاتفاق منظور ہوئے —

تیسرا اجلاس غیر طرحی مشاعرہ پر مشتمل تھا جناب کیفی کی صدارت میں نو بجے شب منعقد ہوا - مقامی شعرا نے اپنا اپنا کلام سنانے کے بعد حضرت 'کیفی' سے درخواست کی کہ وہ بھی حاضرین کو اپنے ارشادات سے مستفیض فرمائیں چنانچہ انہوں نے اپنی بیاض سے بعض چیدہ چیدہ نظمیں سنائیں جو نوجوانوں کے لیے خضر راہ کا کام دیتی تھیں —

سندھ پراونشل اردو کانفرنس

کراچی

کے اجلاس منعقدہ یکم جلوری سنہ ۱۹۳۸ ع میں مندرجۂ ذیل
ریزولیوشن بالاتفاق منظور ہوئے

۱ - سندھ پراونشل اردو کانفرنس کا یہ اجلاس سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر) کے انتقال پر دلی جذبات رنج والم کا اظہار کرتا ہے - مرحوم اپنی وجاہت ، اعلیٰ قابلیت اور قومی ہمدردی اور مخصوص خصوصیات کی وجہ سے ہماری قوم کے بے نظیر شخص تھے - ان کی بے وقت وفات سے ملک اور قوم کو اور خصوصاً آل انڈیا انجمن ترقی اردو کو جس کے وہ صدر تھے سخت نقصان پہنچا ہے - کانفرنس کا یہ اجلاس ان کی والدہ ماجدہ اور ان کے فرزندوں اور عزیزوں سے اس صدمہ میں دلی ہمدردی رکھتا ہے —

محرک :— خان بہادر محمد دین صاحب اسسٹنٹ انجنیر

موید :— مولوی ثناء اللہ خاں صاحب

تمام حاضرین جلسہ نے کھڑے ہوکر اس رزولیوشن کو منظور کیا —

۲ - اِس کانفرنس کی رائے میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے اضلاع میں جس قدر عربی مدارس موجود ہیں ان سب کی مکمل فہرست تیار کی جائے اور ان مدارس کے مہتمم صاحب کی توجہ اس طرف منعطف کرائی جائے کہ وہ اردو زبان کی تعلیم کو بھی اپنے نصاب میں داخل کریں —

محرک :— ڈاکٹر حاجی عبد المجید صاحب صدیقی

موید :— مولانا محمد صادق صاحب فاضل دیوبند

مؤید تائید :— مولانا نور الحق صاحب ندوی

۳ - یہ کانفرنس حسب تحریک آل انڈیا انجمن ترقی اردو یہ مناسب اور ضروری خیال کرتی ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو سندھ کے تمام اضلاع میں انجمن کی شاخیں قایم کی جائیں اور ہر مقام کے حالات کے مطابق اسی "طریق کار" کو عمل میں لانے کی کوشش کی جائے جو صدر انجمن نے اپنی شاخوں کے لیے مرتب کیا ہے —

محرک :— مولوی ثناء اللہ خاں صاحب

موید :— ملک حاجی عبد العزیز صاحب

۴ - یہ کانفرنس مسلم ہوسٹل کے طلبہ سے استدعا کرتی ہے کہ جب وہ اپنے اپنے مقامات اور دیہات میں جائیں تو وہاں کے لوگوں کو اردو زبان کے حاصل کرنے کا شوق دلائیں - یہ کانفرنس حسب ضرورت ان کو ہر قسم کی مدد دینے میں کوشش کرے گی —

محرک :— جناب محمد ہاشم صاحب گزدھر ایم ایل اے

موید :— خان بہادر محمد دین صاحب اسسٹنٹ انجنیر

۵ - سنہ ۱۹۲۹ ع میں بذریعۂ ریزولیوشن نمبر ۲۱۲ کراچی میونسپل اسکول بورڈ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندی اور اردو کو بطور اختیاری مضمون تمام میونسپل پرائمری مدارس میں رائج کیا جائے - اس ریزولیوشن کی تعمیل کرتے ہوئے افسران اسکول بورڈ نے ہندی کی تعلیم تو فوراً جاری کردی لیکن اردو کی تعلیم کا اب تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا - لہذا یہ کانفرنس میونسپل اسکول بورڈ سے

استدعا کرتی ہے کہ جلد از جلد اس تجویز پر عمل درآمد شروع کرکے غیر اردو مدارس میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرے —

محرک :— جناب غلام علی صاحب الانا

موید :— حافظ شریف حسین صاحب

۶ - یہ کانفرنس اردو زبان کی اشاعت اور ترقی کے لیے نہایت ضروری خیال کرتی ہے کہ سندھ کے مشائخ اور علمائے کرام سے اس قومی کام میں مدد لی جائے-

محرک :— پیر غلام مرتضیٰ صاحب سرہندی

موید :— ماسٹر محمد رشید صاحب

۷ - یہ کانفرنس سررشتۂ تعلیم صوبۂ سندھ سے درخواست کرتی ہے کہ جن ہائی اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں اردو کی تعلیم کے لیے اسی طرح علحدہ مدرسین مقرر کئے جائیں جس طرح عربی فارسی اور دیگر مضامین کے لیے مقرر ہیں کیونکہ موجودہ انتظام میں اردو کے لیے الگ مدرسین نہیں ہیں جس کی وجہ سے اردو کی تعلیم ناقص رہ جاتی ہے —

محرک :— حکیم فتح محمد صاحب سیوہانی

موید :— سیٹھ فدا حسین محمد علی کوئٹہ والے

۸ - یہ کانفرنس گورنمنٹ سندھ سے درخواست کرتی ہے کہ لیاری کوارٹر میں جس طرح لڑکوں کے لیے جبری تعلیم کے احکام نافذ ہیں اور ان سے بہت حد تک کامیابی ہوئی ہے اسی طرح تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے لڑکیوں کی جبری ابتدائی تعلیم کا نفاذ بھی کیا جائے —

محرک :— مریم زمانی بیگم حافظ شریف حسین صاحب

موید :— لیڈی ڈاکٹر حوّا باقی صاحبہ

مزید تائید :— سیٹھ طیب علی صاحب علوی

۳ - مدراس گورمنٹ اور ھندی کی اشاعت

آنریبل مسٹر بی - گوپال ریڈی ' وزیر لوکل سیلف گورمنٹ نے سملم (علاقۂ مدراس) میں آل سوتھہ انڈیا ھندی پرچارک کانفرنس کا افتتاح کرتے وقت فرمایا - " ھندی کی تعلیم نہ صرف زبان کی اشاعت کا ذریعہ ھوگی بلکہ قومی استحکام کا بھی موجب ھوگی " - نیز انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ مدراس میں ھندی کے رواج دینے کی اسکیم مرتب کی جارھی ھے اور مجھے یقین ھے کہ جو اصحاب اس جلسے میں حاضر ھیں وہ گورمنٹ کی اس تجویز کی پوری پوری تائید کریں گے - مجھے قوی امید ھے کہ ھندی کے جھنڈے کے نیچے ھم سب ایک ھوجائیں گے اور متفقہ طور پر قومی استحکام کے لیے کام کریں گے —

مسز امب جوم مل (دختر مسٹر ایس - سری نواس آیئنگار) نے جو اس جلسے کی صدر تھیں فرمایا - " اب کہ وزارت مدراس نے ھندی کو مدرسوں میں لازم قرار دیدیا ھے ' لہذا ھمارا فرض ھے کہ ھم حکومت کی مساعی میں اس کے ساتھہ پورا پورا تعاون کریں " - (سندھ آبزرور)

ایک طرف تو انڈین نیشنل کانگریس کا یہ فیصلہ ھے کہ ملک کی زبان ھندستانی ھوگی اور دوسری طرف اس کی سب سے زبردست حکومت ھندی کو مدارس میں لازمی اور جبری بنانے کی کوشش کررھی ھے - یہ عجب قسم کا دوغلہ پن ھے - مدراس گورمنٹ نے پہلے بھی اسی قسم کی حرکت کی تھی اور اس پر بہت شور غل مچا تھا تو وزیر اعظم سی گوپال چاریار نے اپنا بیان شایع کیا لیکن وہ بالکل نا کافی تھا - انھوں نے

اطمینان دلایا تھا کہ مسلمان طلبہ کو ناگری رسم خط استعمال کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا - یہ گویا مسلمان طلبہ کے حق میں بہت بڑی رعایت فرمائی ہے - میں نے اس بارے میں سیٹھہ یعقوب حسن کو لکھا - جس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ " مسٹر سی گوپال چاریار اور وزیر تعلیم ڈاکٹر سبارایین نے صاف طور پر یہ اعلان کردیا ہے کہ ہندستانی کی تعلیم لازمی ہوگی - ہندی دیوناگری رسم خط کے ساتھہ ہندؤں اور دوسروں کے لیے اور اردو فارسی رسم خط کے ساتھہ مسلمانوں کے لیے " - یہاں سیٹھہ یعقوب حسن نے بھی دوسرے مدراسیوں کی طرح ہندی ' ہندستانی اور اردو کو خلط ملط کردیا ہے - میرا کہنا یہ ہے کہ کسی کانگریس حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے صوبے میں ہندی کی اشاعت کرے - اردو اس صوبے میں کئی صدی سے رائج ہے اور مسلمان آبادی کی ایک تعداد کثیر کی مادری زبان ہے اور سررشتۂ تعلیم نیز گورمنٹ نے اسے صوبۂ مدراس کی دیسی زبانوں میں تسلیم کرلیا ہے - لیکن ہندی اس صوبے کی زبان کبھی تھی نہ ہے اور اس بنا پر اس کا مدارس میں لازمی اور جبری طور پر داخل کرنا قطعی ناجائز ہے - کہتے ہیں کہ انسان کے قول و فعل میں مطابقت ہونی چاہیے - لیکن شاید سیاست میں یہ رسم نہیں ہے - اور خاص کر مدراسی سیاست میں —

۴ - سیٹھہ یعقوب حسن اور اُن کا خطبۂ صدارت

(ہندی پرچار سبھا میں)

سیٹھہ یعقوب حسن صاحب مدراس حکومت کے وزرا میں سے ہیں -

انہوں نے حال ہی میں "دکشنا بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس" کے ساتویں جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت فرمائی اور خطبۂ صدارت پڑھا جس کا ترجمہ ہم نے اسی رسالے میں کسی دوسری جگہ درج کیا ہے - اگرچہ اس خطبے میں کہیں کہیں واقعات کی خفیف غلطیاں ہیں لیکن انہوں نے بڑی خوبی سے اردو ہندی اور ہندستانی کی اصل اور ان کے تعلقات کو بتایا ہے —

خطبے کے آخری حصے میں انہوں نے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ مدراس کی کانگریس کیبینٹ نے یہ طے کیا ہے کہ ثانوی مدارس میں ہندستانی زبان (ہندی اور اردو رسم خط کے ساتھ) لازمی قرار دی جائے - اس بیان میں ہندی اردو رسم خط کے الفاظ مبہم ہیں - آیا اس کا یہ مطلب ہے کہ طلبہ کو دونوں رسم خط سکھائے جائیں یا ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جاے گا کہ جس رسم خط کو چاہیں اختیار کریں - ان کا مطلب غالباً یہو ہے کہ رسم خط کا معاملہ طلبہ کی مرضی پر منحصر ہوگا - یہ اندیشے سے خالی نہیں - کیونکہ مدارس میں اکثر و بیشتر اور بعض صورتوں میں سب کے سب ہندو مدرس ہونگے ' ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی جماعتوں کے مسلمان طلبہ کو اردو رسم خط سکھائیں گے ' ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے - اِس کا یہ جواب دیا جائیگا کہ مدرسین کو ٹریننگ اسکولوں میں رسم خط کی تعلیم دی جاے گی - یہ جواب بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا عمل میں آنا مشکل ہے - اس میں کئی مشکلیں ہیں - ایک تو یہ کہ آیا ٹریننگ اسکولوں میں اردو رسم خط کی ایسی کافی تعلیم دی جاے گی کہ مدرس اردو کے طلبہ کو بخوبی تعلیم دے سکیں - دوسری مشکل یہ ہے کہ آیا وہ اردو رسم خط کی تعلیم

اُسی شوق سے دیں گے جیسے ہندی رسم خط کی - تیسری مشکل ہندستانی زبان کے نصاب کی ہے - یہ تو ثانوی مدارس کا ذکر ہے - تحتانی اور وسطانی مدارس میں کیا ہوگا یہ کچھہ معلوم نہیں - غالباً اس کے لیے موجودہ صورت برقرار رہے گی - یعنے اردو کے مدارس جدا ہونگے اور دوسری دیسی زبانوں (تامل، تلنگی، ملیالم) کے جدا - بہر حال مدراس حکومت کو یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان کے صوبے میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کی مادری زبان اردو ہے اور تقریباً کل مسلمان اردو کو اپنی قومی سمجھتے ہیں اور اس کے پڑھنے کے شایق ہیں - تعلیم کی کوئی تجویز بھی ہو، اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری اور لازم ہوگا —

یعقوب حسن صاحب نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ ہندی پرچار سبھا اور انجمن ترقی اردو کو ہندستانی کو ملک کی مشترکہ قومی زبان بنانے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے - یہ مشورہ نیا نہیں ہے - اس سے قبل بھی بعض نیک دل بزرگوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ باہمی مشورے اور اتفاق سے ہندستانی زبان کی تشکیل ایسی کی جاے کہ وہ بات چیت کے علاوہ ادب و انشا کے کام بھی آجاے - یہ مشورہ ناقابل عمل تو نہیں مگر دشوار ضرور ہے - اس کے لیے بہت کچھہ صبر، بے تعصبی، کشادہ دلی اور صحیح ذوق کی ضرورت ہے - اگر فریقین میں سے چند شخص ان صفات کے مل جائیں تو بہت کچھہ ہوسکتا ہے - اور اب تک بہت کچھہ ہو جاتا اگر گاندھی جی بیچ میں نہ کود پڑتے - انھوں نے بجائے اس کے کہ ہندستانی زبان کی طرف توجہ کرتے اپنی ساری کوشش اور محنت ہندی کی اشاعت اور فروغ میں صرف کردی اور اس کی خاطر روپیہ پانی کی طرح بہا دیا - اگر یہ کوشش پنڈت مالوی جی یا کسی دوسرے شخص

کی طرف سے ہوتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا - لیکن اس تحریک کا گاندھی جی کی طرف سے ہونا جو ہندو مسلم اتحاد اور مصالحت کے مدعی ہیں' غضب ہوگیا - انہوں نے ایسے وقت یہ بیج بویا کہ آپس کی پھوٹ اور بڑھ گئی اور بڑھتی جاتی ہے - بڑوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں —

۵ - یو پی کے مدرسوں میں ہندی کی کیفیت

چند روز ہوئے علی گڑھ سے ایک قابل پر جوش طالب علم کا خط وصول ہوا اُن کے بیانات پر مجھے اعتماد ہے - کوئی بات ایسی نہیں لکھیں گے جو بے بنیاد ہو - ذیل کے اقتباسات پڑھنے کے قابل ہیں —

" ابھی یہاں دس بارہ روز ہوئے ہردوائی کلب میں جو علی گڑھ سے سات آٹھ میل ہے یو پی پولیٹکل کانفرنس ہوئی تھی - پنڈت جواہر لال نہرو' موہن لال سکسینہ اور اسی قسم کے لیڈر جمع تھے - تقریریں ہو رہی تھیں - تو مولوی صاحب یہ سمجھیے کہ کسی نے بھی تو ایسی زبان میں تقریر نہیں کی جسے خالص ہندستانی کہا جا سکے جسے ہم لوگ بولتے ہیں - یعنے یہ کہ رُک رُک کے سوچ سوچ کے برابر ہندی کے الفاظ لائے جا رہے اور سنائے جا رہے تھے - حالانکہ وہ اُن ہندستانی الفاظ کو بہ آسانی بول سکتے تھے جو عام طور پر رائج ہیں' لیکن زبردستی! ... ... سکسینہ کی تو کئی مرتبہ یہ حالت ہوئی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ وقت کم رہ گیا ہے اور بولنا زیادہ ہے تو انہوں نے اپنی رفتار بڑھا دی اور اُس وقت اُن کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ اردو کے تھے " —

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں : -

" میرے ایک دوست ... ... میں ڈپٹی کلکٹر ہیں - وہ ابھی دیہات میں اپر پرائمری اسکولوں کے معائنے کے لیے بھیجے گئے تھے - میری کمزوری شوق سے واقف ہیں - چنانچہ جو کچھ ہندی کا پرچار انہوں نے وہاں دیہات میں دیکھا اُس کی تفصیل ایک خط کے ذیل کے جملوں سے معلوم ہو سکتی ہے " —

" ... ... اب بڑی مصیبت یہ ہے کہ اردو زبان کو بالکل ہی نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے - جو فارسی الفاظ کہ دیہات میں معمولی معمولی کسانوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں ان کی بجائے زبردستی ہندی سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے - ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے اسکولوں کے معائنہ کا اتفاق مجھے ہوا - مسلمان مدرس ایک بھی نظر نہ آیا - دو چار مسلمان لڑکے جو ہیں وہ بھی ہندی پڑھ رہے ہیں - اُن کو احساس کیا، جیسا ماسٹر صاحب نے کہا ویسا پڑھا - تم کو شاید معلوم ہو کہ اردو اسکولوں (یا یہ کہیے کہ اپر پرائمری اسکولوں وغیرہ میں) لڑکے حاضری کے وقت " حاضر جناب " یا " حاضر صاحب " کہہ کر جواب دیا کرتے تھے - میں نے بارہ تیرہ اسکولوں کے معائنے کیے اور تین جگہ میں نے یہ دیکھا کہ حاضر جناب یا حاضر صاحب کی بجائے " اُپستھت شریمان " کا فقرہ رائج کیا جا رہا ہے - لڑکے خود اس کو نہیں سمجھتے ہیں اور اس کا مطلب پوچھنے پر عام فہم فقرہ " حاضر صاحب " استعمال کر دیتے

ہیں - میں ذیل میں ایک واقعہ درج کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم اس کو ڈرامے یا افسانے یا مضمون کی صورت میں شائع کرنے کی کوشش کروگے -

ایک جگہ ایک اسکول کا معائنہ کر رہا تھا - ایسے موقعوں پر بہت ہی سخت قسم کا Officialdom کا استعمال نہیں ہوتا اور گانو کے کسان، دیہاتی، سیدھے سادے قسم کے لوگ بھی آکر ڈپٹی صاحب کے معائنے کو دیکھنے لگتے ہیں - دس پانچ آدمی اس قسم کے جمع تھے - حاضری شروع ہوی - "اُپستھت شریمان" کے ثقیل نعرے بلند ہونے لگے - کچھہ دیر بعد میں نے ان حاضر کسانوں سے پوچھا کہ اس فقرے کا کیا مطلب سمجھے - جواب ملا "کچھہ نہیں" - تین چار لڑکوں سے پوچھا - جواب نہ دے سکے - آخر میں ایک لڑکے نے بتایا کہ اس کا مطلب حاضر صاحب ہے - اس پر دو ایک کسان کہنے لگے کہ اب سمجھہ میں آیا - میں نے ایک لڑکے سے کہا کہ تم کو اپنی کتاب میں سے جو سبق سب سے زیادہ پسند ہے اس کا خلاصہ اس طرح بیان کرو کہ یہ دیہاتی تمہارے گانو والے بھی سمجھہ سکیں - لڑکا ایک قصہ اس طرح شروع کرتا ہے —

"بھارت ورش کے پرسدّھ نگر پاٹلی پتر میں ایک راجہ تھا (راجہ کے لیے بھی ایک ثقیل ہندی لفظ تھا جو اس وقت یاد نہیں آرہا ہے) اس نے ایک سنگھہ دیکھا" وغیرہ وغیرہ - میں نے ایک کسان سے پوچھا کہ مطلب سمجھہ میں آیا - اُس نے جواب دیا کچھہ نہیں - لڑکے سے کہا کہ ایسی سیدھی بولی میں قصہ کہو کہ یہ لوگ سمجھہ سکیں - اب لڑکے نے دوبارہ اس طرح شروع کیا - "ہندستان کے مشہور شہر پٹنہ میں ایک راجہ

تھا - ایک دن جنگل میں اس نے ایک شیر دیکھا" وغیرہ وغیرہ -

" سینکڑوں الفاظ آپ کو ایسے ملیں گے جو فارسی زبان کے ہیں اور دیہاتی لوگوں وغیرہ کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں - لیکن یہی الفاظ عام برل چال اور خصوصاً موجودہ تکسٹ بک وغیرہ سے بہت بیدردی سے نکالے جا رہے ہیں مثلاً خوش (پرسن) - سمے بمعنے وقت - آدمی (پرش یا منش) حاکم (اتتھہ) - شیر (سنگھہ) دوستی (متر تا) وغیرہ وغیرہ" -

یہ بیان کسی تشریح کا محتاج نہیں - یہ اب روز مرہ کی بات ہوگئی ہے - اس رو کو اگر ابھی سے نہ روکا گیا تو زبان ہی کے حق میں نہیں بلکہ سارے ملک کے حق میں بہت مضر نتائج پیدا ہونگے - ہمارے سیاسی سردار زبان کو معمولی چیز سمجھتے ہیں - یہ معمولی چیز نہیں ہے - یہ سیاست ' معاشرت ' تہذیب کی جڑ بنیاد ہے - اس سے کھیلنا ناگ سے کھیلنا ہے - اگر اس معاملے میں انہوں نے خودسری برتی یا تنگ نظری سے کام لیا تو اتفاق و اتحاد کی ساری کوششیں خاک میں مل جائیں گی —

---

۶ - مسٹر بوس اور اردو

مسٹر بوس نے جو انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہونے والے ہیں ' انگلستان میں ایسٹ انڈ کے سینکڑوں مقیم سکھوں اور ہندو مسلمانوں کے سامنے مشرق و مغرب کے فرق پر ایک سیدھی سادی تقریر اردو زبان میں کی (ٹائمز آف انڈیا - ۱۴ جنوری ۳۸ ع) —

امید ہے کہ دوسرے معزز لیڈر بھی مسٹر بوس کی تقلید کریں گے - مسٹر بوس خوب سمجھتے ہیں کہ ہندستان کی سیاست میں زبان کا کیا درجہ ہے —

---

۷ - ہندی کے جبری رواج پر ملی ہندیوں کی مخالفت

سنگاپور اور ملایا کے دوسرے شہروں میں مدراس کی وزارت کانگرس کی اس تجویز کے خلاف جلسے کیے جا رہے ہیں کہ ہندی کو جبری طور پر مدارس میں پڑھایا جاے - ہندستانیوں کے ایک کثیر اور با اثر طبقے میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ یہ تجویز درحقیقت ہندی کو ہندستان کی قومی زبان کی تحریک ہے - ان کا خیال ہے کہ مدراس کی اس تجویز سے تامل زبان معطل ہو جاے گی —

مسٹر جی - سرنگاپنی نے سنگاپور میں اپنی تقریر میں کہا کہ ہندی کے حامیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہندی کے توسط سے قومی اتحاد مکمل ہو جاے گا - لیکن اُن کے (یعنے مسٹر سرنگاپنی کے) خیال میں یہ نظریہ ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ صرف ایک زبان سے قومی اتحاد وجود میں نہیں آسکتا - ان کی راے میں ہندستان کی زبانوں کی ترقی موجودہ طریقہ ہی پر ہونی چاہیے اور انگریزی دوسرے ایسے مقاصد کے لیے استعمال کرنی چاہیے جن کا تعلق ہمارے گھر گھرستی اور معاشرتی امور سے نہیں ہے - انہوں نے بیان کیا کہ وہ ہندی لیڈر جو انگریزی بولتے ہیں وہ اس "غلامانہ فطرت" کا اظہار نہیں کرتے جو ہندی کے حامیوں کی راے میں ناگزیر ہے اگر انگریزی مشترکہ زبان ہو گئی - ہندی کے جبری رواج کے

خلاف ہندستان کو رزولیوشن بھیجے گئے " (ٹائمز آف انڈیا) —

حقیقت یہ ہے کہ مدراس میں ہندی کو رواج دینا الٹی گنگا بہانا ہے - سوائے اردو کے صوبۂ مدراس میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ سب کی سب دراوڑی ہیں اور انہیں ہندی سے مطلق کوئی واسطہ نہیں - نہ صرفی و نحوی لحاظ سے نہ رسم خط کے لحاظ سے اور نہ زبان کی ساخت اور اسلوب بیان کے اعتبار سے —

---

۸ - سی - پی اور ہندی اردو

سی - پی (ممالک متوسط) کی حکومت کے وزیر تعلیم مسٹر شُکلا کی ابتدائی تعلیم کی اسکیم شایع ہوگئی ہے - اس کا خلاصہ یہ ہے :—

۱ - اس کا نام " ودیا مندر " تجویز کیا گیا ہے —

(۲) یہ تعلیم مفت اور جبری ہوگی —

(۳) اس کا نفاذ ان تمام دیہات میں ہوگا جہاں قابل تعلیم عمر کے چالیس لڑکے لڑکیاں ہونگے —

(۴) ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہوگا —

(۵) ان مدارس میں صرف ایک مدرس رکھا جائے گا —

مسلمانوں کو اس نام پر اعتراض ہے - یہ مسٹر شکلا کی جدت ہے - اور اس پر " ایجاد بندہ " کی مثل صادق آتی ہے - پہلے سے جو نام چلے آرہے ہیں ان کو بدلنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی - مجھ سے بھی مسٹر شکلا سے اس بارے میں گفتگو آئی تھی ' ان کا خیال ہے کہ اس نام " تقدس " کی شان پیدا ہو جاتی ہے - بات یہ ہے کہ

باوجود صدھا سال ایک ساتھہ رھنے کے ھم ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات سے ناواقف ھیں - ھم اپنی بات چیت، تحریر و تقریر اور کردار کے وقت یہ بھول جاتے ھیں کہ ھمارے سوا دوسرے لوگ بھی اس ملک میں آباد ھیں - جس کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ ایک ذراسی لغزش اور ایک معمولی سے لفظ سے بدگمانی پیدا ھوجاتی ھے اور اِس کا اصل کام پر برا اثر پڑتا ھے - مسٹر شکلا کی نیت نیک سہی لیکن مصلحت وقت کے خلاف ھے —

قطع نظر اس کے اِس تجویز کے رو سے وہ بچے جن کی مادری زبان اردو ھے یا جو اردو کے ذریعہ سے تعلیم پانا چاھتے ھیں، اردو زبان سیکھنے سے محروم رہ جائیں گے - اس کی چند وجوہ یہ ھیں —

اول، سی پی میں ایسے دیہات شاذ و نادر ھی ملیں گے جن میں چالیس قابل تعلیم بچے ایسے ھوں جن کی مادری زبان اردو ھو - اگر چہ ھندی ودیا مندر اور مرھٹی ودیا مندر کے ساتھہ اردو ودیا مندر کا نام بھی تجویز کیا گیا ھے لیکن یہ نام ھی نام رھے گا - نہ چالیس اردو والے بچے ملیں گے نہ اردو ودیا مندر آباد ھو گا —

دوسرے، ایسے مدرسوں میں صرف ایک ایک مدرس ھوگا - اور ظاھر ھے کہ یہ مدرس یا تو ھندی داں ھوگا یا مرھٹی داں، اردو داں شاید ھی کوئی نکلے —

نتیجہ یہ ھوگا کہ اردو پڑھنے والوں کے لیے اردو سیکھنے کی کوئی صورت نہ ھوگی - اور چونکہ تعلیم جبری ھوگی اس لیے اُن کو لامحالہ ھندی یا مرھٹی پڑھنی ھوگی - چند سال بعد اعداد و شمار کے ذریعہ یہ ثابت کرنا کچھہ مشکل نہ ھوگا کہ اس صوبے کی زبان ھندی یا مرھٹی

ہے اردو نہیں - لہذا اردو ودیا مندر تعلیم سے خارج - اس کے بعد دوسرا اندیشہ یہ ہے کہ اِس وقت جو اردو مدرسے جاری ہیں وہ بھی نہ بند کر دیے جائیں —

میری یہ بدگمانی بلا وجہ نہیں ہے اور خدا کرے یہ غلط ثابت ہو- لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے - اُس کے یہ نتیجے ایسے صاف اور صریح ہیں کہ کوئی معقول پسند شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا - اس لیے مسٹر شکلا کی یہ اسکیم ہمارے لیے نہایت اندیشہ ناک ہے —

اس سے سی پی کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیلا ہوا ہے - انجمن کی ایک شاخ ناگپور میں ہے جو بہت اچھا کام کر رہی ہے - اس کے ارکان نے ایک جلسہ کر کے اس کے خلاف ایک قرار داد منظور کی - اس کے بعد شہر کے مسلمانوں کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں تقریباً پانچ ہزار اشخاص شریک تھے اور اس کے صدر انجمن ترقی اردو کے رکن محمد ابراہیم خاں صاحب میونسپل کمشنر تھے . اس جلسے کا یہ اثر ہوا کہ آنریبل یوسف شریف صاحب وزیر قانون و انصاف نے ہمارے انجمن کے پر جوش اور قابل رکن مولوی حکیم اسرار احمد صاحب کو بلا بھیجا اور کہا کہ حکومت اس اسکیم پر نظرثانی کرنے کے لیے تیار ہے - اسی سلسلے میں انہوں نے گاندھی جی سے ملاقات کا وقت مقرر کر لیا - چنانچہ حکیم صاحب وزیر صاحب کے ساتھ شوگانو پہنچے اور گاندھی جی سے اس معاملے میں صاف صاف گفتگو ہوئی - گاندھی جی نے فرمایا کہ "مندر" کا لفظ نکال دیا جائے گا یعنے وہ وزیر تعلیم کو زبانی سمجھا دیں گے کہ وہ اس لفظ کی بجائے کوئی دوسرا لفظ رکھ دیں اور

"ودیا مندر" والی اسکیم کو "وردھا اسکیم" کے تابع کر دیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی بولنے والے علاقے میں دونوں خطوں کی تعلیم لازمی ہوگی اور غیر ہندستانی بولنے والے علاقے میں تعلیم کے پانچویں اور چھٹے سال میں ہندستانی زبان کی تعلیم کسی ایک رسم خط میں ضروری ہوگی۔ (اِس صوبے میں گیارہ اضلاع ہندستانی بولنے والے اور سات مرہٹی بولنے والے) ۔ اگر چہ اس سے بھی ہمارا منشا پورا نہیں ہوتا تاہم موجودہ ناگوار حالات میں یہ بھی غنیمت معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ یہ ہو جائے —

کچھہ عرصہ ہوا جب میں نے مسٹر شکلا سے مل کر اردو تعلیم کے متعلق اپنے مطالبات پیش کیے تھے اور بعد میں انہیں لکھہ کر بغرض تصدیق مسٹر شکلا کی خدمت میں بھیجا تھا تو انہوں نے اپنے جواب میں مجھے یہ لکھا تھا کہ میری یاد داشت کو اپنی تعلیمی اسٹیلنگ کمیٹی میں جو قائم ہونے والی ہے پیش کردیں گے۔ خط کے آخر میں انہوں نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ کانگریس کے اصول کی رو سے اقلیتوں کی تہذیب اور زبان کی حفاظت اُن کا فرض ہے —

سیاسی عقیدے اور وعدے دیکھنے اور سننے میں بہت معقول اور بہت دل خوش کن ہوتے ہیں۔ لیکن عمل کچھہ اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ فریق ثانی کے کچھہ پلّے نہ پڑے اور ساتھہ ہی قانونی اور منطقی گرفت بھی نہ ہو سکے۔ معلوم یہ ہوا کہ مسلسل شور غل، مخالفت، لڑائی جھگڑے سے کچھہ مل جائے تو مل جائے ورنہ اِن معاملات میں انصاف کی توقع رکھنا نری سادہ لوحی ہے —

۹ - صوبۂ بہار اور ہندستانی

ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیم صوبۂ بہار کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جو ان امور پر غور کرے —

(۱) نصاب تعلیم کے لیے مستند اصحاب سے کتابوں کی تیاری، تنقیح اور منظوری —

(۲) ہندستانی زبان کے لغت کی ترتیب —

(۳) ہندی اور اردو مصنفین کے لیے لغت اصطلاحات کی ترتیب —

(۴) جدید اصول پر صرف و نحو کی تالیف —

(۵) مترجمین کے استعمال کے لیے انگریزی ہندستانی لغت کی ترتیب

اس کمیٹی کے ارکان یہ ہوں گے -

بابو راجندر پرشاد صاحب - ڈاکٹر ایس سنہا، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی - مولانا ابوالکلام آزاد - پروفیسر ڈاکٹر تارا چند - پروفیسر نریندر دیو (کاشی ودیاله بنارس) - ڈاکٹر بابو رام سمیلا - مولانا سید سلیمان ندوی - مولانا عبدالحق - ڈاکٹر ذاکر حسین - پروفیسر غلام السیدین - پروفیسر بدری ناتھ ورما (بہار ودیاپیٹ) - راجه رادھیکا رام پرشاد سنگھه آف سورج پور -

شکر ہے کہ ہماری انجمن کی جد و جہد اور چیخ پکار کا کچھه تو اثر ہوا -

— * —

تبصرے

نام کتاب	صفحہ
ادب	
مکاتیب غالب	۲۰۳
تفسیر حیات	۲۰۹
حیدر علی	۲۱۱
دیوان ساحر موسوم بہ کفر عشق	۲۱۳
محبت اور نفرت	۲۱۵
گلدستۂ مضامین و انشا پردازی	۲۱۶
نظر کے دھوکے	۲۱۷
ایمان سخن	۲۱۹
پریم سوگ	۲۲۱
یادگار محشر	۲۲۲
تعلیم	
سلسلۂ گلدستۂ تعلیم اسلام	۲۲۳
سلسلۂ تعلیم القرآن	۲۲۴
تلمیحات و اشارات در ادب فارسی (انگریزی)	۲۲۴
پستالوزی	۲۲۵
متفرقات	
معاهدہ عمرانی یا اصول قانون	
سیاسی	۲۲۷
اردو کے جدید رسالے	
تنویر	۲۲۹
مشعل	۲۲۹
خاص نمبر	
خاتون سرحد	۲۳۰
پھول باغ پٹھالہ کا سالانہ نمبر	۲۳۱

تبصرے

ادب

مکاتیب غالب

(مدوّنہ مولوی امتیاز علی صاحب عرشی ، ناظم کتاب خانہ ریاست رامپور)

نواب یوسف علی خاں ، وارث ریاست رامپور ہونے سے پہلے لڑکپن میں کچھہ مدت اپنے والد کے ساتھہ دھلی میں رہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھہ روز تک مرزا غالب مرحوم سے فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی - لیکن یہ تعلق اتنا سرسری اور بظاہر چند روزہ تھا کہ دس گیارہ برس بعد سنہ ۱۸۴۰ع میں جب تقدیر کی یاوری سے ان کے والد ماجد محمد سعید خاں دوبارہ مسند ریاست پر متمکن ہوئے تو ان کے بھائی اور مرزا صاحب کے دوست عبداللہ خاں (صدر صدور میرٹھہ) کی تحریک کے باوجود مرزا صاحب نے قصیدۂ تہلیت لکھنے سے معذرت کی - خود نواب یوسف علی خاں کی مسند نشینی (سنہ ۱۸۵۵ع) پر قطعہ تاریخ لکھہ کر بھیجا تو اس کی بھی اُدھر سے رسید نہ ملی اور وہ قطعہ اب مفقود ہے - (مکاتیب - ص ۳) لیکن تقریباً دو سال کے بعد مولانا فضل حق خیرآبادی کی تحریک سے

دوبارہ ایک عریضہ اور قصیدہ مدحیہ تحریر کیا جس کا نفیس مطلع یہ ہے :-

همانا اگر گوهر جاں فرستم

به نواب یوسف علی خاں فرستم

اور اسی کے بعد نواب صاحب نے مرزا کی شاگردی اختیار کی - رقمی امداد بھی دینے لگے اور جولائی سنہ ۱۸۵۹ ع سے سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کردی جو ان کے جانشین نواب کلب علی خاں کے زمانے میں بھی جاری اور مرتے دم (یعنی فروری ۱۸۶۹ ع) تک مرزا صاحب کو ملتی رہی - گویا کم و بیش بارہ سال وہ دربار رامپور کے متوسل رہے - اس عرصے میں دربار رامپور بھی آئے اور خط کتابت کا سلسلہ برابر قائم رہا - ان میں سے وہ مراسلات جن میں اصلاحی غزلیں بھیجی جاتی تھیں، ظاہر ہے کہ علحدہ محفوظ نہ رکھے گئے ہوں گے لیکن دوسرے خطوں کی ایک کافی تعداد ریاست کے 'دارالانشا' یعنی محافظ خانے میں موجود ہے جنھیں حکام کی اجازت و اعانت سے 'عرشی' صاحب نے ایک بسیط دیباچے کے ساتھہ نسخ ٹائپ میں چکنے کاغذ پر بہت عمدہ چھپوا کر "مکاتیب غالب" کے نام سے مجلد شائع کیا ہے - اس مجموعے میں ۴۱ خط نواب یوسف علی خاں کے نام، ۶۴ نواب کلب علی خاں کے نام اور ۱۰ دوسرے احباب رامپور کے نام، اور ایک قطعہ اور ایک قصیدہ ملا کر کُل ۱۱۷ مکاتیب ہیں - یہ قطعہ اور قصیدہ، نیز تین ابتدائی خط فارسی میں ہیں - آخری چند رقعات بہت مختصر اور محض تنخواہ کی رسیدیں ہیں - کئی خطوں میں اپنے قرض کی ادائی یا دوسری ضروریات کے لیے روپے کا تقاضا ایسے الفاظ میں کیا ہے جو ایک عالی خیال شاعر کی غیرت و خود داری سے کچھہ مناسبت نہیں رکھتے اسی لیے ممکن ہے

بعض احباب کو اس قسم کے خطوط کی اشاعت ناگوار ہو اور انہیں وہ اپنے محبوب ممدوح کی کسرشان تصور کریں - لیکن اول تو مرزا غالب نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب ادبی تبرک کا مرتبہ رکھتا ہے دوسرے ان کے ساتھ عاقلانہ شیفتگی کا مقتضی یہ ہے کہ ان کی سیرت کا ہر نیک و بد پہلو پوری صحت و صراحت سے محفوظ رکھا جائے - ایسی شخص پرستی جس میں اپنے ممدوح کو سورما بناکر محض اس کے فضائل و محاسن میں مبالغہ کیا جائے ' تاریخی اعتبار سے نہایت معیوب اور اخلاقاً سخت مضر ہے —

دیباچۂ کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے ' مرزا صاحب کے شاگرد ہونے سے پہلے ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کیا تھا (ص ۶۷) یہ گویا اس قیاس کی تائید ہے جو شاید ۱۹۱۴ ع میں رسالۂ الناظر لکھنؤ میں پیش کیا گیا تھا کہ ناظم کے کلام کا بہت سا حصہ (یعنی دیوان اول) بیشتر خود مرزا غالب کا کہا ہوا معلوم ہوتا ہے - نواب صاحب کے واسطے یہ تخلص بھی مرزا صاحب ہی نے تجویز فرمایا تھا (مکاتب ص ۷) اور جب ۱۸۶۳ ع کے اخیر یا ۱۸۶۴ ع کے شروع سے مرزا صاحب نے علالت و ضعف پیری کے عذر پر اصلاح دینی موقوف کی اور جیسا کہ منشی امیر احمد صاحب مینائی نے لکھا ہے ' حضرت ' اسیر ' لکھنوی سے یہ خدمت متعلق ہوی تو کلام کا رنگ ہی بالکل بدل گیا - چنانچہ دوسرے دیوان میں جس قسم کی عشقیہ غزلیں ' ضلع جگت کے اشعار اور واسوخت وغیرہ درج ہیں ' مرزا تو کیا ' ان کا کوئی صحبت یافتہ بھی ایسی شاعری نہ کرسکتا تھا - عرشی صاحب نے مینائی مرحوم کے مذکورۂ بالا قول کی جو تردید فرمائی ہے وہ کمزور دلائل سے بداہت کی تردید ہے -

'مکاتیب' میں ساتواں خط (ص ۱۱) فارسی ہے اور اس میں مرزا

صاحب نے اپنے ذاتی اور خاندانی حالات بیان کیے ہیں - مگر کوئی نئی بات تحریر نہیں کی - پنشن کے بند ہونے اور پھر جاری ہونے کا قصہ کئی خطوں میں جا بہ جا مذکور ہے - نمبر ۱۹ و نمبر ۳۰ میں خلعت کی بحالی اور لفٹننٹ گورنر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اس کے بالآخر قبول فرمائے جانے پر شاد مانی کا اظہار ہے - دوسرے سفر رامپور سے واپسی کے وقت مراد آباد پر ندی کے پل ٹوٹنے ' اور کافی زحمت و صعوبت کے بعد دلی پہنچنے کا حال مکتوب نمبر ۵۸ میں تحریر کیا ہے - خط کا خاتمہ اس تضمین پر ہوتا ہے : ق

مغلوب غلبۂ غم دل غالب حزیں
کاندر تنش ز ضعف ' تواں گفت جاں نبود

از رامپور زندہ بدھلی رسیدہ است
مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

مکتوب نمبر ۶۰ میں نواب کلب علی خاں کے جشن مسند نشینی کی نذر میں ایک غزل "نئی طرز کی ' نئی بحر میں عرض کی ہے" یہ غزل کلیات غالب میں موجود نہیں - غالباً پہلی دفعہ منظر عام پر آئی ہے اور اپنی ندرت و نفاست کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ پوری نقل کی جائے :

بحر ہزج مثمن سالم

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن

"اے خداوند خرد مند و جہاں داور دانا
وے بہ نیروے خرد برہمہ کردار توانا
اے برفتار و بدیدار ' بزیبائی و خوبی
سرو نو خاستہ آسا ' مہ نا کاستہ مانا

به ادا پایه فزایا ' به نظر عقده کشایا
به کرم ابر عطایا به غضب برق سلانا
به نگه خسته نوازا به سخن بنده طرازا
به قلم غالیه سایا به نفس عطر فشانا
شه نشان کلب علی خان که توی یوسف ثانی
نبود ثانی و همتای تو در دهر همانا
دانم از حال و مآلم خبرے داشته باشی
سر نوشت ازلی گرچه ندارد خط خوانا
دشنم چرخ و تو بینی و نسوزی بعتابش
به عدو صاعقه ریزا به محب فیض رسانا
جانشین * تو کلد نام ترا زنده به گیتی
باد فردوس برین جاے تو فردوس مکانا
غالب از غم چه خروشی بتو زیبا ست خموشی
باکریم همه داں هیچ مگو هیچ مدانا "

اصلاح شعر نواب یوسف علی خاں کے آخر زمانے سے موقوف ہو چکی تھی ' لیکن ۱۸۶۶ ع میں نواب کلب علی خاں نے ایک نثر فارسی اصلاح کی غرض سے مرزا صاحب کو بھیجی - اس کے بعض محاوروں پر اعتراض کی ضمن میں مرزا صاحب نے حسب عادت فارسی لغت نویسوں پر بھی تعریض کی - نواب صاحب یا شاید اُن کے ادبی مشیر برہم ہوے

---

* اس شعر میں نواب یوسف علی خاں مرحوم سے خطاب ہے جن کا مابعدالموت لقب " فردوس مکاں " قرار پایا تھا -

اور جواب میں ناراضی کا اظہار کیا - مرزا صاحب نے معذرت پیش کی لیکن یہ بھی لکھدیا کہ " اِن باتوں کو میں نے مانا لیکن نہ فرھنگ لکھنے والوں کی راے کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق " - مرزا صاحب کے یہ دو خط مکاتیب میں ۷۱ اور ۷۲ نمبر پر درج ھیں - ذیل میں عرشی صاحب نے مفید حواشی لکھدیے ھیں - اسی قسم کی ادبی بحث مکتوب نمبر ۱۱۶ میں درج ھے - یہ خط 'خلیفہ' احمد علی صاحب راجپوری کے نام ھے جو مرزا صاحب سے ملے اور اثناے گفتگو میں عرفی کے ایک شعر پر اعتراض کیا تھا - آخری مکتوب (نمبر ۱۱۷) محمد حسن خاں مالک مطبع و اخبار "دبدبہ سکندری" کے نام ھے جس میں ان کی اور ان کے اخبار کی خوب خبر لی ھے اور نہایت تاکید سے خدا کے واسطے دے کر لکھا ھے کہ آیندہ اسے بھیجنا بند کر دیا جاے —

مکاتیب میں بعض رباعیاں اور قطعات تاریخ بھی آگئے ھیں جو غالباً دوسری جگہ شائع نہیں ھوے تھے - تاریخیں عموماً معمولی ھیں - ان میں ایک تعمیہ جو سب سے بہتر نظر آیا ذیل میں نقل کیا جاتا ھے - یہ نواب یوسف علی خاں کی والدہ کی تاریخ وفات ھے —

جناب عالیہ از بخشش حق بفردوس بریں چوں کرد آرام
سخن پرداز غالب، سال رحلت " خلود خلد " گفت از روے الہام
۱ + ۱۲۷۴

بہر حال " مکاتیب غالب " مرزا صاحب کی گم شدہ یادگاروں کا مجموعہ ھے جسے ارباب شوق آنکھوں پر رکھیں گے اور فاضل مدوّن اور حکام ریاست کو دعا دیں گے کہ ان کی سعی و ھمت سے یہ چھپا خزانہ نظر کے سامنے آگیا - کتاب میں قیمت درج نہیں لیکن مطبع شرف الدین الکتبی کے

ایک اشتہار سے ظاہر ہوا کہ ۴ روپیہ ہے اور کتاب خانہ ریاست 'رامپور' یا اس مطبع سے دستیاب ہوسکے گی —

(ش)

تفسیر حیات۔

(مصنفۂ میاں اسلم صاحب - صفحات ۲۱۲ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے - میاں دین محمد اینڈ سنس لاہور)

یہ میاں اسلم صاحب کے چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے میاں اسلم صاحب بہت پرنویس افسانہ نگار ہیں شاید ہی اردو کا کوئی ماہانہ رسالہ ایسا ہو جس میں ان کے افسانے نہ شایع ہوئے ہوں ' زیر تبصرہ مجموعہ کے اکثر افسانے بھی مختلف رسالوں میں نکل چکے ہیں —

ناولیں اور داستانیں تو اردو زبان میں ایک زمانے سے لکھی جارہی ہیں ' لیکن مختصر افسانے لکھنے کا فن ابھی حال کی پیدا وار ہے ' اور سوائے ایک یا دو چوٹی کے افسانہ نگاروں کے ' اکثر حضرات نے ابھی اس فن کی خصوصیات اور ضروریات کو پوری طرح سے نہیں سمجھا ہے ' ہر واقعہ مختصر افسانے کا موضوع نہیں ہوسکتا اور نہ ہر قلم کفایت الفاظ ' اور سیرت نگاری کی ان نزاکتوں کا متحمل ہوسکتا ہے جو مختصر افسانوں اور طویل داستانوں میں مابہ الامتیاز ہوتی ہیں —

ہم نے میاں اسلم صاحب کے ہر افسانے کو شروع سے آخر تک پڑھا ' اور ہم اپنے اس عجز کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں ان میں وہ "بات" جس کی ایک ایسے مشاق افسانہ نویس سے توقع ہوسکتی ہے

کہیں نظر نہیں آئی اس میں شک نہیں کہ میاں صاحب نے منظر نگاری پر خاص کوشش صرف کی ہے لیکن ان کے مناظر مثلاً طلوع و غروب آفتاب کا حال پڑھکر خدا معلوم کیوں ہمیں 'شرر' مرحوم کی ناولیں یاد آجاتی ہیں ' وہی بندھی ٹکی تشبیہیں ' وہی یکسانیت اور --

میاں اسلم صاحب شاید مختصر افسانوں میں 'پلاٹ' کے قایل نہیں ہیں ' سوائے چند افسانوں کو چھوڑ کر ' ان کے " مرکزی واقعات " جاذب نظر نہیں ہوتے ' سیرت نگاری مختصر افسانوں کا غالباً سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتی ہے ' ناول نویس کے پاس تو اس چیز کے لیے بہت بڑا میدان ہوتا ہے ' لیکن مختصر افسانہ لکھنے والے کو صرف دو قسم کی ہلکی جنبشوں سے یہ مشکل فرض ادا کرنا ہوتا ہے ' ہمیں میاں اسلم صاحب کے چالیس افسانوں میں ایسی سیرتیں جو جاذب توجہ ہوں مشکل سے نظر آتی ہیں - اس کی وجہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ میاں صاحب کا زبان کا پہلو کسی قدر کمزور ہے - وہ اکثر مشہور اشعار کے الفاظ کو اپنی نثر میں لکھ جاتے ہیں مثلاً " چشمہ کی شورشوں میں باجا بج رہا تھا " " جیسے کوئی حسینہ جھک کر آئینہ دیکھ رہی ہو " " ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی آرہی تھی " اکثر افسانوں میں " پچھلے پہر کی کوئل " کا ذکر ہے اور ہمیشہ " پچھلے پہر " سے مراد 'سہ پہر' لی گئی ہے ' حالانکہ اقبال کا مشہور مصرع ہے " پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن " سینہ کا ذکر ہمیشہ ان الفاظ میں ہوتا ہے " جو شباب کی مستیوں کا آئینہ دار تھا " ہیروئن کی گفتگو اکثر و بیشتر " دونوں ہاتھ کمر پر رکھکر " ہوتی ہے ' اور تقریباً ہر افسانے میں اس کا سر " ایک جنبش جانانہ " کے ساتھ ہلتا ہے —

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ' ان افسانوں میں زبان کا پہلو بہت کمزور

ہے ' تدہ (بجاے قدح) امد (بجاے امنڈ) اور مہتر رانی (بجائے مہترانی) مقبول صورت (بجاے قبول صورت) کو ہم چاہے کاتب کی غلطی سمجھ لیں ' لیکن " پینگ ڈالنا ' " رباب کی تاریں " " قدم ڈھکانا " " اجیرن ہونا " (پریشان ہونا کے معنوں میں) " رحیل کہاں ہوتا ہے " (بجاے کہاں رہتا ہے) ایسی مثالیں ہیں جن کی توجیہ اس طرح نہیں کی جاسکتی —

" رادھا کی کلھنّی " اور " سفت ہوے بدنام " اچھے افسانے ہیں - " امی مجھے ڈھونڈھلو " ایک چوٹ کھاے ہوئے دل کی سچی تصویر ہے —

کتاب کے شروع میں مولانا چراغ حسن ' حسرت ' کا " تعارف " ہے ہم فاضل مصنف اور ناشرین کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہیں ' اور ہمیں امید ہے کہ میاں اسلم صاحب اپنی افسانہ نویسی کی صلاحیت سے ملک کے افسانہ نگاروں میں اپنے لیے ایک خاص جگہ پیدا کرلیں گے —

(و)

حیدر علی

(مصنفۂ محمود خاں محمود صاحب - صفحات ۱۸۳

قیمت آٹھ آنے - محمد سراج الدین نمبر ۶ ڈکنس روڈ بنگلور)

یہ محمود خاں صاحب مصنف تاریخ سلطنت خداداد میسور کا تاریخی ناول ہے - مصنف نے نواب حیدر علی کے عہد کے ایک واقعہ کو داستان کی صورت میں بیان کیا ہے - جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بدنور کا راجہ بسویا نایک مرگیا تو تخت کا وارث ایک کم سن لڑکا چن بسویا

ہوا جسے راجہ نے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا - لیکن تخت و تاج کی مالک نوجوان بیوہ رانی ہوگئی - عیش و عشرت میں پڑگئی - رانی نے اپنے آشنا برہمن کی سازش سے چن بسویا کا کام تمام کر دیا - لیکن درحقیقت وہ مرا نہیں تھا اور ایک جوگی کی ہوشیاری سے وہ نیم مردہ پھر زندہ ہوگیا اور روپوش ہوگیا - ایک مدت بعد جب نواب کو اس مظلوم لڑکے کا حال معلوم ہوا تو اس نے بدنور پر حملہ کرکے ریاست کو فتح کیا اور چن بسویا کو گدی پر بٹھا دیا اور رانی اور اس کے آشنا کو وظیفہ دے کر کاروبار سلطنت سے الگ کر دیا لیکن رانی نے چالاکی سے راجہ کو اپنے ساتھ ملا لیا - اور رانی ' راجہ اور رانی کے آشنا نے سازش کرکے حیدر علی کا کام تمام کرنے کی پوری سازش کی - وقت پر سازش کھل گئی اور نواب نے رانی ' راجہ اور برہمن کو گرفتار کر کے قلعہ مادھوگری میں قید کر دیا —

یہ خیالی فسانہ نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے - مصنف نے اسے ناول کے رنگ میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اور اس زمانے کی ہندو سوسائٹی کی معاشرتی حالت کا اچھا نقشہ کھینچا ہے —

کتاب کے دیباچے میں قابل مصنف نے تمام تاریخی شواہد کا ذکر کر دیا ہے - اور جو بعض الزامات نواب حیدر علی پر لگائے جاتے ہیں ان کی تردید نہایت معقول طور سے تاریخی واقعات پیش کر کے کی ہے —

کتاب بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے —

دیوان ساحر موسوم بہ کفر عشق

(مجموعۂ کلام جناب پنڈت امرناتھہ صاحب ساحر دہلوی -
صفحات ۲۱۲ مجلد قیمت ایک روپیہ چھے آنے مصنف سے لال حویلی،
محلہ چوڑی گراں دہلی کے پتے سے مل سکتا ہے -)

حضرت ساحر ہماری قدیم تہذیب اور اخلاق و آداب کا اعلیٰ نمونہ ہیں - اور اس وضعداری کو وہ اب تک بڑی خوبی سے نبھاے جا رہے ہیں - ہر سال بڑے التزام اور شوق و ذوق سے مشاعرے کا اہتمام کرتے ہیں - دو سال ہوئے اس مشاعرے کی پچیس سالہ جوبلی تھی - اُس وقت انہوں نے غیر معمولی انتظام کیا تھا - دور دور سے اُن کے احباب اور قدردان آئے تھے - اُن دنوں حضرت ساحر کا انہماک دیکھنے کے قابل تھا - اس بڑھاپے میں ان کی غیر معمولی مستعدی اور تگ و دو کو دیکھہ کر جوانوں کو رشک آتا تھا - ایک ریڈیو کو چھوڑ کر باقی سارا رنگ ڈھنگ قدیم وضع کا تھا اور اگلی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتا تھا —

ساحر صاحب ایک درویش صفت اور صوفی منش بزرگ ہیں - ان کا سارا کلام توحید و معرفت سے بھرا ہوا ہے - اور اسی کی مناسبت سے ہر ایک غزل کا عنوان بھی انہوں نے قائم کر دیا ہے - مثلاً مجازعین حقیقت ، پاس انفاس، جلوۂ بقا ، صفات جلوۂ ذات ، نغمۂ توحید ، پندار وجود ، فروغ حسن وغیرہ وغیرہ - ان کے کلام میں پختگی اور خیالات میں وسعت پائی جاتی ہے - ان کی زبان اگرچہ دلی کا ہے لیکن الہیات و تصوف کے مضامین بیان کرنے میں انہیں وہی الفاظ و محاورات اور اصطلاحات استعمال کرنی پڑی ہیں جو ان مضامین کے شایاں ہیں - یہاں

اُن کے کلام سے کچھہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے اُن کی طبیعت کا رنگ معلوم ہو گا —

ہیں مومن و کافر کے لیے جنت و دوزخ ہم قلب کو بے بیم و رجا دیکھہ رہے ہیں
عریاں نظر آتے ہیں بہم وحدت و کثرت ہم عالم مستی میں یہ کیا دیکھہ رہے ہیں

نگاہ وقف جمال و خیال محو جلال رہ فنا میں ہیں دو نقش پانشاں کے لیے
حضور قلب ہے سرمایۂ حیات دوام نفس ہے خضر مرا عمر جاوداں کے لیے
مری نماز کو بہر وضو ہے جام طہور صلائے ساقیء کوثر ہے بس اذاں کے لیے
کہا یہ رحمت حق نے کہ ہے یہ حق سے بعید کہ وقف ہو کوئی جلوہ کسی مکاں کے لیے

آنکھیں قصور وار ہیں دل شرمسار ہے دو پردہ در ہیں راز کے ایک پردہ دار ہے
خلوت ہے انجمن میں تو خلوت میں انجمن آئینہ سے نگاہ کسی کی دو چار ہے

ہے حریم جسم و جاں میں کشمکش حلقۂ دارالاماں میں کشمکش
مرکز اضداد ہے کون و مکاں ہے کہاں یہ لامکاں میں کشمکش
کیسے قائم رہ سکے پائے ثبات ہے زمین و آسماں میں کشمکش
گرچہ حسن و عشق میں ہے اتحاد ہے مگر جذب نہاں میں کشمکش
بلبل و گل میں فریب حسن سے ہے گلستان جہاں میں کشمکش

پانی پت میں ایک مشاعرہ تھا - اُس میں ساحر صاحب نے بھی طرحی غزل پڑھی جس کے چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

سوز میں ساز رہا سوختہ سامانوں سے محفلیں گرم رہیں شمع کے پروانوں سے

کیا کہوں کام پڑا ہے مجھے نادانوں سے
جانچتے عشق کو ہیں عقل کے پیمانوں سے

ہوش میں آئے نہ آئیں کبھی مستان الست
وہ جو چھکے ہوئے ہیں ساقی ترے پیمانوں سے

آتی ہے بوئے ریا دیر و حرم سے مجھکو
صدق دے بار خدایا مجھے میخانوں سے

کفر و اسلام سے کاوش ہے نہ آویزش ہے
میرا مذہب ہے جدا دینوں سے ایمانوں سے

محبت اور نفرت

(مصنفۂ سید اختر حسین صاحب رائے پوری صفحات ۲۰۲ - مجلد، قیمت ایک روپیہ چار آنے - ساقی بک ڈپو، دہلی)-

یہ کتاب افسانوں کے نام سے چھپی ہے - مگر در حقیقت یہ دلی جذبات، ذاتی مشاہدات اور کسی قدر آپ بیتی کی داستان ہے - ان سب کو مصنف نے نئے رنگ اور نئی زبان میں ادا کیا ہے - نثر میں شاعری کرنا مشکل ہی نہیں مذموم بھی ہے لیکن قابل مصنف نے نئی تشبیہوں، اچھوتے استعارات اور دلکش طرز بیان سے نثر میں شعر کا لطف پیدا کر دیا ہے - مثلاً :

"میں چاہتا ہوں کہ میری تخیلی دنیا میں جب تک ایک آدمی بھی جدائی کے صدمے اُٹھا رہا ہو، کسی کو وصل میسر نہ ہو؛ جب تک پھول مرجھاتے ہوں کوئی کلی نہ کھلے؛ جب تک بدنمائی باقی رہے کہیں حسن نہ ہو، جب تک آنکھوں میں آنسو ہوں کہیں تبسم کی گل پاشیاں نہ ہوں - میں چاہتا ہوں کہ میری دنیا میں چاندنی امرت نہ لٹائے - برق بلا آنکھوں کو یوں خیرہ کر دے کہ پھر روشنی کی ضرورت نہ رہے - گل رخوں کی سحر آفریں گیت کبھی خواب آگیں ہواؤں کو

نہ جگائیں۔ جب تک رنج و یاس ہیں کوئی راحت و آرام کا نام نہ لے۔ میں جس منزل پر چل رہا ہوں وہ ہمیشہ نا تمام رہے۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ میری تکان دور کرنے کے لیے راہ میں سایہ نصیب ہو۔ لیکن میری مراد بر نہیں آتی! گاہے گاہے اس صحرا نوردی اور بے رہ روی میں، اِس آبلہ پائی اور شوریدہ سری میں کہیں سے دو چار پھول ٹپک کر اس دشوار گزار رستہ کو آسان بنا دیتے ہیں۔ یہی نہیں۔ مجھے روک کر دریاے محبت کی رنگینیوں کو دور سے دیکھنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں جو میری پگ ڈنڈی سے الگ ہٹ کر دوسرے جانب سکون و اطمینان کو اپنی لہروں پر نچا رہا ہے'' —

یہ اقتباس ہم نے یونہیں کتاب کھول کر لکھ دیا ہے۔ ساری کتاب مصنف کے تخیل کی بلند پروازی اور جذبات شدید و لطیف نقاشی سے بھری ہوئی ہے۔ اردو زبان میں اس قسم کی تحریر نئی ہے اور ضرور پڑھنے کے قابل ہے۔

گلدستۂ مضامین و انشا پردازی

(مولفہ و مرتبہ رمضان علی صاحب ایم۔ اے و اختر علی صاحب ایم۔اے، اردو لکچرار۔ صفحات ۳۲۰۔ ایجوکیشنل بک ہوس، سول لائن، شمشاد بلڈنگ۔ علی گڑھ)

یہ کتاب طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے اور چار ابواب پر تقسیم کی گئی — پہلے باب میں مضمون نویسی اور اس کے ۱۶۵ مختلف موضوعات

پر مختلف مضامین کے نمونے اور مفید اشارات —

دوسرے باب میں مشقی مضامین کا سلسلہ مع مختلف عنوانات اور ان کے تحت مفید اشارات —

تیسرے باب میں خطوط نویسی اور اس کے مختلف نمونے مع ضروری قواعد و ضوابط —

چوتھے باب میں مشہور ادیبوں اور مستند انشا پردازوں کے مکتوبات۔

خدا کرے مولفین کا منشا پورا ہو اور طلبہ اس کتاب کتاب کے مطالعہ سے اردو انشا پردازی سیکھ جائیں۔ لیکن ہمیں اس میں کسی قدر شبہ ہے۔ اس قسم کی ہدایتوں اور نمونوں سے انشا پردازی مشکل سے آتی ہے —

افسوس ہے کہ املا کی صحت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ کتاب پر ایک اور نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ لیکن مولفین کی محنت اور تلاش بلا شبہ قابل داد ہے —

نظر کے دھوکے۔

(مصنفہ شکیب صاحب۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے حیدرآباد ڈپو اور مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ سے مل سکتی ہے)

محمد بدرالدین خان شکیب بی۔ اے۔ ایل ایل بی (عثمانیہ) "سابق مدیر مہتمم مجلہ عثمانیہ" کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں "ایک حیدرآبادی نوجوان کی الوالعزمی، شجاعت اور رومان انگیزیاں"

(۱) گم شدہ لاش - (۲) انسانی خون - (۳) عارضی شوہر - (۴) پر اسرار شخصیت - (۵) شہادت واقعاتی - (۶) قتل گاہ کے عنوانات سے بیان کی گئی ہیں —

یہ تمام افسانے جہاں تک ہمارا خیال ہے Adventures of a Lady's man by William Le Queau سے ماخوذ ہیں - مگر لائق مصنف نے اس امر کا کہیں ذکر نہیں کیا - اور ان تمام افسانوں کو حیثیت سے پیش کیا ہے کہ گویا ان کی تصنیف ہیں - بیان کے لحاظ سے بھی اس میں اکثر جگہہ خامیاں پائی جاتی ہیں . مثلاً :

صفحہ (۱۱) پر "میں اس کے قریب پہنچا اور 'دل کی حرکت' معلوم کیا" یہاں فعل کو مونث استعمال کرنا چاہیے تھا -

اسی طرح صفحہ (۱۹) پر "ہم نے اس کو ..... لاکر کھڑا کردیے" صفحہ (۲۱) پر "فاقہ بدمست" اور "مبادا ان کی کارگذاری پر حرف نہ آجاے" مبادا کے ساتھہ 'نہ نفی' کا استعمال درست نہیں سمجھا جاتا —

صفحہ (۲۸) پر "اس عورت 'کی' ہمت اور ..... اس 'کی' جرءت ... تعجب خیز 'تھا'" —

صفحہ (۱۰۷) "میں نے لوگوں کا دیکھا دیکھی" دیکھا دیکھی زبان اردو میں مونث استعمال ہوتا ہے -

صفحہ (۱۰۸) "اگر میری موت کے متعلق کوئی چہ میگوئیاں ہوں" میں 'کوئی' کا استعمال جمع کے ساتھہ جائز نہیں سمجھا جاتا -

اسی طرح مصنف نے گفتگو لکھنے میں احتیاط نہیں برتی بعض جگہہ افسانوی مکالمہ لکھتے لکھتے خطابیت کی شان پیدا کردی ہے

صفحہ ۴۶ اور صفحہ ۴۷ پر اس کا نمونہ ہے یا صفحہ (۱۱۵) پر "فطرت کی وجد آفرینی موجوں کا یہ رقص پیہم اور مہتاب کی ضیا پاشیاں شاید اسی رشک ماہ کے انتظار میں فردوس بدوش تھیں" - یہ جملہ ایک عورت کے تالاب میں گرنے سے قبل حسین ساگر کی فضا کے متعلق استعمال کیا گیا ہے - جس سے اس امر کی غلط فہمی ہونے کا امکان ہے کہ مصنف بیجا طور پر اپنی علمیت کا اظہار کرنا چاہتا ہے —

پھر بھی شکیب صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ ان کی پہلی ہی افسانوی کوشش کافی دلچسپ ہے اور وہ ان افسانوں میں مقامی رنگ پیش کرنے میں بہت کامیاب رہے ہیں —

(ز)

ایمان سخن -

(مرتبہ مولوی سید محمد ایم - اے - قیمت بارہ آنے -
سید عبدالقادر تاجر کتب چار مینار، مکتبۂ ابراھیمیہ
عابد روڈ حیدرآباد دکن، جامعۂ ملیہ دھلی سے مل سکتی ہے)

سلسلہ انتخابات شعرائے دکن کا یہ پانچواں نمبر شیر محمد خاں المتخلص بہ 'ایمان' کے کلام کا انتخاب ہے - اس کے مرتب مولوی سید محمد ایم - اے (عثمانیہ) لکچرار اردو گورنمنٹ سٹی کالج ہیں - شروع میں 'دکن کی اردو شاعری' پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم - اے پی ایچ ڈی کا لکھا ہوا دیباچۂ عمومی ہے، اس کے بعد مرتب کا لکھا ہوا سولہ صفحے کا مقدمہ - دیباچہ اور مقدمہ دونوں اپنی اپنی جگہ خوب

ہیں - اور ان سے دکن کی شاعری کے متعلق خاصی معلومات ہوجاتی ہے - لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مدیر عمومی (ڈاکٹر 'زور') نے دکن کی اردو شاعری کے پانچویں دور کے قابل ذکر شعرا درگاہ 'شیدا' شفیق' تجلی' ایمان' قیس' چندا' شاداں' ایما' اور احساں قرار دیے ہیں (صفحہ ۱۲) - اور مرتب (مولوی سید محمد صاحب) نے ایمان اور ان کے مشہور شاگرد قیس' حفیظ' اور چندا کے علاوہ میر علی مردان خاں 'یکدل' (۱۲۰۹) محمد علی 'نیاز' محمد خاں 'نیاز' (۱۲۱۱) میر محمد ہاشم 'فقیر' (۱۲۱۲) مرزا محمد جاں نثار (۱۲۱۲) میر نجف علی خاں 'قدرت' اور مرزا داؤد 'ہنر' قرار دیے ہیں - اب ان میں سے کسے صحیح سمجھا جاے - لائق مرتب نے انتخاب میں کچھہ سہل انگاری سے بھی کام لیا ہے - مثلاً:

صفحہ ۷۸ پر

چاہے ہے ایمان کہ ہو دولت بیدار نصیب
رہو غافل نہ کبھی وقت سحر سے ہرگز

مصرعہ اولیٰ میں ایک "ہے" زیادہ ہے —

صفحہ ۷۹ پر

مجھہ سے کل گور غریباں میں کہا عقل نے یوں
اور کچھہ یاں نہ سوا حسرت و غم کے ہے تہ خاک

مصرعہ ثانی میں "کے" زیادہ ہے جس کی وجہ سے مصرعہ ناموزوں ہوگیا —

صفحہ ۸۳ پر

ہم سے عمل نیک ہوئے کب جب تلک ترا کچھہ کرم نہ ہوا

ناموزوں ہے —

صفحہ ۸۰ پر

مے خوار الجھ جاوے ' ستمگار الجھ جاوے '

والی غزل کی ردیف ' جائے ' ہونا چاہیے ورنہ ' جاوے ' کی وجہ سے مصرعہ ناموزوں ہوجائے گا —

صفحہ ۹۸ پر

ہے زہد خشک کا اب تر اسباب عصا فوارہ و تسبیح دولاب

مصرعۂ اولیٰ میں ایک لفظ کی کمی ہے —

اس کے علاوہ کتابت کی بھی بہت زیادہ غلطیاں ہیں - قدیم شعرا کا کلام طبع کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اُس زمانے کے تلفظ کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے اور کتابت کی غلطیوں کا بھی جو اگرچہ آج کل ناگزیر ہیں مگر اس قسم کی علمی کتابوں سے کوشش کرکے دور کرنی چاہییں —

مرتب کے مقدمہ سے ' ایمان ' کے حالات باتفصیل معلوم ہوتے ہیں اور ان کی شاعری کے متعلق اندازہ کرنا بہت آسان ہوجاتا ہے اور مرتب نے شاعر کے ماحول کو کامیاب طریقے سے پیش کیا ہے —

(ز)

پریم سوگ

(مرتبۂ محمد حسام الدین خاں صاحب غوری - قیمت آٹھ آنے -

مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن)

اس کتاب میں " منشی پریم چند جی کی حیات اور ان کی خصوصیات تحریر "

پر تبصرہ کیا گیا ہے - جیسا کہ خود صاحب کتاب نے صفحہ د پر تحریر فرمایا ہے " اس تذکرہ کا مطالعہ طلبا کے لیے منشی صاحب کی خصوصیات تحریر سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا ' سلیس اور عام فہم انداز بیان بھی غالباً اسی وجہ سے اختیار کیا گیا - کتاب میں سب سے زیادہ نمایاں چیز محمد حسام الدین خاں صاحب اور منشی پریم چند کے آپس کے تعلقات کا ذکر ہے —

(ز)

یادگار محشر

(مرتب اشفاق حسین خاں صاحب گورکھپوری -

مطبوعۂ آسی پریس گورکھپور)

یہ جوانا مرگ شاعر عبیداللہ محشر تمیمی کا مجموعۂ کلام ہے جسکو ان کے دوست اشفاق حسین خاں صاحب نے مرحوم کے انتقال پر بطور یادگار شائع فرمایا ہے - ' محشر ' تمیمی مرحوم کی ۲۱ سال کی عمر میں رحلت واقعی ایک درد ناک سانحہ ہے - پھر اس حالت میں کہ مرحوم میں ایسے ادبی جوہر موجود تھے جن سے ان کی شاعری کے متعلق بہت شاندار توقعات کی جاسکتی تھیں - مجنوں صاحب گورکھپوری نے صفحہ (ج) پر یہ لکھنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کیا کہ " ان کا کوئی شعر صداقت اور اثر سے خالی نہیں ہے " —

اللہ رے فریب تماشائے رنگ و بو دنیا کو بھی نظر نے پری خانہ کر دیا

ہر اشارہ چشم ساقی کا مکمل ذوق ہے دل کو پیمانہ بنا لیں شوق کو صہبا کریں

زندگانی ہے ازل کی اک صدائے بازگشت سن رہا ہوں میں جسے وہ دور کی آواز ہے

ایسے شعر اس مختصر مجموعے میں کافی تعداد میں ہیں - انہیں سے ان کی ہونہاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے —

اشفاق حسین صاحب نے اس مختصر یادگار کو شائع کر کے نہ صرف حق دوستی ادا کیا بلکہ ایک ادبی خدمت بھی انجام دی ہے کتاب اعلیٰ درجے کے کاغذ پر بہت اچھی چھپی ہے —

(ز)

تعلیم

سلسلۂ گلدستۂ تعلیم اسلام

(مولفہ مولانا محمد عماد الدین صاحب انصاری
ناظم شعبۂ دینیات اسلامیہ ہائی سکول جالندھر)

فاضل مولف نے مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کے لیے یہ سلسلہ لکھا ہے - تعلیمی تدریج اور سلاست زبان کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے - اور وہ تمام ضروری معلومات، جن سے ہر مسلمان بچے کو آگاہ ہونا چاہیے، اس میں موجود ہیں —

یہ سلسلہ فی الواقع اِس قابل ہے کہ تمام اسلامیہ سکول اسے داخل نصاب کریں - تقطیع نہایت مناسب، چھپائی اچھی اور کاغذ عمدہ ہے - البتہ کتابت میں بعض غلطیاں رہ گئی ہیں جو اگلے ایڈیشن میں امید

ھے ' رفع ھو جائیں گی —

سلسلۂ تعلیم القرآن

یہ سلسلہ بھی مولانا محمد عماد الدین صاحب کے قلم سے نکلا ھے -

قابل مولف نے قرآنی تعلیمات کو نہایت آسان اور عام فہم پیرائے میں پیش کیا ھے - اس میں قرآن پاک کے سمجھنے کے لیے معلے اور تفسیر سلیس اُردو میں دیے گئے ھیں - شروع میں ایک بسیط مقدمے اور آخر میں لغات القرآن کا نہایت مفید اضافہ کیا گیا ھے —

حقیقت میں یہ قرآن اور اسلام کی بہت بڑی خدمت ھے - سر دست صرف دو حصے شائع ھوئے ھیں - قیمت حصہ اول ۴ آنے حصہ دوم کی قیمت سہو کتابت یا کسی اور وجہ سے درج نہیں ھوئی —

ھر دو سلسلے کتب خانہ انصاریہ جالندھر شہر نے شائع کئے ھیں —

تلمیحات و اشارات در ادب فارسی (انگریزی)

(مرتبہ زال - ایس - آر - ایرانی صاحب)

اس کتاب میں تقریباً وہ تمام تلمیحات آگئی ھیں - جن کا ذکر بمبئی یونیورسٹی کے امتحانات فارسی کے نصاب میں آتا ھے - مولف نے اِن کی نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھہ تشریح کر دی ھے -

امیدواران امتحانات فارسی کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ھے -

قیمت ۸ آنے - ملنے کا پتہ — حاجی آغا شیرازی اینڈ سن تاجران کتب جہل روڈ ' صدر کھاڑی ' بمبئی

پستالوزی

(مصنفۂ ڈاکٹر عبدالمجید صاحب زبیری بی - اے (جامعہ) ایم - اے ' پی ' ایچ ' ڈی (برلن) مجلد قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - مکتبۂ جامعۂ ملیہ ' قرول باغ ' دھلی)

اس کتاب کی اشاعت کا سہرا بھی مکتبۂ جامعہ ملیہ کے سر ہے ' ' روسو ' کے ' معاہدۂ عمرانی ' کے ساتھ ساتھ نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کے مشہور ماہر تعلیم ' پستالوزی ' کے فلسفے اور اس کے تعلیمی نظریوں سے اردو داں طبقے کو مانوس کرانا جامعہ کا قابل تعریف کارنامہ ہے —

فاضل مصنف نے اپنی کتاب کو ایک مقدمے اور چہار ابواب پر تقسیم کیا ہے ' مقدمہ جو ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے بجائے خود اٹھارھویں صدی عیسوی کے یورپی تمدن ' فلسفہ اور مذہب پر ایک جامع تبصرہ ہے ' چار ابواب میں علی الترتیب پستالوزی کی شخصیت اس کے فلسفۂ تمدن ' فلسفۂ مذہب اور فلسفۂ تعلیم سے بحث کی گئی ہے —

پستالوزی ایک جیّد مفکر اور فلسفی تھا ' اور اس کی متعدد تصانیف اس پر شاہد ہیں ' لیکن عام طور پر وہ ماہر و مصلح تعلیم کی حیثیت سے روشناس ہے ' اس لیے زیر تبصرہ کتاب کا باب چہارم خاص طور پر ان حضرات کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو اس پاک سیرت اور بلند خیال "مدرس" کے تعلیماتی خیالات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں - ' پستالوزی ' نے "انسانیت" کی ترقی کی دھن اور اس کی فلاح و بہبود کے راستوں کی کھوج میں سیاست تمدن قانون سب کی چھان بین کی ' اور ہر طرف سے تھک کر آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ بنی نوع انسان کی مستقل اور

پائیدار اصلاح کی امید اگر کہیں ہے تو ابتدائی تعلیم میں ہے اس لیے اس نے اپنے توانائے عمل کا رخ اسی میدان کی طرف پھیر دیا، اور "بچہ کی نفسیات" کو تعلیماتی نظریہ اور اصول میں وہ اہمیت دی جو آج تک قائم ہے - اس میں شک نہیں کہ اس ایک صدی میں جو پستالوزی کے زمانے اور عصر حاضر کے درمیان گزری ہے، تعلیماتی نظریوں میں بہت کچھ تلاش اور تحقیق کی گئی ہے - نفسیات پر، خصوصاً نفسیات اطفال پر بیش بہا کام ہوا ہے، لیکن اس کام کی اولیت کا شرف اس ضعیف الجثہ مگر صائب الرائے بڈھے 'مدرس' ہی کو حاصل ہے جس نے سب سے پہلے بچے کی ذہنی آزادی کا علم بلند کیا، اور اسے ایک "نامی" ہستی کی طرح تعلیم دینے کا مطالبہ کیا —

کتاب از اول تا آخر زبان اور خیال کی پوری قدرت کے ساتھ لکھی گئی ہے، فاضل مصنف "پستالوزی" کی زندگی میں تو یے ہوے ہیں، انہوں نے اس کا ہر حیثیت سے مطالعہ کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیرت کے پہلوؤں اور اس کے تصورات اور نظریوں کے پس منظر کی تصویر ایسے نقوش میں اتاری ہے جس سے ان کا تبحّر ظاہر ہوتا ہے —

کتاب مجلد اور چھوٹی تقطیع پر ہے - ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، آخر میں فہرست اصطلاحات علمیہ اور فہرست اسمائے مصنفین اور ضمیموں کے لگائی گئی ہے، قلم بہت باریک ہے، اگر دوسرے اڈیشن میں کسی قدر جلی کر دیا جائے تو بہتر ہوگا -

(و)

متفرقات

معاہدۂ عمرانی یا اصول قانون سیاسی -

(مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی - مجلد قیمت دو روپے - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

یہ کتاب فرانسیسی حکیم "ژان ژاک روسو" کی مشہور کتاب "Social Contract" کا ترجمہ ہے جسے ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ایم - اے ' پی ' ایچ ' ڈی پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی نے مصنف کی اصل فرانسیسی کتاب سے کیا ہے - فاضل مترجم کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دس بارہ سال پہلے جامعہ ملیہ نے اس کتاب کا ترجمہ "عقد اجتماعی" کے نام سے مولوی محمد مسلم صاحب ایم - اے سے کرایا تھا جس کا کچھہ حصہ تلف ہوگیا ' چنانچہ فاضل مترجم نے بجائے اس کی تکمیل کے ' پورا ترجمہ خود ہی کرلیا ' دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے بھی اسی کتاب کا ترجمہ اسی نام سے کرایا ہے - لیکن شاید اس کی اشاعت کی نوبت اب تک نہیں آئی ہے —

' روسو ' کے نام سے ہر وہ شخص جو انگریزی داں ہے یا سیاسیات سے تھوڑی بہت دلچسپی بھی رکھتا ہے ضرور واقف ہے ' اس کی بے چین شخصیت نے اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں نہ صرف فرانس بلکہ سارے یورپ میں

تہلکہ ڈال دیا تھا ' یورپ کی سیاسیات میں انسانی عنصر ' انسانیت کی عظمت ' اور '' ادارہ اجتماعی '' کے تصورات اسی کے داخل کیے ہوے ہیں - اس کی اس کتاب کا پہلا فقرہ '' انسان آزاد پیدا ہوا ' مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے '' وہ اعلان جنگ تھا جس نے استبدادی حلقوں میں تہلکہ ڈال دیا تھا - تقریباً دو صدی گزر جانے اور دنیا کے حالات بدل جانے کے بعد بھی اس کی یہ کتاب سیاسیات کی ' کلاسک ' ہے ' اور ہم ' جامعہ ملیہ ' اور فاضل ' مترجم ' دونوں کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی کے اس دور میں اس کتاب کو شائع کیا ' ہمیں امید ہے کہ ہمارے نوجوان اس کا مطالعہ بہ نظر غائر کریں گے ' اور '' نعروں '' اور '' جیکاروں '' کے سیلاب میں بہنے کی بجاے ' طالب علمانہ حیثیت سے سیاست کی گتھی سلجھانے کی کوشش کریں گے —

فاضل مترجم نے کتاب کے شروع میں ۳۷ صفحات کا ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں ' روسو ' کی سوانح ' اس کے زمانے کے تاریخی پس منظر ' اور اس کے نظریات کو بڑی محنت کے ساتھ اور شرح و بسط سے بیان کیا ہے ' کتاب کے شروع میں مصنف کی تصویر بھی ہے - آخر میں انگریزی اور اردو حروف تہجی کے اعتبار سے اصطلاحات کی فرہنگ بھی شریک ہے ' جو ناظرین کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی —

(و)

———

اُردُو کے جدید رسالے

تنویر –

(اڈیٹر سحر صاحبہ - سالانہ چندہ تین روپیہ آٹھہ آنے
تہرڈ سانکلی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸)

یہ ماہانہ رسالہ بمبئی سے شایع ہوا ہے - اس کی اڈیٹر ایک خاتون ہیں - مضامین زیادہ تر ادبی اور معاشرتی ہوتے ہیں - فسانے اور نظمیں بھی ہوتی ہیں - رسالے کی ترتیب میں محنت اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے - مضامین کی عبارت صاف اور صحیح ہوتی ہے - خیالات میں آزادیٔ فکر پائی جاتی ہے - بمبئی سے ایسے رسالے کی اشاعت بہت غنیمت اور قابل قدر ہے - شہر بمبئی میں اردو زبان کا رواج ایک مدت سے چلا آرہا ہے - اب بھی اردو کے متعدد اخبار اور رسالے شایع ہوتے ہیں - بمبئی شہر صوبہ بھر کے لیے اردو کا بہت اچھا مرکز ہوسکتا ہے —

مشعل -

(اڈیٹر مفتی عزیزالرحمن صاحب، بی - اے ؛ پی - ای -
ایس - گورنمنٹ ٹریننگ اسکول (مردانہ) پشاور -
سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھہ آنے)

یہ ماہانہ رسالہ صوبۂ سرحد کے مدرسۂ تعلیم المعلمین سے شایع ہوتا

ہے - اس لیے اس میں تمام مضامین تعلیمی اور علمی ہوتے ہیں اور جس طرح مدرسین اور طلبہ کے لیے مفید ہیں' ویسے ہی عام شائقین کے لیے بھی کار آمد ہیں —

اس رسالے کے پہلے نمبر میں ایک مضمون "اردو کی ترویج اور صوبۂ سرحد" پر ہے - اس میں صوبۂ سرحد کی زبانوں پر مدلل بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ حالات میں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہی ہونا چاہیے اور یہ نہ صرف صوبۂ سرحد کے حق میں بلکہ بلحاظ تعلقات سارے ملک کے لیے بہتر اور مناسب ہوگا - جن لوگوں نے اس صوبے میں ہندی اردو کا جھگڑا کھڑا کیا ہے وہ ہندستان کے دوست نہیں ہوسکتے وہ خواہ مخواہ دو قوموں میں نفاق پیدا کر کے سارے ملک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں —

خاص نمبر

خاتون سرحد -

(اڈیٹر ش - ت بنت میاں غلام صمدانی مرحوم

سالانہ چندہ قسم اول چار روپے اور قسم دوئم دو روپے)

خاتون سرحد' پشاور کا یہ خاص نمبر اچھا خاصا ضخیم ہے اور اس میں ہر قسم کے دلچسپ اور مفید مضامین ہیں - خصوصاً ایسے مضامین کی تعداد زیادہ ہے جن کا تعلق انتظام خانہ داری اور صحت و صفائی

سے ہے - یہ خاص نمبر بڑی خوبی سے مرتب کیا گیا ہے - متعدد رنگین تصویریں بھی ہیں —

پھول باغ پٹیالہ کا سالانہ نمبر -

یہ خاص نمبر بڑی تقطیع کا ۱۶۲ صفحے پر ہے - جس میں مختلف مضامین ' نظموں ' فسانوں وغیرہ کی تعداد ۶۴ ہے - مضامین کی نوعیت بھی متعدد ہے - مثلاً اخلاقی ' ادبی ' تفریحی ' تعلیمی اور بچوں کے لیے خاص مضامین - آخر میں ایک خاص پٹیالے سے متعلق ہے جس میں والیء ریاست اور بعض مشاہیر پٹیالہ کے حالات درج ہیں - قابل اڈیٹر نے ملک کے اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں سے مضامین حاصل کیے ہیں اور اپنے رسالے کو فی الحقیقت پھول بنا دیا ہے —



اردو

جلد ۱۸ | اپریل سنہ ۱۹۳۸ ع | حصہ ۷۰

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

دی اسٹینڈرڈ انگلش - اردو ڈکشنری

مرتبہ

انجمن ترقی اُردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے - اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے - چند خصوصیات ملاحظہ ہوں :-

(۱) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے - انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں -

(۲) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے - اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں -

(۳) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لیے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دے دیا گیا ہے -

(۴) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا - ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے -

(۵) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لیے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کے لیے تمام اردو ادب ' بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے - یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی -

(۶) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کیے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں -

(۷) اس لغت کے لیے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے - طباعت کے لیے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کیے گئے ہیں - جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے -

(ڈمائی سائز - صفحات ۱۵۱۳ + ۳۳) قیمت سولہ روپے کلدار علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقیٔ اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوسکتی ہیں

— (نظامی پریس بدایوں) —

خطوط سر سید	تین روپے
لیتھو گرافی	دو روپے آٹھہ آنے
دیوان غالب مع شرح	دو روپے آٹھہ آنے
دیوان غالب اردو	ایک روپیہ آٹھہ آنے
قاموس المشاهیر	چھہ روپے
غزلیات ذوق	ایک روپیہ آٹھہ آنے
دیوان جان صاحب مجلد	ایک روپیہ آٹھہ آنے
انتخاب زریں مجلد	دو روپے
مراثی میر انیس جلد اول مجلد	دس روپے
مراثی میر انیس جلد دوم قسم دوم	پانچ روپے
مراثی میر انیس حصہ سوم قسم اول آرٹ پیپر	آٹھہ روپے
مراثی میر انیس حصہ سوم قسم دوم	چھہ روپے
انقلاب دهلی	ایک روپیہ آٹھہ آنے
رباعیات شاد	ایک روپیہ
دیوان درد	ایک روپیہ چار آنے
قصائد ذوق	ایک روپیہ آٹھہ آنے
سکہ اور شرح تبادلہ	ایک روپیہ

-(تصانیف نور الهی و محمد عمر صاحبان)-

تین ٹوپیاں	آٹھہ آنے
قزاق	آٹھہ آنے
ناٹک ساگر (یعنے دنیاے ڈراما کی تاریخ) مجلد	تین روپے
غیر مجلد	دو روپیہ آٹھہ آنے
ناٹک کتھا	آٹھہ آنے

- (مطبوعات هندستانی اکاڈیمی الہ آباد) -

عرب و هند کے تعلقات	چار روپے
کبیر صاحب	دو روپے
اردو زبان و ادب	ایک روپیہ
ناٹن	دو روپے آٹھہ آنے
فریب عمل	دو روپے
قرون وسطی میں هندوستانی تهذیب	چار روپے
هندی شاعری	دو روپے
فلسفۂ نفس	ایک روپیہ
عالم حیوانی	چھہ روپے آٹھہ آنے
معاشیات ؛ مقصد اور منهاج	ایک روپیہ

— (کتابستان الہ آباد) —

مثنوی ناسخ	بارہ آنے
بس کا روکھہ	ایک روپیہ
تاریخ اسلامی حصہ اول	آٹھہ آنے

انجمن ترقی اردو (هند) اورنگ آباد دکن

کا

کتب خانہ

انجمن ترقیء اردو (هند) اورنگ آباد دکن نے اپنا ایک عظیم الشان کتب خانہ حیدرآباد دکن میں عابد شاپ پر قائم کیا ہے ؛ هندوستان کے مشہور و معروف اردو کے اشاعت خانوں کی جملہ مطبوعات اور انجمن کی تمام کتابیں اس کتب خانے سے دستیاب هوسکتی هیں -

المشتہر

منیجر انجمن ترقی اردو (هند) اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابت اپریل سنہ ۱۹۳۸ ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	کنول پھول ' اور تمدن میں اس کی اہمیت	جناب امین الدین خاں صاحب بی - اے	۲۳۳
۲	اردو زبان کے قدیم کتبے	عبد الحق اڈیٹر " اردو "	۲۷۶
۳	بنگالی اور اردو	جناب محمد اجمل خاں صاحب ایم - اے ایل ایل - بی محقق اسلامیات شانتی نکیتن (بنگال)	۲۸۲
۴	فارسی غزل	جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی بی لٹ ' (آکسفورڈ) آئی - سی - ایس	۳۶۹
۵	میر انیس کے غیر مطبوعہ اشعار	جناب قاضی عبد الودو صاحب بیرسٹر ایٹ لا ' پٹنہ	۴۱۵
۶	لکھنؤ کا ایک لطیفہ	جناب پنڈت کشن پرشاد کول صاحب	۴۱۹
۷	ادبی معلومات	" ناظرا "	۴۲۷
۸	افکار و واقعات	اڈیٹر	۴۳۵
۹	تبصرے	اڈیٹر و دیگر حضرات	۴۸۱
۱۰	اشتہارات	منیجر انجمن ترقیء اردو (ہند) اور دیگر مشتہرین	

اقبال مرحوم

اقبال کی موت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے - ایسا بلند خیال اور عالی فکر شاعر صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے ساتھ ہی ہندستان سے شاعری بھی اُٹھ گئی - مولانا 'حالی' کے بعد شاعری سے اگر کسی نے حقیقی کام لیا تو وہ اقبال تھا —

اس کے کلام نے دلوں میں گرمی اور خیالات میں انقلاب پیدا کردیا تھا - اس نے قومی اور ملّی مسائل میں خیال و فکر کی رو بدل دی تھی - بیسیوں لفظ' خاص خاص ترکیبیں اور بعض خاص خیال اور افکار ہندستان کے اردو ادیبوں اور شاعروں میں محض اقبال کے کلام کی بدولت سکۂ وقت کی طرح رائج ہوگئے تھے —

اس کے کلام نے اردو زبان کا رتبہ بڑھا دیا اور یہ ثابت کردیا کہ اس میں کتنی وسعت و قوت اور صلاحیت ہے جب تک اردو زبان زندہ ہے اس کا کلام زندہ رہے گا اور پڑھنے والوں کے دلوں میں ولولہ' فکر میں بلندی' جذبات میں درد اور تخیّل میں پرواز پیدا کرتا رہے گا —

عبدالحق

کنول پھول، اور تمدن میں اس کی اہمیت

از

(جناب امین الدین خاں صاحب بی اے)

انسان، باوصف اپنے دعوائے ہمہ دانی و ہمہ گیری کے ابھی تک ویسا ہی چلا آتا ہے، جیسا کہ حضرت آدم کے وقت میں تھا- وہ اپنی پیش پا افتادہ چیزوں کو ٹھکراتا چلا جاتا ہے، اور حملے کرتا ہے تو آسمان کے ستاروں پر- اس سے کہا جاتا ہے کہ

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار

ہر ورق دفتر ے است معرفت کردکار!

مگر وہ اپنے غرور عالم گیری میں ایک نہیں سنتا؛ دوڑتا چلا جاتا ہے اور نہیں دیکھتا کہ کتنی بیش بہا دولتیں اس کی غفلت اور اس کے تبختر پر نثار ہوی چلی جاتی ہیں- وہ چیزیں، جن کو وہ حقیر و ذلیل سمجھتا ہے، دست حال سے اس کا دامن پکڑ کر اس کو متوجہ کرتی ہیں، مگر اسے اتنی فرصت کہاں کہ نگاہ بھر کر بھی ان کو دیکھ لے- دنیا کی لاتعداد چیزوں میں سے کسی نے اسے جب ایسا پکڑا کہ اسے متوجہ ہوتے ہی بنا تب تو اس نے اس چیز کی طرف توجہ کی، اس کی ماہیت پر غور کیا، اور اس سے کام لینا شروع کر دیا- پھر اسی پر بس نہیں کرتا- اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس سے کام لیتے لیتے انسان خود اسی کا غلام بن

جاتا ہے - ان ہی چیزوں میں سے ایک وہ نباتی چیز ہے جو ہمارا زیب عنوان ہے ' یعنی کنول پھول —

کنول ایک مشہور و معروف پھول ہے ' اہل ایران اسے نیلوفر ' نیلوفل ' نیلفر ' نیلوپر ' نیلوپل اور نیلوپرگ * کہتے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ " نیلوفر " ہندی لفظ نیلوپھل † ہی کا معرب ہے ' کیوں کہ " نیل (ہندی زبان میں پانی ‡ کو کہتے ہیں اور پھل ثمر ہے " - صاحب غیاث اللغات نے رسالۂ § معربات کے حوالے سے لکھا ہے کہ نیلوفر لفظ نیلوپل کا معرب ہے - ایک اور قول یہ ہے کہ نیلوفر ایک فارسی اسم ہے $ جس کے معنی ہیں نیلے پروں والا (نیل ' پر) - یہ قیاس غالباً اس قیاس پر مبنی ہے کہ فر اور پر میں صوتی مناسبت ہے ' اور فرکو فارسی پر کی معرب صورت سمجھ لیا گیا ہے - صاحب ہفت قلزم کا خیال ہے کہ نیلوفر وہی چیز ہے جسے عربی میں قاتل النحل کہتے ہیں ¶ - ابن سیرین نے نیلوفر کا نام لیلوفور لکھا ہے ' ** ہندی میں اس کو کنول اور کمل کہتے ہیں ' مگر کیول

---

* آئندہ صفحوں میں ہندی متھیا کے سلسلے میں " نیلوت پل " (नीलोत्पल) کا ذکر ہوگا - یہ لفظ اسی ایرانی تلفظ سے متعلق معلوم ہوتا ہے - ممکن ہے کہ یہ ایرانی تلفظ اسی ہندی (دراوڑی ؟) لفظ ہی کی ایک صورت ہو! —

† مخزن الادویہ از میر محمد حسین خراسانی سنہ ۱۱۷۸ ھ ' نیلوفر -

‡ اصلی سنسکرت میں نیر (ی معروف سے नीर) ہے - اسی سے " نیرا " ہے - جنوبی ہند کی تامل زبان میں پانی کو تنّیر (اور مخفف کر کے تنی) کہتے ہیں -

§ غیاث اللغات ' نیلوفر -

$ جامع المفردات از ابن بیطار ' نیلوفر -

¶ ہفت قلزم از مولوی مقبول محمد ' نولکشور کانپور سنہ ۱۸۹۱ م ' نیلوفر -

** منتخب الکلام فی تفسیر الاحلام (تعطیر الانام کے حاشیے پر) از محمد ابن سیرین ' ص ۲۳۲ -

(ی سے) غلط ہے - مولوی رشید احمد * سالم کا خیال ہے کہ کیول اصل میں (بقول ان کے "حقیقتاً") کیوا (ی مجہول سے) ہوگا - اس کی شہادت میں مولوی صاحب نے جائسی (ملک محمد ؟) کا یہ قول نقل کیا ہے :-

سورگ سور بھوئیں سرور کیوا بن کھنڈ بھنور ہور ہوے رس لیوا

صاحب تاج العروس کا بیان ہے کہ اہل مصر کے ہاں بھی اس پھول کا نام نوفر ہے † —

ماہیت یہ پھول جھیلوں، تالابوں اور دلدلوں میں گرمی کے زمانے میں، جب کہ بارش کا موسم ہوتا ہے، پیدا ہوتا ہے - اس کے پودے کی جڑیں چھوٹی، سیدھی، گول اور نلکی دار ہوتی ہیں - اس کا تنا نرم، چکنا، مجوف اور طولانی ہوتا ہے، زیادہ موٹا نہیں ہوتا - اس کی ٹہنیاں پانی میں ڈوبی ہوئی لمبی لمبی ہوتی ہیں، پتے چوڑے اور دو سے چھ فٹ تک لمبے ہوتے ہیں - پتوں کے کنارے پیچ دار اور کٹے ہوے ہوتے ہیں اور پانی کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں - اس کے پھول دو سے دس انچ تک کے قطر ‡ کے ہوتے ہیں - کنول کی ایک قسم § کو انگریزی میں (Nelumbium Speciosum) کہتے ہیں اور اس میں پچیس سینٹی میٹر کے قطر کے پھول لگتے ہیں - پھول کی پنکھڑیاں بیضوی شکل کی اور مجوف ہوتی ہیں، اس میں ایک وقت میں صرف ایک ہی پھول لگتا ہے —

---

* جواہر خسروی از امیر خسرو مصححہ رشید احمد سالم (علی گڈھ سنہ ۱۹۱۸ ع)، فرہنگ خالق باری، ص ۳۱ -

† تاج العروس، مصر سنہ ۱۳۰۶ ھ لفظ نیلوفر -

‡ Glossary of Batanic Terms by R. L. Heining، بیان Nymphaeceae -

§ The Natural History of Plants by kerner and Oliver، ج ۲، ص ۱۸۵

کہتے ہیں کہ * یہ پھول طلوع آفتاب کے ساتھہ پانی سے سر باہر نکالتا ہے اور پھر غروب آفتاب کے ساتھہ پانی میں ڈوب جاتا ہے - ایک اور روایت ہے کہ نیلوفر کے پانی میں ڈوبتے وقت ایک پرند آتا ہے اور اس کے بیچ میں بیٹھہ جاتا ہے - صبح کو جب نیلوفر پانی کے اوپر آتا ہے اور منہ کھولتا ہے، تو وہ پرند اڑ جاتا ہے اور رات کو پانی سے کوئی زحمت نہیں اٹھاتا - یہ تو عام روایت ہے، جو صاحب "برہان" نے بیان کی - اتفاق ملاحظہ ہو کہ کاوش کرنے والوں نے حضرت شاہ جہاں بادشاہ شاہنشاہ ہند کے سوانح میں بھی ایک نیچ کا واقعہ ڈھونڈہ نکالا ہے، جس میں کسی شاعر نے اس نوعیت کی مضمون آفرینی کی ہے - مہرچی بھائی کوکا نے فارسی زبان کے لطائف وظرائف بیان کرتے ہوے بادشاہ موصوف کے حرم کا ایک واقعہ یوں قلمبند کیا ہے کہ: ایک بار حرم شاہی کی ایک خاتون کے لب کا مصنوعی تل شاہ جہاں بادشاہ کے بوسے سے محو ہوگیا - اس نے ظریفانہ طور پر کہا کہ 'زاغ ازدھاں پرید' دوسرے دن بادشاہ نے درباری شعرا سے اس جملے کو موزوں کرنے کی فرمایش کی - ایک بدیہہ گو نے کہا:

نیلوفری چو دوش دھن گرد آورید زنبور مست بود کہ آمد دراں خلید
چوں آفتاب دید دھن خندہ را کشاد در عین خندہ بود کہ زاغ ازدھاں پرید

صاحب بہار عجم کا قول ہے کہ نیلوفر کی دو قسمیں ‡ ہیں: آفتابی

---

* ٹیلوفر در برہان قاطع، مطبع افضل المطابع، کلکتہ، سنہ ۱۲۵۱ ھ مطابق سنہ ۱۸۳۶ ع -

† Wit, Humour and fancy of Persia از مہر جی بھائی نوشیرواں جی کوکا، بمبئی سنہ ۱۹۲۳ ع، صفحہ ۱۲ -

‡ بہار عجم، ٹیلوفر

یا شمسی، اور ماہتابی یا قمری - آفتابی نیلوفر سرخ ہوتا ہے، اور طلوع آفتاب کے وقت کھلتا ہے - ہندی میں اسے کنول کہتے ہیں - ماہتابی کی دو قسمیں ہوتی ہیں : ایک سفید محض ہوتا ہے اور دوسرا نیلاہٹ کے ساتھہ سفید ہوتا ہے - یہ دونوں قسمیں شام کے وقت کھلتی ہیں - شاعر حسین سنائی نے اس کو خوب بیان کیا ہے :

ہوائے سیلئی حلم تو گربرو بوزد کبود رنگ شود ہمچو نیلوفر آتش

اسی شاعر کا ایک اور قول ہے :

زبسکہ بے تو بتن نیلوفر ہمی کارم فضائے سینہ با طراف آسماں ماند

محقق پٹری * (Petrie) نے اس کی تین قسمیں بیان کی ہیں :

(۱) گلابی نیلوفر (Nelumbium Speciosum) ، جس کی پنکھڑیاں کلی کی حالت میں تہ بہ تہ اور محراب دار ہوتی ہیں —

(۲) سفید (Nymphaea Lotus) ، جس کی پنکھڑیاں نس دار ، اور کھل جانے پر گول ہوتی ہیں —

(۳) نیلا (Nymphaea Caerulae) ، جس کی پنکھڑیاں چکنی اور نوک دار ہوتی ہیں - صاحب مخزن الادویہ نے اس کی ایک اور قسم زرد رنگ کی بھی بیان کی ہے لیکن وہ بہت کمیاب ہے - سفید کنول بکثرت پایا جاتا ہے ، اس سے کم نیلے رنگ کا ، اور اس کے بعد سرخ ارغوانی بہترین کنول سفید اور نیلا ہوتا ہے —

کنول کے پودے میں سیب † کے برابر گول سا پھل لگتا ہے - اس کے

---

* Encyclopaeadia of Religion and Ethics ' لفظ Lotus

† مخزن الادویہ ' نیلوفر -

اندر سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بیج ہوتے ہیں - بیج کے اوپر کا حصہ سرخی مایل ہوتا ہے، اور نیچے کا حصہ سیاہ لمبا، بعض گول اور کڑوا ہوتا ہے - جب پھل میں کیڑے نہیں لگتے تو وہ پک جاتا ہے اور استعمال میں لایا جاسکتا ہے —

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیلوفر ایک پھل * بھی ہوتا ہے - خان آرزو نے چراغ ہدایت میں لکھا ہے کہ † نیلوفر علاوہ اس مشہور و معروف پھل کے، جو پانی میں ہوتا ہے، ایک دوسرا پھول بھی ہے جس کی بیل دوسرے درخت پر لپٹی ہوتی ہے، اور وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے - صاحب غیاث نے قاسم گون آبادی کا یہ قول (شاہنامہ اسمعیل صفوی سے) نقل کیا ہے :

پسر محکم بدوش نیک بختاں چو نیلوفر کہ پیچد بر درختاں

یہ پھول ہندوستان، فارس اور مصر میں بکثرت پایا جاتا ہے - ہندوستان کے لیے سرخ کنول مخصوص ہے - مصر میں سرخ آج کل سوا ان چند مقامات کے جہاں خاص طور پر اس کی کاشت ہوتی ہے، کہیں نہیں ملتا - اہل روما جب مصر میں پہنچے ہیں، اس زمانے میں یہ پھول وہاں پایا جاتا تھا چنانچہ اس کا ثبوت یونانی مصنفوں کی تحریروں میں ملتا ہے - علاوہ اس کے یہ پھول اب بھی ہوارا کے قبرستان میں نظر آتے ہیں اتھنے اوس (Athenaeus) کا بیان ہے کہ " کنول دلدلوں میں اُگتا ہے، اور گلاب کی طرح کا ہوتا ہے - اس کے گوندھے ہوے مالے کو انتی نس (Antinous) کا مالا کہتے ہیں - ایک دوسری قسم نیلے رنگ کی ہوتی ہے، اور اس کے مالے کو کنول کا مالا کہتے ہیں - " اس وقت سے قبل ہردوت

---

* غیاث اللغات، نیلوفر

† Encycl. Relig. Eth. ، تحت Lotus

کے زمانے میں بھی یہ پھول موجود تھا - چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ " کنول دریا میں اُگتا ہے - اس کا پھل ایک پوٹلی میں ہوتا ہے - اس کے اندر بہت سی بھریاں ہوتی ہیں، جو کھائی جاتی ہیں " - تاہم اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سرخ کنول کبھی مصر میں پیدا ہوتا تھا - گو بعض مصنفوں نے اس کی نظیریں پیش کی ہیں، مگر وہ عموماً صحت سے دور ہیں - مثلاً، سیاح لورے (Loret) لکھتا ہے کہ وہ کنول، جو 'ہوررس دیوتا' کی مورت میں سہارا دیے ہوئے نظر آتا ہے، سرخ رنگ کا ہے - لیکن اس کی پنکھڑیاں صاف کنارے کی ہیں - وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ وہی کنول بادشاہ نفرترم (Nefertum) کی تصویر کے سر پر بھی بنا ہوا ہے - لیکن وہ سفید رنگ کا معلوم ہوتا ہے - وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ سرخ کنول مصری مقبروں یا روضوں میں کہیں نہیں ہے - جو ستون ممفس (Memphis) میں ملا ہے، اس میں قدیم تر ستونوں کے کنولوں کی طرح سفید کنول ہی بنا ہوا ہے —

علاوہ ہند، فارس اور مصر کے یہ پھول چین، جاپان، جاوا، جزائر ملایا، جزائر فلپائن وغیرہ ممالک میں بھی پیدا ہوتا ہے، لیکن بہت کم - یورپ میں ہنگری میں اس کی ایک قسم پائی جاتی ہے - آسٹریلیا میں بھی یہ پیدا ہوتا ہے - شمالی اور جنوبی امریکہ میں بھی ہوتا ہے، مگر شاذ ہے —

افعال و خواص

کنول ایک بہت ہی فائدہ مند شے ہے - اس کے ڈنٹھل، پھول اور بیج کھائے جاتے ہیں - بیج گرم بالو میں بھون کر کھایا جاتا ہے - بھوننے کے بعد بیج سفید رنگ کا اور کھیلوں کی طرح ملائم ہوجاتا ہے - اس کو ہندی میں تال مکھانا کہتے ہیں - اس کے پودے

کے بہت سے حصے ویدک اور یونانی ادویہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ اطبا کا عقیدہ * ہے کہ کنول کا مزاج سرد اور تر ہے، اور اس بارے میں وہ بنفشے سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی جڑ گرم اور خشک، اور اس کا بیج سرد اور خشک ہے۔ اس کی قوت ایک برس تک باقی رہتی ہے۔

کنول دل اور دماغ کے لیے مقوی ہے۔ اور نہ صرف ان کی حرارت کے لیے مُسکن ہے، بلکہ سر اور سینے کی تشنگی کو بھی تسکین دیتا ہے۔ اس کے پھول کو سونگھنا گرم مزاج مریض کے دل و دماغ کے لیے مقوی ہے، اور نیند لاتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے درد سر اور خشکی دماغ کے لیے بھی مُسکن ہے۔ اس کا پینا امور مذکور کے لیے اور نیز نزلہ، خشونت سینہ، گرم کھانسی (سرفہ حار) اور بیرونی و اندرونی زخموں کے لیے بہت مجرب ہے۔ اگر اس کو زعفران اور دار چینی میں ملا کر پیا جائے تو تقویت دل اور خفقان کے لیے موثر ہے۔ اس کی جڑ کو منہ میں رکھنا حلق کے ورموں کو کم، اور خناق کو رفع کرتا ہے۔ سر پو اس کی مٹی کا لیپ اس کی جلن اور بخار کے لیے مُسکن ہے۔ اس کی مٹی کو یا اس کی جڑ کو پینا پرانے اسہال کو روکتا ہے، اور آنتوں کے زخم کو اچھا کرتا ہے۔ اگر اس کی جڑ کو روغن زفت کے ساتھ پیس کر پیا جائے تو داء الثعلب یعنی، بال خورے کو مفید ہے؛ اور تیز بخار کو ہلکا کرتا ہے۔ اس کی مٹی کو تنہا یا مناسب قسم کی پکی ہوئی دوائیوں یا اس کے عرق کے ساتھ پینا۔ چیچک اور پتھری کے واسطے مفید ہے، اور جگر اور دل کی گرمی اور بخار کی تپش کے لیے مُسکن ہے، مثانے کے لیے

---

* طبی خواص و افعال کا یہ بیان جامع المفردات ابن بیطار، اور مخزن الادویہ پر مبنی ہے۔

مفر ہے، اور اس کا مُصلح شہد اور مصری ہے - باہ کے لیے بھی مفر ہے، اور اس کے مصلح شہد اور لبوبات ہیں - اس کا بدل بنفشہ اور خطمی سفید ہے - اگر اس کی جڑ کو پانی میں ملاکر پیا جائے تو پرانی پیچش کو، آنتوں کے زخم کو، اور طحال کے ورم کو نفع ہوتا ہے - اس کا لیپ معدے اور مثانے کے درد اور ورم طحال کے لیے مفید ہے - صاف پانی میں ملاکر لیپ کرنا برص اور بہق کو دور کرتا ہے - اس کو سرکے میں ملاکر گرم ورموں کو دھونے سے فائدہ ہوتا ہے - اس کا لیپ نزف الدم اور درد مثانہ کے لیے نافع ہے - نیلوفر کا شربت طبیعت کو نرم کرتا ہے اور گرمی کی وجہ سے درد سر، گرمی اور صفراء کے پت، کھانسی، ذات الجنب، ذات الریہ اور سینہ کے کھرکھرے پن کے لیے نافع ہے - اس کے تیل کا مزاج بنفشے کے تیل سے زیادہ سرد اور تر ہے —

کنول خواب میں

یہاں یہ بیان کردینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کنول کو خواب میں کیا درجہ حاصل ہے - بعض جید عرب مصنفوں نے نباتات اور حیوانات کے احوال و خصائص میں اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اگر اس کو خواب میں دیکھا جائے تو دیکھنے والے کے لیے اس کے کیا معنی ہوں گے - گو یہ بذات خود ایک جدا اور ضخیم موضوع ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ مطالعہ بہت کچھ دلچسپ ہے - نیلوفر کے بارے میں عرب مبصر ابن شاہین نے لکھا ہے * کہ اگر کوئی عورت خواب دیکھے کہ اس نے نیلوفر کو توڑا ہے اور اپنے خاوند کو دیا ہے، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کا خاوند اسے طلاق دے دے گا -

---

* نیلوفر، الاشارات فی علم العبارات، از ابن شاہین مصر سنہ ۱۳۰۷ ھ، (تعطیر الانام از عبدالغنی النابلسی کے حاشیے پر) جلد ۲ ص ۱۷۱ -

اسی طرح اگر کوئی دیکھے کہ اس نے نیلوفر توڑ کر اپنے غلام کو دیا ہے تو دلالت یہ ہے کہ وہ اس غلام کو آزاد کردے گا - اور اگر کوئی نیلوفر کی جڑ دیکھے تو اس سے بد خلق باندی مراد ہے - ابن سیرین † نے لکھا ہے کہ اگر کوئی نیلوفر دیکھے تو اس سے مراد مال حلال ہے - یہ مال حلال ذریعے سے جمع کیا گیا ہے ' اور حلال طور پر ہی خرچ بھی ہوگا —

کنول مذہب اور متھیا میں

انسان اپنی زندگی کے آغاز میں کائنات کی اکثر اشیا میں خدا کا جلوہ دیکھتا تھا ' اور اسی بنا پر ان کو خدا یا خدا کا براہ راست نمائندہ سمجھتا تھا - ایک طرف اجرام فلکی اور دوسری طرف خود اس کے وطن یعنی زمین کے پہاڑ ' دریا ' نباتات اور حیوانات ' کوئی اس کے اس ہمہ گیر تخیل سے نہیں بچا - خود ہمارے وطن میں آج تک نباتات اور حیوانات کے اکثر انواع کی باقاعدہ پوجا ہوتی ہے - لیکن اس میں کچھ ہندوستان ہی کی خصوصیت نہیں ہے - قدیم تاریخ و آثار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی ملک جہاں کبھی انسان آباد تھا اس "ہمہ اوست" قسم کے عقیدے اور اس ہمہ پرستی کے عمل سے خالی نہیں رہا - کنول بھی ان خوش نصیب نباتات کے زمرے میں شامل ہے ' جسے نہایت نہایت قدیم زمانے سے (الاماشاء اللہ) اب تک خدائی یا خدا کی نمائندگی کا بلند رتبہ حاصل ہے —

ابھی اوپر ہم نے مصر قدیم کے بعض آثار قدیم کا ذکر کیا ہے جس میں کنول کا وجود بتایا جاتا ہے - جیسا کہ اوپر قریلے ہی سے ظاہر ہے '

---

† منتخب الکلام فی تفسیر الاحلام (تعطیر الانام کے حاشیے پر) از ابن سیرین جلد اول ' ص ۲۳۴-

یہ ایک مشکوک امر ہے کہ کنول اس قدر پرانے زمانے میں فی الواقع مصر کی سر زمین میں موجود تھا - جیسا کہ ان قدیم عمارات کے ملاحظے سے معلوم ہوا ہے ' یہ تو ضرور ممکن ہے کہ کنول پھول کو اہل مصر نے آرائش کے لیے استعمال کیا ہو ' لیکن اس کا باور کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس پھل کو مصر قدیم کی متھیا سے کوئی خاص تعلق یا رابطہ تھا - اوپر کے بیان میں بادشاہ نفرتوم ' جو کنول اپنے سر پر پہنے ہوے ہے ' بعد کے زمانے کا دیوتا ہے - اسی طرح ہوروس * جو کنول پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے ' محض حبشہ اور اس کے بعد کے زمانے میں ملتا ہے - ولکنسن † (Wilkinson) نے لکھا ہے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ مصریوں کے نزدیک کنول ایک معزز اور متبرک شے ہے —

مصر سے چل کر کنول غالباً بحرروم میں سے ہوتا ہوا ہسپانیہ اور اندلوسیہ پہنچا ' جہاں عیسائیوں نے اس کا اس زور سے استقبال کیا کہ یہ ان کے عقاید کا ایک جزو ہو کر ان کی عبادت گاہوں میں دخیل ہو گیا - ' برن ہارڈ ' اور ' دھیشا ' نے اپنی کتاب " عربی ہسپانیہ " میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس مضمون سے بحث کی ہے - اس کی دلچسپی اور اہمیت کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے :—

" اب ہمیں اس اشیائی مذہب کو فن لطیف کی تاریخ کی اس خصوصی کیفیت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جس کے سبب سے اس میں

---

* (۱) Mytho. of Ancient Egypt از L. Spence ' ص ۲۹۹ '
اور (۲) Encycl. Relig. Eth. میں Lotus کا بیان -
† حسب (۲) اوپر -

اور مصر میں ایک قرابت قریبہ پیدا ہو جاتی ہے - زمانۂ قدیم سے ہم یہاں اس وضع کو رائج پاتے ہیں جو مریم عذرا کا خاص نشان کہلاتی ہے - یہ ایک برتن یا گھڑا ہے ' جس میں سے ایک پودا اگتا ہے اور اس کے دونوں طرف ایک پھول قرینے سے متوازی طور پر رکھا نظر آتا ہے - دیگر ممالک (مثلاً اطالیا) کی فنی صناعتوں میں یا تو اس کنول کو جبرئیل فرشتہ اٹھائے ہوتا ہے یا یہ مریم کے قریب ہی ایک برتن میں رکھا ہوتا ہے اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اس لڑکی کے کنوارپن کی پاک دامنی پر محض ایک شاعرانہ دلالت ہے جس کو فرشتے نے اس نجات دلانے والے کی بشارت دی تھی —

لیکن اشبیلیہ میں یہ علامت خود مریم عذرا کے تصور کی طرف اشارہ کرتی ہے کیوں کہ سانتا کلارا * کی خانقاہ کے گرجے میں ایک مقدّس پتھر ہے جو اس اونچے مذبح کے پشت کی دیوار کا ایک حصہ ہے جس میں سانت انّا اور سانت جوخم کو ایک تمثالیے ہوے دکھایا گیا ہے جوھر ایک کے سینے سے لگا ہے اور جس کے سرے مل کر کنول کی طرح کا ایک پھول بناتے ہیں اور اس پھول کے اندر مریم عذرا متمکن ہیں - ہم نے صوبۂ اشبیلیہ کے دیہات کے ایک سے زیادہ گرجوں میں اسی قسم کی شکلیں دیکھی ہیں —

فردنند اور ازابلا کے زمانے کے بعد سے نقش کی یہ وضع ہمیں برابر ملتی چلی جاتی ہے ' اور اسے کنواری کا جرہ (یعنی گلدان) کہتے ہیں - لیکن

---

* Arabic Spain, Sidelights on Her History and Art, by Bernhard and Ellen M. Whishaw. لندن سنہ ۱۹۱۲ م -

یہ امر کہ ' یہ خیال بہت ہی پرانا ہے ' اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی کے آخر تک یہ پھول ایسے رسمی سے ہوگئے تھے کہ ان میں سے اکثر کسی نباتاتی نمونے سے مشابہت نہیں رکھتے - اور اس بات کا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ یہ علامت بہت کچھہ پرانی ہے کیوں کہ یہ لکھا ہے کہ ۱۴۰۳ میں ' انتی کویرا ' کے فرنڈونے ' جو بعد میں اراغون کا بادشاہ ہوگیا تھا ' اشبیلیہ کی سانت ماریا (حضرت مریم) کی یادگار میں میں فروسیت (نائٹ) کی ایک جماعت قائم کی تھی جو کنول کے گلدانوں یا آنکھہ کی پتلیوں کی جماعت کہلاتی تھی ' جس کے نشان کو اشبیلیہ کے پادریوں کی جماعت نے اختیار کرلیا تھا —

اشبیلیہ کے بڑے گرجے میں کنولوں کا یہ متکا کئی جگہ دکھائی دیتا ہے - اونچے مذبح کے نیچے کے مرمری فرش کے تمغوں میں یہ متکا موجود ہے اور اس کنواریوں کے گرجے کے پھاٹک کے اوپر بھی کچے لوہے میں بنا ہوا رکھا ہے جس کی بنیاد سولھویں صدی کے شروع میں پڑی تھی اور جس میں غریب لڑکیوں کے لیے جہیز مہیا کرنے کا سرمایہ جمع کیا گیا تھا - اس پھاٹک کے اوپر بشارت کی لوہے کی ایک تمثیلی تصویر ہے جس کے ساتھہ کنولوں کا متکا کنواری اور فرشتے کے درمیان رکھا ہوا ہے - اسی طرح یہ سترھویں صدی کے تمام خوبصورت بیل دار لباسوں میں ' جو بڑے تہواروں کے موقع پر استعمال کیے جاتے تھے ' یہ کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا ہے —

مصر میں دریاے نیل کا سوسن ' جسے علم نباتات داں نہیں تو شعرا ضرور کنول کہتے ہیں ' ہر درجے کے زیور میں شامل ہے - پروفیسر فلنڈرس پٹری کا قول ہے کہ " یہ اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ

بعض لوگوں نے اس کو ہر نوع کے زیور کا ماخذ خیال کیا ہے" - مصر قدیم میں کنول 'خیم' کی ایک نشانی ہے، جو عنصر زندگی ہے اور جو وہ شراب ہے جس سے اوسیریس (Osiris) نے دنیا کو زر خیز کیا - اس واسطے یہ مصری مذبحوں پر رکھا گیا تھا، جہاں اس کی نوک دار پنکھڑیاں مرجع عبادت کی طرف شعلے کی طرح اٹھتی تھیں اور اس طرح اس کو 'مذبح کا چراغ' بنایا گیا، کیوں کہ یہ اس ابدی آگ کی علامت ہے، جس سے اوسیریس دیوتا زمین کو از سر نو زر خیز بناتا ہے —

شاید کنول کو زر خیز کرنے والی شراب کی علامت سمجھنے میں اس پرانی 'اندلوسیہ' کی روایت کی ابتدا ہوئی ہو کہ جو عورت کنول کی جڑ کو کھائے وہ کراماتی طور پر حاملہ ہو جائے گی* - اسی لیے روایت یہ ہے کہ کنول کو کنواری ماں مریم کا، جو خود بغیر انسانی وسیلے کے پیدا ہوئی تھیں، نشان قرار دیا گیا تھا - لیکن یہ مخصوص مصری کنول اور خیم کی روایت اگر قبطیوں کے ہاں سے نہیں تو کہاں سے آئی کیوں کہ قبطی ہی اپنے پرانے مصری اعتقادات کو عیسائی ناموں کا باریک سا لباس پہنا کر لائے تھے —

... دریائے نیل کا تاریخی کنول، جو کہ مصریوں کے مذبح کا چراغ تھا، آہستہ آہستہ پندرھویں صدی کے کنول کے متکے میں موسوم ہوگیا اور پھر ... اس نے ان پھولوں کی شکل اختیار کر لی جو کسی قدرتی پھول سے مشابہت نہیں رکھتے - ایسے نمونے موجود ہیں جن سے اندلوسیہ کی موجودہ دست کاری میں کنول سے نفرت (Nefert) کے سر پوش کی نمود کا حال کھلتا ہے - لیکن ہو "روایت" کے غیر معمولی ثبات کی مثال کے طور پر یہ کہہ سکتے

* ہم اوپر ابن شاہین اور ابن سیرین کی تعبیریں بیان کر چکے ہیں -

ہیں کہ ہم نے حال ہی میں سنا کہ اشبیلیہ کے ایک بھلے مانس نے اٹھارھویں صدی کی ایک گل نما چیز کو پورے یقین کے ساتھہ 'کنول' بتلایا اور دریافت کرنے پر اس نے یہ کہا کہ خود میری سمجھہ میں نہیں آتا کہ میں نے اس کا یہ نام کیوں رکھا - واقعہ یہ ہے کہ یہ پھول کسی قدرتی پھول سے مطلق مشابہ نہ تھا ... ...

ممکن ہے ہمارا یہ خیال غلط ہو کہ کنواری نشان' جو اس کے حمل باکرہ کی طرف اشارہ ہے' شاید ہسپانیہ کے اس حصے سے مخصوص ہے کیوں کہ ہمیں اشبیلیہ میں مسیحی بتوں کے تذکرے اور ان کی علامات کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں - لیکن شاید ہمارا یہ فرض کرلینا درست ہے کہ لیس اور ریشمی کپڑوں میں "جرہ" کے ان نقوش کی مصری اصل کو لوگ عموماً تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ جتنی مستند کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں ان میں سے کسی میں ان کا اس طرح سے ذکر نہیں ہے' اور اس کی اصلیت پر بہت بحث و تکرار ہونے پر یہ طے پایا ہے کہ اس کی ابتدا نا معلوم ہے - سترھویں صدی کے آنت ورپ پوتن کانت (Antwerp Potten Kant) کے نقش' مع ان کی دو جدا شاخوں کے' اور پندرھویں اور سولھویں صدی کے اشبیلیہ میں ملنے والے کنواری کے مٹکوں میں قریبی مشابہت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پہلا خیال ان نشیبی ملکوں میں اس وقت پھیلایا گیا جب وہ ہسپانیہ کی حکومت میں تھے - مس شارپ لکھتی ہے کہ "بعض مصنف پوتن کانت کو ایک پرانے نقش کی یادگار سمجھتے ہیں جس میں کنواری اور بشارت کی تصویر شامل ہے -" جیسا کہ مس شارپ کی رائے ہے' یہ یقیناً ایک رسمی نقش ہے جو کنواری سے متعلق ہے: لیکن اشبیلیہ میں اس نے خود مریم ہی

کی معجزانہ پیدائش ہونے کی وجہ سے ' نہ کہ بشارت کی تصویر میں شامل ہونے کے سبب سے ' بہت زیادہ اہمیت حاصل کی ہے —

دریاے نیل کا کنول اندلوسیہ کے اس حصے میں عموماً نہیں دکھائی دیتا - زرد رنگ کا چھوٹا کنول وادی آرا * (Guadaira) میں ' جو اشبیلیہ سے دو یا تین میل دور ہے ' ایک محدود تعداد میں پیدا ہوتا ہے - لیکن سفید کنول یقیناً اس خطے کا ملکی پھول نہیں ہے ' اور نہ یہاں کے باغوں میں اس کی کاشت ہوتی ہے - پس اس پھول کے نقاشیوں میں استعمال ہونے کو ہم کسی مقامی اثر پر محمول نہیں کر سکتے - اور نہ یہ فرض کرنا چاہیے کہ اس کا ابتدائی مطلب ان لوگوں کے دماغ میں موجود ہے جو مصری مذبح کی شمع کے خاکے اب بھی بناتے ہیں - ان لوگوں کے نزدیک تو پھول ... ... خصوصی طور پر پھول ... ... صرف اسی کا نام ہے - ان کو اس بات کی تحقیق کرنے کا کبھی گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایسا کیوں ہے - وہ اس پھول کو اب اپنی مصنوعات میں محض اس وجہ سے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد نے ان سے پہلے ایسا کیا - اندلوسیہ کا دھقانی رسوم کا بہت احترام کرتا ہے - وہ گذشتہ لوگوں کی عزت کرنے کے لحاظ سے گویا مصری ہے ... ... جن لوگوں نے ہمارے کنول ' کنول کے پودے اور کنول کے مذبحی شمع کی صنعتی تصویروں کے ذخیرے کو دیکھا ہے جو تعداد میں ایک سو سے زیادہ اقسام کے ہیں وہ ہماری ہی طرح روایت کے حیران کن ثبات سے متاثر ہوتے ہیں کیوں کہ یہ پھولوں کی رسمی یا غیر رسمی اقسام میں سے ایک بھی نہیں ہے - شاید یہ کہنا

---

* وادی آرا یا وادیارا ایک چھوٹا سا دریا ہے جو شہر اشبیلیہ کے قریب وادی الکبیر میں شامل ہو جاتا ہے (عنایت اللہ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ' ص ۳۸۸) -

مبالغہ نہ ہوگا کہ "وہ پھول" پھولوں کے تمام اقسام میں ' جو اشیلیہ ' حلوا ' قادیس کے صوبہ جات میں اور المغرب کے ضلع میں پائے جاتے ہیں ' تقریباً نوے فی صدی ہے خواہ وہ مادہ ' جس سے تصویر بنائی جاتی ہے ' کچھ بھی ہو - اور یہ قدیم و جدید مصنوعات میں یکساں ہے - یہ اپنی خالص شکل میں ہمیشہ مصری کنول ہوتا ہے یونانی کبھی نہیں ہوتا - زندگی کے قدیم تصور کی اس مسلسل ساخت میں سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہم اس کو پچاس یا سو برس قبل کی بنی ہوئی چیزوں ' مثلاً فرنیچر ' میں پوری شکل میں مگر الٹا رکھا ہوا پاتے ہیں - جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مصور کو اس شکل کے بنانے کی غرض کا ' جس سے وہ اس قدر محظوظ ہوتا ہے ' قطعی علم نہیں ہے ... ..."

ایران قدیم کے مذہب اور متھیا بھی کنول کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے - البتہ اہل ایران جشن نیلوفر کے نام سے ہر سال ایک جشن مناتے تھے - یہ جشن عموماً ماہ تیر کی چھٹی تاریخ کو ہوتا تھا - یہ امر محقق نہیں ہے کہ اس جشن کا یہ نام کیوں رکھا گیا - قیاس چاہتا ہے کہ یہ جشن نیلوفر کے پھولنے کی رت میں ہوتا رہا ہوگا —

کنول پھول کو جو عظمت اور اہمیت اس کے سب سے بڑے اور غالباً اصلی وطن ہندوستان کی سرزمین میں حاصل ہوئی وہ کہیں اور نظر نہیں آتی - ہندی متھیا * میں دیوتاؤں اور دیویوں کو کنول پھول سے براہ راست تعلق ہے - ہمارے قدیم بتوں اور مجسموں میں برہما ' شیو اور وشنو اور ان کی دیویاں سرسوتی ' پاروتی اور لکشمی کنول پر بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں - قدیم ہندیوں کے ہاں کنول گویا

* Encycl. Relig. Eth.

نارائن اور برھما کا رحم مادر تھا - شاید یہی وجہ ھے کہ برھما جی اکثر مورتوں میں کنول پر چھکے یا اس پر بیٹھے ھوے نظر آتے ھیں - وشنو دیوتا کی اکثر مورتوں میں یہ بھی دیکھا جاتا ھے کہ اس کے کسی ایک ھاتھہ میں ایک کنول ھے - آگ کا دیوتا اگنی ' ھوا کا دیوتا پون ' خدائے عقل گنیش ' وشنوجی کے اوتار سری رام چندر جی اور ان کے حریف بد بخت ' راون راکشس بھی اسی حالت میں نظر آتے ھیں - اس طرح اندر ' وشنو اور ان کے تمام اوتار ' اور سورج دیوتا بھی کنول پر کھڑے دکھائی دیتے ھیں - لنکا میں بھی شیو اور پاروتی ' اور دولت کا دیوتا کُبھر ' اور تبّت میں علم کی دیوی سرسوتی کی مورتیاں بھی اسی انداز میں پائی جاتی ھیں - اسی طرح جین مذھب کی پرانی عمارتوں اور مندروں میں بھی کنول پھول کو خداؤں سے قریب ترین قربت حاصل ھے - عام طور سے مورتوں میں وشنو کے چار ھاتھہ دکھائے جاتے ھیں جن میں سے ایک میں وہ کنول لیے ھوتا ھے ؛ اور اس کی سواری کا جانور * گرڑ (गरुड) بھی جو آدھا پرند ھے ' اسی کنول کے سامنے جھکا ھوا دکھائی دیتا ھے - کنول وشنو کے ان چار اسلحہ میں سے بھی ایک ھے جو اس کو دیووں کے خلاف بچاتے ھیں † وشنوجی ‡ کی تسبیح بھی کنول کے بیجوں کی بنی ھوئی ھے — قسمت کی دیوی لکشمی وشنو دیوتا کی بیوی ' اور کام کی ماں ھے-

---

* Iconography of Buddhist and Brahmanical sculptures in the Dacca Museum, by N. K. Bhattasali. ص ۷۸ -

† The Rites of the Twice-Born, by Mrs. S. Stevenson. ص ۲۲۴ -

‡ The Religions of India, by E. W. Hopkins. ص ۵۰۲ -

رامائن میں لکھا ہے کہ جب دیوتاؤں اور دیوتاؤں اور اسوروں نے ملتروں کی جاپ کی تو وہ ہاتھہ میں کنول لیے ہوے اپنے پورے جمال کے ساتھہ سمندر سے ظاہر ہوئی - ایک دوسری روایت کے مطابق وہ پیدائش کے وقت کنول پھول پر تیر رہی تھی - کنول ہی کی مناسبت سے اس کو پدم کہتے ہیں - پرانوں کا بیان ہے کہ وہ بھرگو کی بیٹی ہے - وشنو پران میں لکھا ہے کہ جب ہری ایک بونے کی شکل میں پیدا ہوا تو لکشمی ایک کنول سے ظاہر ہوئی - لکشمی کے چار ہاتھہ ہوتے ہیں جن میں سے ایک میں کنول ہوتا ہے * —

سفیدی مائل سیاہ پتھر پر بنی ہوئی چھہ فٹ چار انچ اونچی وشنو کی ایک مورت، جس کی لکشمن کاٹی، صوبۂ بکر گنج میں پوجا ہوتی ہے، بابو گرو پرسام گھوش کے مکان پر ملی ہے - یہ مورت اب تک بالکل صحیح و سالم ہے - اس میں وشنو کی سواری کا جانور گرڑ ایک کنول پر ایک پیر کے بل ہاتھہ جوڑے ہوے کھڑا ہے - وشنو اس کے پھیلے ہوے بازوؤں پر بیٹھا ہوا ہے، اور اس کے داہنے ہاتھہ میں ایک کنول ہے جس میں "کملا" دیوی بیٹھی ہوئی اپنے داہنے ہاتھہ سے خیرات کر رہی ہے اور بائیں ہاتھہ میں ایک کنول لیے ہوے ہے - اس کے دونوں طرف دو ہاتھی کنولوں پر کھڑے ہوے اپنی سونڈوں میں گھڑے لیے اس دیوی پر پانی برسا رہے ہیں - اسی طرح سے دیوتا کے بائیں ہاتھہ میں بھی ایک کنول ہے جس پر سرسوتی دیوی بیٹھی ہوئی ستار بجا رہی ہے † -

لکشمی نارائن کی سیاہ پتھر پر ایک مورت 'بستہ' کے بھاو مکاس کے

---

* A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion, by J. Dawson. ص ۱۷۶ -

† Icon. of Buddhist and Brahmanical Sculptures. ص ۸۶ -

مکان میں ملی ہے - اس مورت میں نارائن جی ایک کنول پر بیٹھے ہوے ہیں، اور ان کے ایک ہاتھہ میں پدم ہے - لکشمی دیوی اپنی داہنی ٹانگیں دھرائے ہوے وشنو جی کے زانو سے لگی بیٹھی ہیں اور ان کا داہنا ہاتھہ وشنو جی کی گردن میں پڑا ہوا ہے - گرز جھکا ہوا اس کنول کو اٹھائے ہوے ہے جس پر یہ دونوں بزرگ بیٹھے ہوے ہیں * -

"سورجنم" کی ایک خوبصورت سیاہ پتھر پر بنی ہوئی مورت ڈھاکہ میں دستیاب ہوئی ہے جس کی وشنوی خانقاہوں میں پوجا ہوتی ہے - اس دیوتا کے چار ہاتھوں میں سے ایک میں کنول ہے، اور اس کے نیچے دو "ناگ" جن کے سر انسان کی طرح کے ہیں، پیروں میں لپٹے ہوئے ہیں - ان میں سے ایک کنول لیے ہوے ہے † —

وشنو ‡ دھرم تار میں لکھا ہے کہ وِشن کو ایک ایسے رتھہ پر سوار ہونا چاہیے جس کو سات ہنس کھینچتے ہوں - اس کا رنگ ویدریا (ایک قیمتی جوہر) کے رنگ کا ہوتا ہے، اور اس کو سفید پوشاک پہنے ہوے، موتیوں کے زیور اور مالے سے مزین، اور اس کا پیٹ کسی قدر لٹکا ہوا ہونا چاہیے - اس کے چار بازو ہوتے ہیں؛ اس کے سر پر ایک سفید چتر اور بائیں طرف مچھلی کا جھنڈا ہوتا ہے - وِشن کے داہنے ہاتھوں میں ایک پدم اور پاس اور بائیں ہاتھوں میں سنکھہ اور رتن پتر ہوتا ہے - اندر $ دیوتا کے ہاتھہ میں وجر اور انکوش یا نیلوت پل ہوتا ہے - بعض لوگ

---

* Icon. of Buddhist and Brahmanical Sculptures. ص ۸۸ -

† The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۱۰۶ -

‡ Elements of Hindu Iconography. از گوپی ناتھہ راؤ، ص ۵۳۰ -

$ Elements of Hindu Iconography. از گوپی ناتھہ راو - ص ۵۱۹ - ۵۲۰ -

کہتے ہیں کہ اندر کا رنگ سفید ہوتا ہے - اس کے چار بازو، اور پیشانی کے بیچ میں ایک تیسری آنکھہ بھی ہوتی ہے - اس کے داہنے ہاتھوں میں سے ایک میں وجر اور دوسرے میں پدم ہوتا ہے؛ اور اس کے بائیں ہاتھوں میں سے ایک اندر رانی کے گرد ہوتا ہے اور دوسرے میں انکوش ہوتا ہے - نیل کنٹھہ * کی ایک مورتی 'بری سال' سے چند میل کے فاصلے پر کاشی پور میں پائی گئی ہے - اس مورت میں نیل کنٹھہ کی بیویاں، گنگا اور گوری، اس کے دونوں طرف کھڑی ہیں اور دونوں کے بائیں ہاتھوں میں ایک ایک کنول ہے - گوری دیوی † کی پوجا دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے کی جاتی ہے - روپ منڈن ‡ نے ساوتری کا حال یوں لکھا ہے کہ اس کے چار سر اور چار ہاتھہ ہوتے ہیں - ہاتھوں میں اکش مالا (अक्षमाला)، (پستک کتاب)، پدم اور کمنڈل (कमण्डलु) ہوتی ہے —

جنوبی ہندوستان میں بھی کنول کو بڑے زور شور سے نوازا گیا ہے - وہاں کے متعدد دیوتاؤں کی مورتیاں کنول کی کسی نہ کسی صورت اور وضع سے مزین ملتی ہیں - سبرامنی $ کی بچپن کی تصویر کو بال سوامی (बालस्वामी) کہتے ہیں - اگر مورت میں ان کو ان کے والدین کے بغل میں کھڑا دکھانا ملحوظ ہو، جیسا کہ شیوجی کی سوما سکند (सोमास्कन्द)

---

* Iconography of Buddhist and Brahmanical Sculptures in the DaccaMuseum از ٹلنی کانت بھٹا سالی، ص ۱۱۶ - ۱۱۷ -

† ایضاً، ص ۱۹۹ -

‡ Elements of Hindu Iconography از گوپی ناتھہ راو - ص ۵۰۶ -

$ Subrahmanya، ص۴۳۹، Elements of Hindu Iconography by T. A. Gopi Nath Rao.

مورت میں ہے، تو ان کو ایک ایسے بچے کی طرح بناتے ہیں جس کے ہر ہاتھہ میں ایک کنول ہو اور جس کا بایاں ہاتھہ پٹھے پر رکھا ہو۔ اس تصویر کا رنگ بھی لال ہوتا ہے۔ برہم چاری سبرامنی کے دو آنکھیں اور دو بازو ہوتے ہیں اور وہ پدم پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے سر پر گھنے بال، یجنو پویت * (यज्ञोपवीत)، مونجی، (مونج کا کمر بند) اور کوپن (कौपिन) ہوتا ہے۔ داہنا پیر پدم پر مضبوطی سے ٹکا ہوتا ہے اور بایاں کسی قدر خم دار اس پر رکھا ہوتا ہے۔ داہنے ہاتھہ میں ایک ڈنڈا اور بائیں میں ایک وجر (वज्र) ہوتا ہے۔ اس کا رنگ بھی لال ہوتا ہے۔ سبرامنی کی دیویوں کا بیان کمار تنتر † میں اس طرح سے ہے کہ مہاولی (महावली) کو کالے رنگ کی اور ہنس مکھہ ہونا چاہئے۔ اس کو داہنے پیر کے بل زمین پر کھڑا ہوا اور اس کا بایاں پاؤں داہنے پاؤں پر ٹکا ہوا ہونا چاہیے۔ اس کے بائیں ہاتھہ میں ایک پدم (کنول) اور داہنا ہاتھہ لٹکا ہوا ہونا چاہیے —

شاستان کاٹ ٹی ‡ (تراونکور میں) کے مندر میں شاست (Sastri) کی ایک مورت ہے جس میں اس کے دو بازو ہیں جن میں دھنش (کمان) اور بان ہیں؛ اور وہ سیدھا کھڑا ہوا ہے۔ پربھاولی (प्रभावली) کے دو مزین ستونوں پر شاست کی دو دیویاں بھی بنی ہوئی ہیں ان میں سے داہنی والی کے ہاتھہ میں ایک پدم اور بائیں والی کے ہاتھہ میں نیلوت پل (नीलोत्पल) ہے۔ جین § مذہب کے ایکیسویں تیرتھنکر،

---

* Elements of Hindu Iconography، ۳۴۲

† ایضاً، ص ۳۴۵ —

‡ ایضاً، ص ۳۹۲؛ Sastankattai

§ The Heart of Jainism، ص ۵۷ -

نامی ناتھہ ' کی علامت نیلا کنول ھے - چھٹے تیرتھنکر کی ماں ' سوسانہ * (सुसाना) ' کو لال کنول کے بستر پر لیٹنے کا بہت شوق تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیٹے نے سرخ کنول اپنی علامت رکھی - شری چکر سانبھار† تنتر میں چکر مہاسکھہ کی مورتی کا حال یوں لکھا ھے کہ وہ ایک آٹھہ پنکھڑیوں والے کنول میں بند ھے - اس کنول کی چار پنکھڑیوں پر ڈاکنیوں کی مورتیں بنی ہوئی ھیں اور باقی چار پنکھڑیوں پر آب حکمت سے بھرے ہوے ظرف ھیں جن پر کھوپری کی وضع کے پیالے ھیں - ان پیالوں میں پانچ قسم کے آب حیات ھیں - خاص دیوتا کے پاؤں کنول پر ٹکے ہوے ھیں - ان آٹھہ متحرک پنکھڑیوں کے نیچے کئی چھوٹی چھوٹی ساکت پنکھڑیاں بھی بنی ہوئی ھیں - یہ پھول ایک موٹے سے تنے نکلا ھے اور اس کے دونوں طرف دو جوان دو ھری ناگ لڑکیاں بنی ہوئی ھیں جن کے بدن ایک ھی اُٹھی ہوئی دم سے نکلے ھیں - یہی لڑکیاں کنول کی چھوٹی پتیوں کو سنبھالے ہوے ھیں ..... اس مورت کی مجموعی ھیئت میں چند اور جانور — نیولا ' بندر ' ھاتھی ' ھرن ' خرگوش اور ایک شیر — بھی نظر آتے ھیں ؛ اور ھر چیز کی تہ میں کنول پھول اپنی مختلف حالتوں میں آشکارا ھے —

زمانہ قدیم میں اکثر بندگان خدا "کنول پوجا" ‡ کیا کرتے تھے (اور اب بھی کرتے ھیں!) جس میں انہیں اپنی جان تک کو قربان کرنا پڑتا تھا - کہا جاتا ھے کہ اس قربانی کے اثرات کی کوئی انتہا ھی نہ تھی -

---

* The Heart of Jainism ؛ ص ۵۲ -

† Tantric Tents by Avalon ' جلد ۷ ' ص ۲۱ - ۳۱ ' مذکور در Icon. of Buddhist and Brah. Sculp. in Dacca Museum. از نلنی کانت بھٹاسالی ۔

‡ The Rites of the twice-Born by Mrs. S. Stevenson ' ص ۳۹۸- ۴۰۰

پدم شلا * (पद्मशिला) (کنول کی سل) ہر اس عمارت کے سنگ بنیاد کو کہتے ہیں جو ہندو مراسم کے مطابق تعمیر کی جاتی ہے؛ کیونکہ اس پر ایک آٹھ پنکھڑیوں والا کنول کندہ ہوتا ہے - اس کنول پر زعفرانی رنگ کا ایک سواستیک بنایا جاتا ہے -

زرد تارا † کی ایک قسم وجرتارا ہے - اس کی مورتیں کلکتہ کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ دل چسپ ایک آٹھ انچ اونچا کنول ہے' جو ایک پایدان' ایک پھول اور ایک ٹوپی نما سی چیز سے مل کر بنا ہے - پایدان کے اوپر آٹھ پنکھڑیوں کا ایک کنول ہے جس کی ہر پنکھڑی پر ایک دیوی بنی ہے - بیچ میں بھی ایک ایک دیوی بیٹھی ہوئی ہے' جو شاید بودھ مت کی دیوی تارا ہے - اس کے آٹھ بازو ہیں اور اس کے سر پر ایک استوپ بنا ہوا ہے - یہ کنول ایک مشین کے ذریعے سے بند ہوجاتا ہے اور اسی سے کھل بھی سکتا ہے - جب تمام پنکھڑیاں سمٹ کر بند ہوجاتی ہیں تو وہ ایک کنول کی کلی معلوم ہوتی ہے —

پوجا کرنے میں جو مختلف ارکان عبادت ہیں' ان میں بھی کنول کو دخل ہے - چنانچہ کمل مدر حالت میں "پجاری ‡ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک کھلے ہوئے کنول کی شکل بناتا ہے"۔ اہل ہند نے اسی سب پر اکتفا نہیں کی' بلکہ انسان کے جذبات میں سے ایک کا نام' کنول کے نام پر'

---

* The Rites of the Twice - Born by Mrs. S. Stevenson. ص ۳۵۵ -

† The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۳۵ - ۳۶ -

‡ The Rites of the Twice - Born by Mrs. S. Stevenson. ص ۲۲۴ -

پدم لچسیا (पद्मलक्ष्मा) رکھا ہے - اس نام کی وجہ استعمال یہ بتائی جاتی ہے کہ اس حالت میں انسان ہر اچھی شے کی طرف اسی طرح راجع ہوتا ہے جس طرح کہ کنول سورج کی طرف کھلتے ہیں * —

کنول بدھ مذہب کا بھی ایک مقدس پھول ہے - چونکہ یہ پھول کیچڑ میں اُگتا ہے، پانی میں بڑھتا ہے اور ایسے غلیظ اور گندے مبدا سے پیدا ہونے کے باوجود ایسی عمدہ خوشبو دیتا ہے؛ اس لیے اس کو ایک نیک بندے سے تشبیہہ دیتے ہیں جو اس دنیائے دنی میں رہتا ہے - سر مونیر ولیمز نے لکھا ہے کہ "اس پھول کا علامتی استعمال اس وجہ سے ہے کہ اس کی ساخت بالکل ایک پہیے کی طرح کی ہوتی ہے - اس کی پنکھڑیاں تیلیوں کی جگہ لیتی ہیں اور اس طرح سے ہستی کے ابدی چکر کی تعلیم دیتی ہیں" - ہم اکثر مہاتما بدھ کو ایک سنہرے کنول پر بیٹھا یا کھڑا ہوا دیکھتے ہیں؛ اور اس سے ہمیں وہ بودھی سوتر یاد آتا ہے جسے اصطلاح عام میں "شریعت حقہ کا کنول" کہتے ہیں —

بودھ مت کی سکھاوتی کی جنت میں جہاں عورتوں کا بالکل وجود ہی نہیں ہے، ہر شخص ایک دیوتا کی شکل میں کنول کے پھول سے پیدا ہوتا ہے جسے سد دھرم پانڈریک (सद्धर्मपुण्डरीक) کہتے ہیں - بدھ مذہب کا ایک اور عقیدہ ہے کہ زمین پر جہاں جہاں مہاتما بدھ کا قدم پڑتا تھا ان کے قدم کے نشانات کنول کی شکل کے ہوتے تھے - پالی شرع میں اس کے بے شمار حوالے ملتے ہیں؛ مگر مہا پدن ستانت میں جس میں، مہاتما کے پہلے سات قدموں کا ذکر ہے، اس کا

---

* The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۱۰۲ - ۱۰۳

کوئی ذکر نہیں ملتا، یہ سب تفصیل بعد کی کتابوں اور تحریروں کی ہے۔

زمانہ قدیم میں کنول اور سورج میں ایک علاقۂ وحدت مانا جاتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ قانون فطرت تھا کہ کنول طلوع آفتاب کے ساتھ سر پانی سے نکالتا ہے اور پھر اس کے غروب کے ساتھ غائب ہوجاتا ہے۔ اس سے پرانے زمانے کے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ پھول سورج کا شبستان ہے، یا یہ کہ وہ سورج کو روزانہ از سر نو روشنی بخشتا ہے اور سطح فلک پر چڑھاتا ہے۔ کنول کی تصویر سورج کے ساتھ ہم گندھار کی عمارتوں میں پاتے ہیں۔

ہاتھ میں کنول ہونے سے نہ محض یزدانی پیدائش بلکہ حیات جاودانی پر قابو رکھنا بھی مقصود ہے۔ اس کی مثال آریوں کی آسمانی ملکہ، ہندوؤں کی دیوی شری اور بودھ مذہب والوں کی تارا ہیں۔ جیسا کہ اوپر تحریر ہوا بودھ مذہب سے قبل ویدوں کے زمانے میں کنول رحم مادر کا نشان تھا اور غالباً بودھ مذہب کی دعا "اوم منی پدم ہوم" میں اس معنی کا بھی لحاظ کیا گیا ہے؛ اور بہت ممکن ہے کہ تارا کے منگیتر اولوکتا کے ہاتھ میں کنول ہونے سے اس معنی کا بھی کوئی تعلق ہو—

ذیل میں بودھ مذہب کے ان دیوی دیوتاؤں کی تفصیل ہے جن کے ہاتھ میں کنول ہے:

(۱) ہاتھ میں کسی قسم کا کنول ہونا تارا، اولوکتا، پدم پنی اور کبھی کبھی میتریے کی علامت ہے۔

(۲) کنول کے اوپر ایک تلوار کا ہونا اموگھ پاش، کھگرپھ، سمنتا، تارا، پدماپنی، اولوکتا اور میتریے کا نشان ہے—

(۳) کنول اگر بجلی کے ہمراہ ہو تو منجسری اور وجر پان (वज्रपाणि) کی علامت ہے —

(۴) کنول اور کتاب ساتھ ہوں تو منجسری اور پرجن پرمت (प्रज्ञापारमित) کا نشان ہے —

(۵) گوھر کی معیت میں کنول کشتی گربھ اور ایکجات (एकजात) کی علامت ہے' اور —

(۶) سورج کے ساتھ سامنت بھدر (समन्तभद्र) کا نشان ہے - تبت کے سادھوؤں کے واسطے کنول لاما کے طایفہ کے بانی کا خاص نشان ہے اور پدم کار (पद्मकार) (یعنی' کنول سے پیدا شدہ) سونگ کھاپ (زرد ٹوپی والے مصلح فرقہ کے بانی) اور گلوگ لاما کا نشان دو کنول ہے —

بودھ متھیا میں پالی شروع کے بدھ نام کے پہلے چوبیس مہاتماؤں میں سے دو کے نام کنول پر ہیں' یعنی پدم اور پدو متر؛ اور بہت سے ناگ سورماؤں کے نام' مثلاً پدو متر اور پانڈریک' اور بدھ مت کی کئی دوزخ' پدم' مہاپدم اور پانڈریک کے نام بھی کنول پر ہیں -

آئیے اب جاپان اور چین کی بھی سیر کریں اور دیکھیں کہ وہاں کنول پھول کس رنگ میں جلوہ گر ہے - جاپانیوں کے ہاں یہ روایت * بہت مشہور ہے کہ بدھ جی ڈنڈک پہاڑ پر اپنا مراقبہ ختم کرنے کے بعد پہاڑی راستوں سے گذرتے ہوے شہر کی طرف روانہ ہوے - رات سخت تاریک تھی - ہر طرف ہر چیز پر خاموشی طاری تھی - اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچ کر مہاتماجی نے کسی کی آواز سنی جو یہ کہتا تھا " شیوجیو موجیو'

* Myths and Lengeds of Japan by F. H. Davis, ص ۸۰ - ۸۲-

(یعنی ' ظاہری اطوار باطنی کیفیات کی ہمیشہ ترجمانی نہیں کرتے)۔ یہ الفاظ سن کر بدھ جی بہت خوش ہوے۔ بار بار یہ الفاظ سن کر ان کا جی چاہا کہ معلوم کریں کہ ایسی عاقلانہ باتیں کون کر رہا ہے۔ اس دھن میں آگے بڑھے۔ ایک چٹان کے کنارے پہنچ کر انہوں نے نیچے وادی میں دیکھا کہ ایک بدصورت اژدہا غضب آلود نگاہوں سے ان کو گھور رہا ہے۔ مہاتما جی ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور اژدہے سے دریافت کیا کہ "تو نے بدھ مذہب کی یہ نفیس تعلیمات کہاں سے سیکھیں" پھر بدھ جی نے اس سے اسی قسم کے اور عمدہ اقوال اور نصائح دریافت کیے۔ اژدہے نے چٹان کے گرد لپٹ کر بلند آواز سے کہا: زی شیومتسوپو (یعنی ' تمام جاندار بدھ جی کی شریعت کے خلاف ہیں)۔ اس کے بعد اژدہا تھوڑی دیر تک خاموش رہا' اور مہاتما جی کی درخواست پر پھر یوں گویا ہوا کہ "شیومتسو متسوای" (کل نفس ذائقۃ الموت) یہ کہنے کے بعد اژدہا پھر خاموش ہوگیا۔ اس کی شکل سے بھوک کے آثار ظاہر ہورہے تھے۔ اس نے کہا کہ میری آخری نصیحت اس قدر بیش بہا ہے کہ میں اس کو اس وقت تک نہیں بتا سکتا جب تک کہ میرا پیٹ نہ بھر جائے۔ یہ سن کر بدھ جی نے فرمایا کہ "میں تیرے واسطے کسی چیز سے دریغ نہ کروں گا' مگر مجھے چوتھی نصیحت بتادے"۔ پھر آپ نے اس سے یہ بھی دریافت کیا کہ "تجھے کس چیز کی حاجت ہے"؟ جب مہاتما جی کو یہ معلوم ہوا کہ اپنے چوتھے قول کے بدلے میں اژدہا انسان کے گوشت کا خواہاں تھا تو انہوں نے فرمایا کہ "گو مذہب میں جھوٹ کی سخت ممانعت ہے تاہم میں اپنی اُمت کے واسطے اپنی جان تک قربان کروں گا"۔ اژدہے نے اپنا منہ کھولا اور یہ کہتے ہوے کہ

" جاکو' متسوای راکو" (یعنی ' سب سے بڑی خوشی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب روح تن سے جدا ہوتی ہے) مہاتما کو اپنا نوالہ بنا لیا - جوں ہی مہاتما جی اژدہے کے منہ میں پہنچے ان کے آٹھ حصے ہوگئے اور چشم زدن میں وہ سنہرے کنول کی آٹھ پنکھڑیاں بن گئے !

ذیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پھول میں جادو کی طاقت بھی ہے جس کی مدد سے یہ بد ارواح کو دور رکھتا ہے* :-

ایک دفعہ شہر کیوتو میں ایک وبا پھیلی جس نے ہزاروں آدمیوں کو موت کے منہ میں پہنچا دیا - بڑھتے بڑھتے یہ وبا ادزومی (Idzumi) تک پھیل گئی جہاں کوریاما کا بادشاہ بود و باش اختیار کیے ہوئے تھا ؛ اور کوریاما اپنی بیوی اور بیٹے سمیت اس مرض میں مبتلا ہوگیا - اس کے محل کے ایک افسر اعلیٰ تاداسامون (Tada Samon) نے ایک سنیاسی سے ملاقات کی جو بادشاہ کی علالت کے وجہ سے بہت متفکر تھا - اس نے سامون سے کہا کہ یہ تمام مصیبت یہاں بد ارواح کے آجانے سے پیدا ہوگئی ہے اور وہ یہاں اس لیے آگئی ہیں کہ اس عمارت کے گرد کی نہریں خشک ہوگئی ہیں اور ان میں کنول نہیں رہے - اگر ان نہروں میں پھر وہی مقدس پھول لگا دیے جائیں تو یہ بری ارواح یہاں سے چلی جائیں گی' اور ہمارے بادشاہ' مع بیوی بچے کے' صحت یاب ہوجائیں گے - سامون یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس سنیاسی کو اجازت دلادی کہ وہ اس محل کے گرد کنول کی کاشت کرے - اس کام کے ختم ہونے پر سنیاسی غائب ہوگیا : اور ایک ہفتے کے اندر ہی کوریاما' اس کی بیوی اور بیٹا اس قابل ہوگئے کہ اپنے فرائض حیات انجام

* Myths and Legends of Japan. ص - ۱۷۰

دیلے لگے' کیونکہ اس وقت تک دیواروں کی مرمت کی جا چکی تھی اور صاف پانی پہنچایا جا چکا تھا جس پر جھومتے ہوے کنولوں کا عکس پڑتا تھا —

کئی سال کے بعد' جب شاہ کوریاما مرچکا تھا' اتفاق سے ایک سموراٹی (Samurai) اس محل کے قریب سے گذرا - ابھی وہ حیرت سے ان پھولوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے پانی کے کنارے دو حسین لڑکے کھیلتے ہوے دیکھے - وہ چاہتا ہی تھا کہ ان کو کسی محفوظ جگہ میں پہنچا دے کہ یکایک دونوں لڑکے اچھل کر پانی کے اندر گر پڑے - متحیر سموراٹی یہ سوچ کر' کہ میں نے کاپا (Kappas' دریائی ارواح) دیکھی ہے' فوراً محل کو واپس گیا؛ اور وہاں سارا واقعہ بیان کیا - اس کا بیان سن کر نہر کو صاف کروایا گیا لیکن فرضی ارواح کا کہیں پتہ نہ ملا - کچھ عرصے کے بعد ایک دوسرے سموراٹی' مورت اپائی (Murata Ippai)' نے بھی اسی کنول کے پاس کئی خوبصورت لڑکے دیکھے - اس نے اپنی تلوار کھینچ کر ان کا سر قلم کر ڈالا - اپنے قتل کا شمار کرنے کے واسطے جب اپائی نے اپنے گرد دیکھنا چاہا تو اس کے گرد رنگین بادل چھا گئے اور وہ کچھ نہ دیکھ سکا - مجبوراً تمام رات اپائی وہیں پڑا رہا - صبح کو جب آنکھ کھلی تو اسے معلوم ہوا کہ اس نے محض کنول کے پھول توڑ ڈالے تھے - اسے یہ معلوم کرکے اور بھی افسوس ہوا کہ انہوں پھولوں نے کوریاما' اس کی بیوی اور بچے کی جان بچائی تھی - اپائی سخت نادم اور پشیمان ہوا اور دھائیں پڑھ پڑھ کر توبہ و استغفار کیا —

لفکیڈیو ہرن (Lafcadio Hearn) نے جاپان کے بہشتی کنول کا حال

یوں بیان کیا ہے کہ "یہ دل پسند مستیاں باغ لگاتی ہیں، کنول کی کلیوں کی حفاظت کرتی ہیں؛ اور ان کی پلکھڑیوں پر ایسی آسمانی شے چھوڑتی ہیں جس سے ان کو کھلنے میں مدد ملتی ہے۔ کلیاں کسی قدر خوبصورت ہیں: ان کے رنگ اس دنیا کے نہیں ہیں۔ ان کے روشن دلوں کی صبح کی سی چمک میں چھوٹے چھوٹے ننگے بچے بیٹھے ہوے ہیں، اور ہر ایک کے گرد ایک چھوٹا سا ہالہ ہے - یہ ارواح نئے نئے بدھ اور 'ہوتوکے' (Hotoke) ہیں، جو خوشی میں پیدا ہوگئے ہیں - کچھ بہت ہی چھوٹے ہیں اور کچھ بڑے بھی۔ ہر ایک ظاہرا بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی دایائیں آب حیات کا سا اثر رکھنے والی چیزیں ان کو کھلاتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنا کنول کا ہنڈولہ چھوڑ دیا ہے اور ایک جِزو (Jizo) کی رہنمائی میں عالم بالا کی روشنی کی طرف جا رہے ہیں" —

اہل چین* کی متھیا میں تو'مو' شمالی ستارے کی دیوی ہے - بدھ مت اور تاؤ مت دونوں کے پیرو اس کی پوجا کرتے ہیں - تو'مو' دیوی کی مورتی میں دیوی کے سر پر ایک تاج ہے - اور وہ کنول کے تخت پر بیٹھی ہوئی ہے - اس کے تین آنکھیں اور اٹھارہ بازو ہیں - یہ دیوی موت و حیات کی کتاب پر موکل ہے اور جو لوگ عمر طویل کے خواہشمند ہیں وہ اس کی پوجا کرتے ہیں -

اہل چین کنول نوازی میں کچھ اور آگے بڑھ گئے ہیں - انہوں نے اپنے بعض مقامات کے نام کنول کے نام پر رکھے ہیں - چنانچہ ان کی متھیا†

---

* چین کی متھیا، ورنر؛ ص ۱۴۴ -

† چین کی متھیا، ورنر؛ ص ۳۴۴ - ۳۴۵ -

میں بندر دیوتا کے متعلق (جو ایک مہتم بالشان ہستی ہے) ایک طول طویل کہانی ہے ' اس کی واردا توں کے مقامات میں سے ایک پہاڑ ہے ' جس میں ایک غار ہے جسے ' کنول غار ' کہتے ہیں ؛ اور اس غار میں دیووں کا ایک جتھا رہتا ہے —

چین * میں بدھ مذہب کے دیوتاؤں میں ایک مسئلۂ تثلیث بھی ہے میں مہاتما بدھ ' ان کی تعلیم اور پوجا شامل ہے ؛ اور جسے وہ لوگ شکیا فو (شاکیہ) ' اومی توفو (امیت) اور جولائی فو (تتھا گاتا) ؛ اور کبھی کبھی فوپاؤ ' فے پاؤ اور سھاگ پاؤ (سین پاؤ یعنی ' تین نادر ہستیاں — مہاتما بدھ ' جو اس دنیا میں دھرم بتانے کے لیے آئے ؛ دھرم اور سنگھ) کہتے ہیں - پروھتوں کے واسطے یہ محض بدھ جی — گذشتہ' موجودہ اور آئندہ — ہیں - ان تینوں بزرگوں کو نقش یا مورتی میں اس انداز سے دکھایا جاتا ہے کہ وہ کنول پر بیٹھے ہوے ہیں —

اہل یونان بھی کنول کی عالم گیر اور سخت گرفت سے آزاد نہ تھے - چنانچہ قدیم یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ جنگل † اور سرکوں کے کنارے پر کا ہر درخت ایک خاص دیوتا کی حفاظت میں رہتا ہے جس کو وہ ہمدریاد (Hamdryad) کہتے تھے - اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دیوتا اسی درخت پر رہتا تھا اور اپنی جان بھی اسی پر قربان کر دیتا تھا - کچھ لوگوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ بعض انسانی ہستیاں اپنی وفات کے بعد ہمدریاد کی شکل اختیار کر لیتی تھیں - چنانچہ روایت ہے کہ

---

* چین کی متھیا ' ورنر ص ۱۱۹ - ۱۲۰ -

† یونان اور روم کی متھیا مصنفہ ہ ' ا ' گربر (H. A. Guerber) ص ۲۶۱ - ۲۶۳ -

ایک نوجوان شہزادی' جس کا نام دریوپ (Dryope) تھا' سن بلوغ کو پہنچتے ہی اپنے واسطے ایک مناسب شوہر کی متلاشی ہوئی: اور بڑی جد و جہد کے بعد اس کی شادی اندریمان (Andraeman) نامی ایک شاہزادے سے قرار پائی - قصہ مختصر' شادی ہوئی اور خدا نے اس کو ایک بیٹا بھی دیا - شہزادی دریوپ ہر روز اس بچے کو محل کے قریب ہی ایک تالاب پر لے جایا کرتی جس میں رنگ برنگ کے پھول اُگے ہوے تھے - ایک دن جب وہ حسب معمول وہاں خرام ناز میں مشغول تھی' اس نے ایک کنول کا پھول دیکھا' اور اپنے بچے کو بھی دکھایا - پھول کو دیکھتے ہی بچے نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا - اس کو خوش کرنے کے لیے دریوپ نے پھول توڑ کر بچے کو دے دیا - پھول کے توڑتے ہی ٹوٹی ہوئی ٹہنی سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے اور دریوپ نقش حیرت بن کر رہ گئی - دفعتاً اس نے ایک آواز سنی جس نے اس پر لوتس (Lotis) نامی ایک ارواح کو مارڈالنے کا الزام لگایا جس نے سایہ کے دیوتا پرائی پوس سے بچنے کے واسطے ایک پھول کی شکل اختیار کرلی تھی - دریوپ نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے قدم زمین میں گڑے رہ گئے - اس کی حیرت و یاس کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ درخت کی چھال اس کے پیروں پر بہت تیزی سے چڑھتی جارہی ہے؛ یہاں تک کہ اس کا پورا جسم چھال اور پتوں سے ڈھک گیا اور انسانی ہیئت کا کوئی اثر تک باقی نہ رہا: وہ ایک درخت میں منتقل ہوگئی —

یونان کی قدیم تاریخی روایات میں شہر صور (ٹرائے) اور ہیلن کے واقعے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ذکر اور تکرار سے مستغنی ہے - لطف

ہے کہ اس تمام واقعے میں بھی کنول کار فرما ہے۔ راوی جادو بیان روایت کرتا ہے کہ ٹرائے سے واپس ہو کر یولی سیس * اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سفر کی تکلیفیں برداشت کرتا ہوا ایک ملک میں پہنچا جن کی خاص خوراک کنول کا پھل (تال مکھانا؟) تھی؛ اور اسی سبب سے اس کو "کنول خوروں" کا ملک کہتے تھے۔ یولی سیس نے اول اپنے تین ہمراہیوں کو وہاں کے باشندوں سے ملاقات کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اندر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ وہاں کے چند بے فکرے اپنے محبوب درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اسی کے پھل کھا رہے ہیں۔ انہوں نے نہایت ہی احترام سے اجنبیوں کا خیر مقدم کیا؛ اور کنول کے پھل سے ان کی خاطر تواضع کی۔ اس پھل کے کھاتے ہی ان کے دماغ سے اپنے وطن اور اہل وطن کا خیال بالکل جاتا رہا ان پر مدھوشی سی طاری ہوگئی —

یولی سیس نے بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کیا اور آخر کار کسی نئے حادثے کے وقوع سے خوف زدہ ہو کر وہ چند مسلح آدمیوں کو ساتھ لیتا ہوا آگے بڑھا۔ اپنی امید کے برخلاف زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنے کے بجائے، اس نے ان لوگوں کو کنول خوروں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے پایا۔ اُن کی نظروں سے مدھوشی ٹپک رہی تھی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر اس کو شبہ ہوا۔ اسی وقت چند کنول خوروں نے نو وارد مہمانوں سے بھی دعوت میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ فوراً ہی یولی سیس نے اپنے رفیقوں کو اس سحر آمیز غذا کو کھانے سے روکا اور اپنے دوستوں کو زبردستی گرفتار کر کے جہاز پر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کا نشہ ہرن

---

* یونان اور روم کی متھیا، باب ۲۸، ص ۳۰۱-۳۰۳؛ یولی سیس کی مہمات۔

ہو گیا اور سب لوگ استقلال کے ساتھ مغرب کی طرف چلے گئے —

ہندوستان کے ہٹھہ یوگی فلسفے میں بھی کنول کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے شت چکر نرپنم (षतचक्रनिरपुणम) نام کے تن تری رسالے میں لکھا ہے کہ آدھار کنول کا بیرونی پردہ ایک مثلث ہے اور اس مثلث کے اندر الگ ہے جسے سویمبھہ کہتے ہیں - انسان کے بدن میں سر سے زیر ناف تک چھ نقاط ایسے ہیں جن کی باقاعدہ اور صحیح ورزش و نگہداشت سے نہ صرف یہ کہ صحت قائم رہتی اور ترقی کرتی ہے بلکہ انسان لیل و نہار کے عدد و شمار سے آزاد ہو کر حیات ابدی بھی حاصل کر سکتا ہے اور اس کائنات میں دانائے کم و کیف اور واقف اسرار موت و حیات بن سکتا ہے - ان نقاط کو عموماً چکر کہتے ہیں اور کنول سے تشبیہہ دیتے ہیں - ان میں سے ہر ایک چکر کی تربیت اور صحیح ورزش سے مختلف اور متعدد حیران کن نتائج پیدا ہوتے ہیں جن سے انسان اپنی جسمانی اور روحانی زندگی میں نامحدود اور بے انتہا ترقی کر سکتا ہے - ہٹھہ یوگ میں جسمانی ریاضت اور ورزش کی متعدد تدبیریں بتائی گئی ہیں - جسمانی صحت کے حصول' قیام اور دوام کے لیے جو ریاضتیں مقرر ہیں ان کو مجموعی طور پر پرانا یام (प्राणायाम) کی ریاضت کہتے ہیں - پرانایام میں طرح طرح کے آسنوں یعنی نشستوں سے کام لیا جاتا ہے - ان آسنوں میں ایک کا نام پدم آسن (पद्मासन) یعنی نشست نیلوفری ہے - پدم آسن بنا کر سانس کو زور سے اندر کھینچنے کی تلقین کی جاتی ہے اور اس بارے میں ہٹھہ یوگ پر دیپک (हटयोग प्रदिपिका) میں یہ تاکیداً بتایا گیا ہے کہ سانس کے ساتھ ہوا کو دل کے کنول تک بھرا لینا چاہیے - اس کی تعریف میں لکھا ہے کہ " جب پیٹ ہوا سے پوری

طرح بھر جاتا ہے تو بدن گہرے پانی میں اس طرح تیرنے لگتا ہے جیسے کنول کی پتی * " —

پر دیپک میں جسم کے چھ ' چکروں " (یعنی ' مرکزوں) کو کنول کے پھولوں سے تشبیہہ دی گئی † ہے - اہل شاستر کا عقیدہ ہے کہ سوم (सोम - یا چندر चन्द्र) انسانی دماغ میں ایک ہزار پتیوں والا کنول ہے اور یہ وہی چیز ہے جو تصویروں میں شیو دیوتا کے سر پر لگا نظر آتا ہے - اس کنول میں سے ایک قسم کا عرق ہر وقت ٹپکا کرتا ہے ؛ اور اگر کوئی شخص اس عرق کے روک لینے پر قادر ہو جائے تو وہ ابد تک زندہ رہ سکتا ہے ‡ چنانچہ پر دیپک کے پچاسویں دوہے میں یہ الفاظ ملتے ہیں : —

" جو کوئی چاند (چندر یا سوم) کی شراب کے ان صاف شفاف قطروں کو پیتا ہے جو دماغ سے دل کے اندر سولہ پتیوں والے کنول پر ٹپکتے ہیں اور جن کو پران (प्राण) کے ذریعے اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ زبان کو حلق کے کوّے سے لگا دیا جائے اور اس حالت میں اس بڑی طاقت پر مراقبہ کیا جائے وہ ہر مرض سے آزاد ہوجاتا ہے اور اس کا بدن کنول کی ڈنڈی کی طرح نازک اور ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے ؛ اور ایسا کرنے والا یوگی بہت بڑی عمر پاتا ہے $ " —

اصل یہ ہے کہ ایشیا کی آریہ اقوام کے عقیدے میں کنول کو قدیم الایام سے بذات خود ایک خدا ' یا کم از کم ایک فوق الانسان

---

* ہٹھ یوگ پردیپک ' انگریزی ترجمہ از پنچم سنگھ (الہ آباد ' ۱۹۱۵ ع) ' ص ۲۶ —
† ہٹھ یوگ پردیپک ' انگریزی ترجمہ از پنچم سنگھ (الہ آباد ۱۹۱۵ ع) ص ۲۸ -
‡ ایضاً ' ص ۳۴ - $ ایضاً ' ص ۳۶ -

اور غیر فانی ہستی ' تسلیم کیا گیا ہے - اسی پران کا یہ عقیدہ بیان کرتا ہے کہ کنول نجس زمین سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ پانی کی سطح پر سے اُگتا ہے اور ہمیشہ پاک و صاف رہتا ہے ' خواہ جھیل کا پانی کتنا ہی گدلا ہو - اس سے اس کی فوق العادت پیدائش کا اظہار ہوتا ہے ! —

کنول ادبیات میں

کنول کو مشرقی ادب و صنعت اور دست کاری میں بھی بہت کچھہ دخل ہے - ہندوستان نے جو جو اہمیت اور عزت کنول کو دی ہے شاید ہی کسی دوسرے پھول کو کسی ملک میں حاصل ہو - لیکن دیگر ممالک ' مثلاً مصر اور فارس ' نے اس کی اس قدر عزت افزائی نہیں کی - شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ پھول ان ممالک میں بہ نسبت ہندوستان کے کم یاب ہے ' مثلاً سرخ کنول مصر میں کہیں نہیں ملتا - البتہ اس کی دیگر دو قسمیں " سفید اور نیلی " کہیں کہیں پیدا ہوتی ہیں - لورے (Loret) نے اس پھول کے کئی ایک مصری نام لکھے ہیں - سرخ کنول کا نام نہیب ہے ' جس کو دوسرے تلفظ کے ساتھہ نخیب اور نشیب بھی کہتے ہیں ؛ سفید کا نام ساشلی اور نیلے کا سرپت (شربت ؟) ہے - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرخ نیلوفر ایران یا ہندوستان سے مصر میں پہنچا تھا ' اور اسی سبب سے اس کا کوئی عام نام نہیں ہے ' اور نہ اس کا حوالہ مصری ادب میں کہیں ملتا ہے - ایران میں علاوہ ان تشبیہات اور استعارات کے ' جو فارسی ادیبوں نے نیلوفر سے اخذ کیے ہیں ' اس کا نام اور کسی سلسلے میں ادب سے منسوب نہیں ہے —

البتہ ہندوستانی ادب میں اس کے حوالے بکثرت ملتے ہیں -

ھندی شاعری میں معشوق کے بدن کو حسن کے لحاظ سے کنول سے تشبیہہ دیتے ھیں ؛ مثلاً : —

کونول * کنول سوگندھ سریرو سمندر لہر سو ھی تن چیرو

بدن کی تشبیہہ کنول سے بلحاظ کیف کے ھے نہ بلحاظ صورت کے چہرے کے حسن کو کنول کے پتے کے حسن سے مشابہ بتاتے ھیں - مثلاً : —

نین چتر دے روپ چتر سے کنول پتر پر مدھ کر پھیرے

معشوق † کے آنکھیں کھولنے کو کنول کے کھلنے سے تعبیر کرتے ھیں - اس کے اعضا کو کنول کا ڈنٹھل ' اور دست نازک ‡ کو کنول بتاتے ھیں - اس کے علاوہ ھندو مذھب کی کتابوں میں جا بجا اس کے تذکرے آئے ھیں - رگ وید $ میں اس کا ذکر ھے اور اس سے بعد سمہتاؤں (संहिता) میں بھی اس کا بیان موجود ھے - رگ وید میں سفید کنول کو پنڈریک کے نام سے یاد کیا گیا ھے - اتھروں وید میں انسان کے دل کا کنول سے مقابلہ کیا ھے - پنچ وِنس براھمن (पंचविंश ब्राह्मण) میں اس کو تارا منڈل کی روشنی سے پیدا شدہ لکھا ھے - یجروید کے تیتری (तैत्तीय) نسخے میں اس قسم کے کنول کے گندھے ھوے ایک مالے کا ذکر ھے جس کا نام پنڈری سرج (पुण्डरीस्रज) ھے - نیلے رنگ کا کنول ' جس کا نام پشکر ھے ' رگ وید اور اس کے بعد کے ویدوں میں کئی جگہ آیا ھے ' اور اول الذکر میں لکھا ھے کہ یہ پھول جھیلوں میں پیدا ھوتا ھے - پرانے زمانے میں لوگ اسے سنگار کے لیے بھی استعمال کرتے تھے - صبح کے

---

* جذبات بھاشا از نیاز فتح پوری (مطبوعہ چے اینڈ سنز الکٹرک پریس دھلی ' ۱۹۱۵ م) -

† وکرم اروسی ' اردو ترجمہ از محمد عزیز مرزا (الناظر پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۲۴ م) ' ص ۷ -

‡ وکرم اروسی ' ص ۵۱ -

$ Encycl. Relig. Eth. ۱۴۲ - ۱۴۲ ص -

دیوتا اسون کو نیلے کنولوں کا مالا پہنے ہوے دکھایا گیا ہے - اس مالے کا نام پشکر سرج ہے - کنول کی ایک اور قسم کو اتھروں وید میں کمد (कुमुद) کہا گیا ہے - وہ یقیناً سفید کنول ہے - براہمنوں میں کنول پہلے پرجاپتی کے ساتھہ ملتا ہے - تیتریا براہمن میں لکھا ہے کہ جب پرجاپتی نے دنیا کو، جو پانی کی طرح مائع تھی، پیدا کرنے کی خواہش کی تو اسے ایک کنول پانی کی سطح پر دکھائی دیا - اس نے یہ خیال کیا کہ یہ ضرور کسی چیز پر ٹکا ہے - یہ سوچ کر اس نے سور کی شکل میں پانی پر غوطہ لگایا - نیچے پہنچ کر اس نے پاؤں تلے زمین پائی - اس نے ایک شاخ توڑی اور اسے لے کر سطح پر آیا، اور پھیلا دیا - پھر تیتریا ارنیک (आरण्यक) میں لکھا ہے کہ جب دنیا پانی کی طرح تھی تو صرف پرجاپتی کنول کے پتے پر پیدا ہوا - مہابھارت * میں لکھا ہے کہ خالق کائنات برھما وشنو جی کے مراقبے کے وقت میں اس کنول سے پیدا ہوا تھا جو وشنوجی کی ناف میں سے اگتا تھا - اسی وجہ سے برھما کا ایک لقب ابجج یا ابججن، یعنی کنول سے پیدا شدہ، ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کنول کا تعلق اصل میں وشنو دیوتا سے ہے، اسی وجہ سے اس کا ایک نام پدم نابھہ، یعنی کنول کی ناف والا، بھی ہے - اس کے علاوہ کنول کو وشنو کی بیوی لکشمی سے بھی نسبت ہے جو قسمت اور حسن کی دیوی ہے - مہابھارت میں لکھا ہے کہ وشنو کی پیشانی سے ایک کنول پیدا ہوا جس سے شری (لکشمی کا دوسرا نام) پیدا ہوئی، اسی لیے لکشمی کا ایک لقب پدم بھی ہے - مہابھارت میں جہاں دولت کے دیوتا کبیر (कुबेर) کی جاے قیام کوہ کیلاش کا ذکر

* A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion از جے، ڈاسن، ص ۵۸ -

ہے ' وہاں اس کی چھپل نللی (नलिनी) اور اس کے دریا مندکنی کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ وہ سنہرے کنولوں سے ڈھکے ہوے ہیں —

کنول کے پتوں پر پانی اور شبنم کے قطرے دھوپ کی روشنی میں چمکتے ہوے بڑے بڑے آبدار موتیوں کی آب کو شرماتے ہیں - کیا عجب ہے کہ چین اور تبت کے مہاتماؤں نے ان ہی قطروں سے متاثر ہوکر 'اوم منی پدم ہوم' (یعنی' خدا کنول پھول میں ایک گوہر ہے) کا عقیدہ قائم کیا ہو - اس کے علاوہ بودھ مذہب والوں کے اعداد و شمار پدم اور پنڈریک' جو کنول کے نام ہیں' سب سے بڑے اعداد ہیں - مہایانا بودھ مذہب والوں کی ایک شرعی کتاب کا نام بھی کنول پر ہے جس کو سد دھرم پنڈریک (सद्धर्म पुण्डरीक) کہتے ہیں -

ایران کی سر زمین میں کم یاب ہونے کے باوجود نیلوفر نے فارسی ادب پر اپنا اثر قائم کر لیا تھا - ایرانی شعرا نے بھی نیلوفر کی تشبیہات سے کام لیا ہے - سحاب اصفہانی کا شعر ہے :—

• بچشم قطرہ بارم مردم چشم چو در دریا یکے نیلو فرستی

خواجو کرمانی نے لکھا ہے :—

† اے خط سبز تو ہمچوں برگ نیلوفر در آب
قند مصر از شور یاقوت تو چوں شکّر در آب
برگ گل خود روی رویت کآب روے حسن از وست
سبزۂ سیراب را بلگر چو نیلوفر در آب

• منقول از Wit, Humour and Fancy of Persia از مہر جی بھائی کوکا ' بمبئی سنہ ۱۹۲۳ ع ' ص ۵۴ —

† خواجوی کرمانی ' باهتمام ح ' کوهی‌کرمانی ' طهران چاپخانهٔ ' خاور ' تیر ماه ۱۳۰۷ ' ص ۱۰ - ۱۱

کنول صنعت اور دست کاری میں

صنعت اور دست کاری میں بھی کنول نے خاص اہمیت حاصل کی ہے - سفید کنول کے مالے اُمس' امن ہتپ اول اور رامھزز ثانی کی مومیائیوں پر رکھے ہوے تھے' اور' جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے' یہی پھول ہے جس پر ہورس بیٹھا ہوا نظر آتا ہے - یہ مورت آٹھویں صدی قبل مسیح کی بنی ہوئی ہے - مصر میں بہ نسبت سفید کے نیلے کنول زیادہ ملتے ہیں - عام طور پر وہاں کے پرانے مقبروں میں ان کی تصویریں نظر آتی ہیں - ستونوں کے اوپر کے حصے کو کنول کی شکل کا بنانے کی ابتدا غالباً یہیں سے ہوتی ہے - م' ا' اسٹائن (M. A. Stein) کا بیان ہے کہ اس نے ایران میں ایک ایرانی بودھی ستو کی مورت دیکھی ہے' جس میں بدھ کو ایک کنول سے سجی ہوئی نشست پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے - یہ تصویر ایک چوبی دروازے پر بنی ہوئی ہے * ایرانی دست کاری میں کنول کے استعمال کی ایسی اور کوئی قابل ذکر مثال نہیں ملتی —

ہندوستانی صنعت میں ہم کنول کو سنہ ۲۰۰ ق م کے بعد کی بنی ہوئی عمارتوں میں پاتے ہیں - سانچی' بھرہت' امراوتی اجنتا اور بودھ گیا کی عمارتوں میں کھلے ہوئے کنول جا بجا کندہ کیے ہوئے نظر آتے ہیں - مغربی ہندوستان میں چٹانوں پر بنے ہوئے بودھ مندروں کے ستونوں' دروازوں اور چھتوں میں بھی کنول زینت و زیبائش کے لیے تراشے گئے ہیں - للتا میں زیلوں پر آدھے کنول بہت ہی صفائی سے بنے ہوئے ہیں - ٹہنیوں پر کھلے ہوئے کنول گندھار اور متھرا کی عمارتوں میں جا بجا بنے ہوئے ہیں' اور سانچی کے ستونوں اور امراوتی کے دروازوں پر نہایت خوبصورت

* Encycl. Relig. Eth.

کنول کندہ کیے ہوئے بکثرت ملتے ہیں —

اس کے علاوہ قدیم زمانے کی مورتوں اور مجسموں میں ہندی دیوی دیوتا اکثر کنول کے اوپر بیٹھے یا کھڑے دکھائی دیتے ہیں - اس کی سب سے پرانی اور عمدہ مثالیں اودے گری ' برہت ' اور خاص کر سانچی میں ' جہاں بڑے استوپ کے دروازوں پر ہندو دیوی لکشمی کی مورت کندہ ہے ' ملتی ہے - ان مقامات کی نقاشیوں میں لکشمی کنول پر یا تو کھڑی یا بیٹھی ہوئی بنی ہے اور اس کے ہر ہاتھ میں کنول کا ایک پھول ہے ' جس پر دو ہاتھی اپنی سونڈیں اٹھائے ایک برتن سے پانی برسا رہے ہیں - اس قسم کی مورتیں ہندوستان میں ہر جگہ ملتی ہیں ' اور لنکا میں پولن روا کی پرانی عمارتوں میں بھی پائی جاتی ہیں - جب سے مہاتما بدھ کی مورتیں عمارتوں میں بنائی جانے لگی ہیں ' اکثر کنول پر بیٹھے یا کھڑے نظر آتے ہیں - اس قسم کی مورتیاں ہمیں راجگیر (بہار) ' کلھیری غار (بمبئی کے قریب) ' اور گندھار (شمال مغرب میں) ملتی ہیں - آہستہ آہستہ یہ رواج غیر ممالک میں بھی پھیل گیا اور اس قسم کی مورتیں نیپال ' برما ' چین اور جاپان میں بھی تراشی جانے لگیں - اگر کسی تصویر میں مہاتما بدھ کنول پر بیٹھے یا کھڑے نہیں ہیں تو اس حالت میں دو یا تین اور کبھی کبھی چار کنول ان کے سامنے پڑے ہوئے ہیں جیسے گندھار میں - مہاتما بدھ کے علاوہ دیگر بودھی ستو بھی کنول پر بیٹھے یا کھڑے ' نہ محض ہندوستان بلکہ غیر ممالک میں بھی ' ملتے ہیں - مثلاً منجسری کو کنول پر بیٹھے ہوئے ہم علاوہ سارناتھ (بنارس کے قریب) کے جاوا اور تبت میں پاتے ہیں - تبت کی ایک نئی تصویر میں ہم میتریے کو کنول پر بیٹھے ہوئے پاتے ہیں - چین میں بودھی ستو اولوکتیشور

(बोधिसत्व अवलोकितेश्वर) بھی کنول ھی پر براجمان دکھائی دیتے ھیں- اس بودھی ستو کو کنول سے ایک خاص تعلق ھے' کیونکہ بودھ مذھب کے عقیدے کے مطابق وہ کنول سے پیدا ھوا تھا اسی وجہ سے اس کا لقب پدم پنی ھے - مزید برآں بودھ مذھب والوں کی دعا 'اوم منی پدم ھوم' اسی سے متعلق ھے - کنول کا ھردل عزیز ھونا اس سے بھی ثابت ھوتا ھے کہ ھم پیتل کی مورتوں میں نہ محض ھندو دیوی دیوتا بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے بڑے بڑے مہاراجاؤں کو بھی کنول پر بیٹھے ھوے پاتے ھیں —

ایک عجیب بات یہ ھے کہ حالانکہ مسلمانوں نے نیلوفر کو اپنی عمارتوں میں جگہ نہیں دی' تاھم گور میں ایک مسجد ھے جس کو سنہری مسجد یا خواجہ سراؤں کی مسجد کہتے ھیں اور اس کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں خوبصورتی سے تراشے ھوے ھندوستانی * کنول بنے ھوے ھیں - شاید یہ ھندوستانی صنعت کے اثر کا نتیجہ ھے —

مختصر یہ کہ کنول پھول ایک نہیں کئی وجوہ سے نہایت اھم پھول ھے' اور یہ کہنا تو کسی طرح غلط نہیں ھے کہ وہ مقدس ھے!

---

* Medieval India از ایشوری پرشاد (انڈین پریس الہ آباد) ' ص ۲۱۱ -

اردو زبان کے قدیم کتبے

(۱)

(از ۔ اڈیٹر)

اسلامی عہد کی قدیم عمارتوں پر اکثر کتبے فارسی زبان میں ہیں اور قدیم عمارتوں ہی پر کیا موقوف ہے ' بہت سی حال کی عمارتوں پر بھی فارسی کتبے نظر آتے ہیں - عموماً کتبے اس وقت تک کسی زبان میں نہیں لکھے جاتے جب تک اس کا رواج عام نہ ہو - فارسی کا رواج اس ملک میں جیسا کچھ تھا اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں - ہمارے ہاں کے طبیب اب تک اپنے نسخے فارسی میں لکھتے ہیں - رواج بہت سخت جان ہوتا ہے ' یہ مٹتے ہی مٹتے مٹتا ہے - میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے بعض قدیم عمارتوں پر قدیم اردو یا ہندستانی زبان کے کتبے نظر آئے - اس زبان کا سب سے قدیم کتبہ مجھے احمدآباد کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ملا —

سب سے پہلے شمالی ہند سے ہندستانی زبان گجرات اور دکن میں پہنچی اور وہیں اسے ادبی حیثیت حاصل ہوئی - علاءالدین خلجی نے سنہ ۶۹۶ ھ میں گجرات پر تسلط کرلیا اور اپنی طرف سے صوبیدار مقرر کردیا - صوبیداری کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا ' یہاں تک کہ جب دہلی

پر تیمور کا لشکر پہنچا اور وہاں کی حکومت میں ضعف آگیا تو صوبیدار ظفر خاں کے تاتار خاں نے خود اپنی حکومت قائم کرلی اور محمد شاہ کا لقب اختیار کرکے تخت پر بیٹھ گیا (سنہ ۸۰۶ ھ) - خلجیوں کے تسلط اور تغلقوں کے زمانۂ حکومت میں علاوہ لشکر کے ہر پیشے اور ہر مشرب کے لوگ دلی سے گجرات پہنچے اور ان کی زبان دکن کی طرح گجرات میں بھی رائج ہوگئی - شاہان گجرات کی حکومت اکبر کے عہد تک رہی، اس کے بعد گجرات کا صوبہ اکبر کی سلطنت میں شامل ہوگیا - غرض دہلی کا اثر اس علاقے پر امیر خسرو کے زمانے سے لے کر آخر تک رہا —

لیکن حکومتوں اور بادشاہوں سے بڑھ کر فقرا اور صوفیا نے کام کیا جو اس زمانے میں، بلکہ اس سے قبل، وہاں پہنچ گئے تھے - صوفیا کا مسلک صلح کل ہوتا ہے اور وہ اپنے پیغام کی تلقین اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی طرف ایک کشش سی ہوتی ہے - منجملہ اور طریقوں کے جو وہ اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے ایک یہ بھی تھا کہ باوجود صاحب علم و فضل ہونے کے وہ تلقین و تعلیم عام لوگوں کی زبان میں کرتے تھے - اگرچہ زبان و ادب کی اشاعت سے براہ راست انہیں کوئی تعلق نہ تھا لیکن چونکہ ان کی تعلیم کسی خاص فرقے یا طبقے سے مخصوص نہیں ہوتی اور ان کا فیض عام ہوتا ہے بلکہ طبقۂ عوام کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور طالب فیض ہوتے ہیں، اس لیے ان کے سمجھانے کے لیے انہیں کی زبان میں ان سے باتیں کرتے اور انہیں کی زبان میں تعلیم و تلقین کرتے تھے - گجرات و دکن میں ان کی بدولت اس زبان کو، جسے ہم آج کل اردو یا ہندستانی کہتے ہیں، بہت کچھ فروغ ہوا —

گجرات کے ان بزرگوں میں سے بعض کا کلام اور حالات ہم تک پہنچے ہیں - مثلاً حضرت قطب عالم (ولادت سنہ ۷۹۰ ھ ' وفات سنہ ۸۵۰ ھ) اور اُن کے فرزند حضرت شاہ عالم (ولادت سنہ ۸۱۷ ھ ' وفات سنہ ۸۸۰ ھ) اپنے زمانے کے اولیاءاللہ میں سے تھے - ان کے متعدد ہندی اقوال اب تک محفوظ ہیں —

شیخ وجیہ الدین احمد علوی احمد آباد کے بڑے عالم اور صاحب باطن بزرگ تھے (سنہ ۹۱۰ ھ - سنہ ۹۹۸ ھ) - ان کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے گئے ہیں جس کا نام سحرالحقائق ہے - اس میں جگہ جگہ ان کے ہندی اقوال درج ہیں —

سید شاہ ہاشم (متوفی ۱۰۵۹) گجرات کے مشہور اولیا میں سے ہیں - آپ کے ایک خاص مرید نے آپ کے اقوال وغیرہ ایک کتاب میں جس کا نام مقصودالمراد ہے ' جمع کیے ہیں - اس میں جابجا کثرت سے شاہ صاحب کے ہندی اقوال و ابیات و نظمیں درج ہیں —

ایسے اور بہت سے بزرگ ہیں جن کے ہندی اقوال وغیرہ ہم تک پہنچے ہیں - لیکن ان بزرگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا مستقل مرتب کلام بھی موجود ہے - مثلاً قاضی محمود دریائی کا مکمل دیوان محفوظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کی ابتدائی صورت کیا تھی - قاضی صاحب کا سنہ وفات ۹۴۱ ہجری ہے - دوسرے بزرگ شاہ علی محمد جیو گام دہلی ہیں جن کے دیوان کا نام جواہر اسرارالله ہے - دیوان کے مرتب شاہ صاحب کے ایک معتقد ہیں جو اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ " بطریق نظام بالفاظ گوجری بزبان مہاک خود فرمود " - گوجری سے یہاں وہی زبان مراد ہے جو دلی

سے آکر گجرات میں رائج ہوئی اور اس میں گجراتی کی آمیزش ہوئی - قاضی محمود دریائی اور شاہ علی محمد جیو کے کلام میں خاص گجراتی زبان کے الفاظ اکثر جگہ آتے ہیں - ان دونوں بزرگوں کے کلام کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زبان میں وہ لکھتے ہیں وہ ہندی اور گجرات کی آمیزش ہے جس میں کہیں کہیں عربی فارسی الفاظ بھی آجاتے ہیں - شاہ صاحب کا سنہ وفات ۹۷۳ ہجری ہے -

ایک تیسرے صاحب تصانیف بزرگ میاں شیخ خوب محمد چشتی ہیں - وہ اپنی زبان کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ " من بزبان گجرات کہ بہ الفاظ عربی و عجمی آمیزہ است ' گفتہ ام " ان کی زبان قدیم گجراتی اردو کا اچھا نمونہ ہے - قطع نظر اس کے کہ کہیں کہیں کوئی خاص گجراتی لفظ آجاتا ہے وہ اچھی خاصی پرانی اردو ہے جس میں ہندی کے ساتھہ فارسی عربی کے لفظ بلا تکلف استعمال کیے گئے ہیں - نسبتہً ان کا کلام بہت صاف اور سلیس ہے ان کا سنہ وفات ۱۰۲۳ ہجری ہے -

یہ مختصر سی تمہید میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ زبان کی ابتدائی صورت ذہن میں رہے - دوسرے جو کتبہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق بھی ایک گونہ انہیں بزرگوں میں سے ایک سے ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے - یہ کتبہ جس کا چربہ آپ کے سامنے ہے احمد آباد کی مسجد رائے کھڈ میں ہے - یہ مسجد شاہ علی محمد جیو گام دھنی کے مزار کے مغرب جانب کم و بیش پچاس قدم کے فاصلے پر اسی احاطے میں ہے - اس مسجد کی تعمیر بالکل مختصر سی ہے - مینار اچھے طرز کے اچھے ہیں - مسجد میں چھوٹا سا صحن ہے اور اس کی قبلہ رو دیوار میں تین محرابیں ہیں اور ہر محراب میں ایک

ایک کتبہ ہے جن کی تفصیل یہ ہے —

۱ - درمیانی کتبے پر یہ آیت ہے : -

" وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احداً " -

۲ - داہنی جانب کا کتبہ :-

محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم -

یہ شجرۂ طیبہ معلوم ہوتا ہے - اس کے آخر میں سنہ احدی و ستین و تسعمأتہ یعنے ۹۶۱ ہجری ثبت ہے -

۳ - تیسرا کتبہ جو بائیں طرف ہے وہ اصل مقصود ہے - اس کے اوپر کے حصے میں احمد شاہ بادشاہ گجرات کا شجرہ ہے جس کے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی ' اور اس کے نیچے دو شعر پرانی اردو یا ہندستانی میں ہیں جن کے آخری مصرع سے تعمیر مسجد کا سنہ تاریخ نکلتا ہے - اوپر کی تین سطروں میں بادشاہ کا شجرہ یہ ہے :-

۱ - المعتصم باللہ الرحمن غیاث الدنیا والدین ابوالمحامد احمد شاہ -

۲ - ابن عم محمود شاہ بن لطیف شاہ اخ بہادر شاہ بن مظفر شاہ بن محمود شاہ -

۳ - ابن محمد شاہ بن احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان خلد ملکہ '

آخری دو سطروں میں یہ دو شعر ہیں -

فتا دنہیں سمجھائکر باندھے شاجی پال بانو مسجد کے تئیں بھیجیں ملک جلال

تاریخ اس مسمت کی ہوئی سو یوں مشہور مسجد جامع کے بیچ دتھایا پے نور

آخری مصرع سے سنہ ۹۶۳ ھ نکلتا ہے —

احمد شاہ گجرات کے آخری بادشاہ سلطان بہادر مظفرنلو کا پوشرو تھا - اس کے بعد سلطنت کا خاتمہ ہوجاتا ہے - یہ دونوں اپنے امرا کے ہاتھہ میں مثل کٹھہ پتلی کے تھے - احمد شاہ سنہ ۹۶۱ ھ میں تخت نشین ہوا اور سنہ ۹۶۸ ھ میں قتل کردیا گیا - یہ مسجد اُسی کے زمانے میں تعمیر ہوئی اور اس پر جو کتبہ ہے اُس زمانے کی اردو کا نمونہ ہے - اس لحاظ سے یہ کتبہ بہت قابل قدر ہے اور اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ یہ زبان جسے ہم اردو یا ہندستانی کہتے ہیں ملک کے اطراف و جوانب میں صدیوں پہلے پوری طرح پھیل چکی تھی - یہاں تک کہ اس میں کتبے تک لکھے جاتے تھے -

بنگالی اور اُردو

از

(جناب محمد اجمل خاں صاحب - ایم - اے - ایل ایل - بی - محقق اسلامیات - شانتی نکیتن (بنگال)

غریب اردو کے سوا ہر زبان کے بولنے والے اپنی زبان پر فخر کرتے ہیں - اور اس غلط فہمی میں سب مبتلا ہیں کہ اُن کی زبان سے بہتر دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ہو - دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ اپنی زبان سے انسان کو فطرتاً محبت ہوتی ہے - اور فراوانیٔ محبت یقیناً ' جذبات کی شدت کی وجہ سے ' انداز نگاہ پر اثر ڈالتی ہے - حب الشیٔ یعمی و یصم -

لیکن اردو بولنے والے ' یعنی وہ جن کی مادری زبان اردو ہے ' کیوں اس فطری میلان سے محروم ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات محبت کی لذتوں اور الفت کی کیفیتوں کو کسی نہ کسی ترکیب سے عقل کی ماتحتی میں لایا جاسکتا ہے ' اور محبت کے بہتے ہوئے دھارے کا رخ بدل دیا جاسکتا ہے - یعنی یہ نہیں کہا جاتا کہ اپنی زبان سے محبت نہ کرو - بلکہ ایسی زبان سے کرو جو " اپنی " تو ہو - سوال ہوتا ہے کہ اردو اپنی نہیں تو کس زبان کو اپنی سمجھیں - جواب ملتا ہے کہ " اپنی " زبان وہ ہے جس میں اپنا مذہب ہے ' اپنا تمدن ہے ' اپنی روایات ہیں - غرضکہ جس میں اپنا سب کچھ ہے - بہت سے سادہ لوح

اس فریب میں آجاتے ہیں اور اردو کی بجائے مذہب سے محبت کرنے لگتے ہیں یعنی اردو سے بہت دور ہوجاتے ہیں - اسی قسم کی غلطی ہوتی ہے جس سے اکثر "والدین" اپنی اولاد کو دوسرے مشاغل کی محبت سے باز رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "میاں چند روز کی بات ہے، بی - اے - پاس ہوجاؤ پھر دل کھول کے زندگی کی دلچسپیوں سے بہرہ اندوز ہولینا" - اور ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ اکبر کا قول اکثر صادق آتا ہے - یعنی :—

امتحان پیش نظر اور عاشقی بالائے طاق

لیکن کجا وہ مصحف روئے یار، اور کجا یہ اوراق تیرہ و تار

کجا وہ زندگی و تابندگی، کجا یہ مردنی و پژمردگی - وہ بہار کی صورت، یہ خزاں کا نمونہ، وہ جان بخش یہ جان ستان - بیچارہ طالب علم دیکھتا تو کتاب ہی کو ہے مگر حروف کی شکلیں کسی کے چہرے سے بدل جاتی ہیں - اور کانٹ اور ارسطو کی موشگافیوں میں اُسے کسی کے الجھے ہوے گیسو نظر آنے لگتے ہیں - اور آخرکار جب لیلا کی ماں کو مجلسوں کے بی - اے پاس کرنے سے ناامیدی ہوتی ہے تو دیکھنے والے بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم نہ کہتے تھے کہ —

کجا عاشق، کجا کالج کی بکواس !

ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں کھاس !

منشا اس گزارش کا صرف یہ ہے کہ زبان کی محبت ہو یا مذہب کی، اگر اُسے غیر فطری طریقوں سے غلط راستوں پر ڈالا جاے گا تو یقیناً نتیجہ وہی ہوگا جو ہندستانی زبان کو ہندی بنانے اور اُلٹی گنگا بہاکر مذہبی خدمت کرنے کے نام سے آج کل ہورہا ہے - یعنی ترقی معکوس !

کوئی ان نقل محبت کرنے والوں سے پوچھے کہ زبان اساس مذہب و تمدن ہے یا مذہب اساس و بنیاد زبان؟ جاننے والے بتائیں گے کہ زبانوں کے ذریعہ سے مذاہب نے ترقی ہے لیکن کسی مذہب نے آج تک کوئی زبان نہیں بنائی - آوستا مردہ ہوگئی لیکن مذہب زرتشت باقی ہے - عبرانی کے سمجھنے والے دنیا میں خال خال ہیں لیکن یہودیت کے نام لیوا جرمن اور روسی زبانیں بول رہے ہیں اور احیاے مذہب و تمدن کے پردے میں جامع فاروقی کی اذان کو "دیوار گریہ" کے نقار خانہ کے شور و ہنگامہ میں طوطی کی آواز سے بھی کم وقعت کردینا چاہتے ہیں - نصرانیت کا غلبہ جیسا کچھ ہے ظاہر ہے - لیکن آج کون ہے جو دعوے کرسکے کہ میں یسوع مسیح کی زبان سمجھتا ہوں، جب کہ خود ناصرہ میں سیکڑوں سال سے عربی رائج ہے اور آرامی کا کوئی نام بھی نہیں لیتا - بدھ اور ہندو مذہب کے متعلق بعد میں عرض کروں گا - اس لیے ذرا اسلام کا بھی قصہ سن لیجئے —

لاریب کہ قرآن کی زبان عربی ہے - اور ہندستانی مسلمانوں کو دنیا میں سب سے زیادہ اس زبان اور اپنے مذہب سے محبت کا دعوے ہے - ایک حد تک ہندوستان میں عربی کی تعلیم بھی رائج ہے - حتیٰ کہ بنگال کے اسکولوں میں اردو اور عربی کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے - فارسی کا کہیں تذکرہ نہیں - ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں عربی کی طرف خاص توجہ تھی - لیکن اکثر کتابوں کی تعلیم فارسی کے ذریعہ سے ہوتی تھی - وہاں اب آزاد مدارس بہت کم رہ گئے ہیں، اور جو ہیں بھی اُن طرف عامۃ الناس کی توجہ کم ہوتی جاتی ہے - اس لیے کہ جب سے عربی اور فارسی تعلیم کی حمایت سرکار دولت مدار نے شروع کی ہے اور منشی و دبیر

عالم و فاضل کے امتحانات رائج ہوئے ہیں اُس وقت سے تعلیم کا مقصد تعلیم نہیں رہا - بلکہ مقصد ملازمت ہوگیا ہے ' کیفیت کم ' کمیت زیادہ ہوگئی - لیکن وہ طبقہ جو انگریزی مدارس کی طرف رجوع ہوا اور اُس میں سے کسی نے زبان ثانوی کے طور پر عربی لے لی تو گویا اُس نے عالم اسلام پر ایک احسان عظیم کا بوجھ ڈال دیا - الله الله ! ! مقصد نوکری ' مولوی صاحب کے احسان و مروت سے پاس ہونے کا یقین ' اور پھر یہ غرور !

بہر حال ہوا یہ کہ ان ناکارہ مدارس کی پیدا وار نے مفتی بننے کی سند تو گویا لے لی ' لیکن نہ حقیقت میں اُنہیں صحیح تعلیم ملی نہ وہ ملک و ملت کے مفاد کے لیے عربی زبان کے ذریعہ سے اب تک کچھ کر سکے - کیا تو اتنا کیا کہ خدمت قرآن کی جگہ خدمت کعبہ کے نام سے چند روز ولایت ہو آئے اور پورا ہندوستان خلافت کے مرکز میں بھی الاسلامیت کے " خواب " دیکھنے لگا - ترکی نے نہ صرف خلافت کو ختم کر کے عربوں کی صحیح گوشمالی کی بلکہ اس نے عربی قبائل کی غداری کا جواب اس طرح دیا کہ عربی زبان کو بھی اپنی قومی لغت سے خارج کر دیا - اب مصطفیٰ کمال کی شخصیت تو وہی ہے جو پہلے تھی ' لیکن ترک اسے اتا ترک کہتے ہیں - قومی عصبیت یہی رنگ ایران میں لائی ہے - اور اگرچہ ان دونوں ممالک کے خمیر میں عربی زبان داخل ہے لیکن پورداؤد اور اسی کے مثل دوسرے لوگوں کی مسلسل کوشش ہے کہ ماضی کو ' حالانکہ زندہ ہے ' درگور کر دینا چاہیے ' اور " حال " قال کی کیفیت پیدا کرنا چاہیے - گویا کہ یہ قومیں مستقبل میں زندہ ہیں - ماضی دفن حال غائب اور صرف مستقبل کا خواب موجود - عربی

ممالک کو دیکھیے تو ان کی حالت ہی زار ہے - صرف مصر کچھ زندہ ہے - وہاں کے ازہری علما، جن کے سرگروہ علامہ رشید رضا مرحوم تھے، عربی زبان کی محبت میں اتنا غلو رکھتے ہیں کہ قرآن کا غیر زبانوں میں ترجمہ کرنا ہی حرام قرار دیتے ہیں اور باوجودیکہ محمد مارماڈیوک پکھتال مرحوم نے مجلس علمائے مصر کے سامنے یہ کہا کہ میں نے انگریزی میں قرآن کے معنی بیان کیے ہیں ترجمہ نہیں کیا (یعنی یہ Rendering ہے Translation نہیں ہے) لیکن ان کا ترجمہ مصر میں ممنوع قرار پایا، * حالانکہ نصرانیوں کے ترجمے کھلم کھلا فروخت ہوتے ہیں - اس لیے کہ ان کے فروخت کرنے والے اپنی دلیلوں کو زبان شمشیر سے بیان کر سکتے ہیں—

اب ہندستانی مسلمانوں کو صرف مغرب کی طرف دیکھنا باقی ہے، اس لیے نہیں کہ ادھر کعبہ ہے یا مسلمان مغرب کو آسانی سے پہنچانتا ہے - نہ اس لیے کہ مغرب زدہ انگریزی داں طبقہ اُدھر اپنا کعبہ نہیں پاتا - بلکہ اس لیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہیں زیادہ مسلمان ادھر بستے ہیں - اگر قبلۂ اولیٰ کے باشندوں کے لیے فلسطین کانفرنس وجود میں آئی ہے تو قبلۂ ثانی کے ماننے والے بھی تو کسی تحریک "شرق الہند" کے محتاج ہیں - چین کا ایک پورا صوبہ مسلمان ہے - کروروں مسلمان ملایا اور جزائر شرق الہند میں آباد ہیں - نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی حتیٰ کہ سنہ ۱۹۲۵ ع سے انہوں نے ملائی وجاوی زبان کو عربی رسم خط میں لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے اور لیٹن حروف اختیار کر لیے ہیں - پردے کا نام نہیں - اسلام بہرحال وہاں ہے - اور اس کا اثر بھی ہے - لاکھوں حاجی بھی ہیں - لیکن باوجود

* رسالہ رشید رضا پکتھال مرحوم

ہندوستان کے اجارہ داران اسلام کی عدم توجہی اور ذہنی حکومت کی "عنایات" کے اُنھوں نے اپنی قومی تعلیم کا ایک زبردست جال ملک بھر میں پھیلا دیا ہے - اور تعلیم کا ذریعہ ہے ان کی اپنی زبان اور لاطینی (Latin) رسم خط —

شاید آپ کو حیرت ہوکہ پورے ہندستان کے مسلمانوں کی نصف آبادی مشرقی بنگال میں ہے - اور باوجودیکہ سرکار کمپنی بہادر سے حقوق دیوانی کی تفویض کے سلسلے میں دربار دہلی سے یہ شرط قرار پائی تھی کہ زبان عدالت فارسی اور رسم خط بھی فارسی ہی رہے گا، لیکن خود بنگال میں نواب سلیم اللہ خان مرحوم اور ان کے رفقاء کار پر وہ لے دے ہوئی کہ فارسی تو درکنار یہاں کے مسلمان اردو سے بھی ناآشنا ہوگئے - اور کثیر تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو بجا طور پر بنگالی کے مداح ہیں اور اسی زبان اور اسی رسم خط کو اپنا سمجھ کر استعمال کرتے ہیں - حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسلمانوں ہی کا کرم ہے کہ بنگالی زبان اس درجے پر پہنچی، ورنہ یہاں کے برہمن تو اس کا گلا کب کا گھونٹ چکے ہوتے - بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ ترقی اردو کے لیے بنگال سے جزائر شرق الہند تک ایک ایسی تحریک شروع کی جاے جو مستقل اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو —

بنگال میں اور اسی کے ساتھ ساتھ مشرق ادنیٰ میں اردو کی ترقی کے عظیم الشان امکانات پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہاں کی ادبی و سیاسی تاریخ کے اوراق کو گردش میں لانا چاہیے - بدھ مذہب کا حال تو ظاہر ہی ہے، یہ ہندوؤں کی فرقہ پروری اور تنگ نظری کے خلاف ایک جہاد بھی تھا اور بغاوت بھی - شاید جہاد کا مفہوم بغاوت ہی

کے لفظ سے زیادہ ادا ہوسکتا ہے - مسلمان فقیہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں لیکن گوتم بدھ نے سماج کی چھوت چھات ' جاتی کے بندھنوں ' اور داسیوں کی زندگی کا رخ بدلنے کا نام جہاد رکھا تھا - اور بنگال میں اس کا خاصا اثر بھی ہوگیا تھا - ہندوؤں کا سب سے پہلا قانون ساز منو تھا ' جو زمانہ قبل تاریخ میں پیدا ہوا تھا - اُس کے قوانین کا مجموعہ منو کا دھرم شاستر کہلاتا ہے - لیکن وہ اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں - سنی سنائی باتیں اور رسم و رواج کے مجموعہ کو بھرگو سنگھتا میں جمع کر دیا گیا ہے - یہی منو کے نام پر رائج ہے - شاید یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ جو بہت بعد میں پیدا ہوے اور اُن کے ماننے والے کافی تعداد میں بنگال میں تھے ' اس قانون کے مطابق اچھوت قرار پاے - یہ بھی ممکن ہے کہ آریوں نے بدھ سے پہلے ہی اس ملک کے جنگلات اور جنگلی اقوام کا لحاظ رکھتے ہوے اسے مردود قرار دے دیا ہو - ڈی - سی - سین نے " تاریخ ادبیات بنگال " کے صفحہ ۴ پر لکھا ہے " قوانین منو کے مطابق ہر ایک ہندو پر واجب ہے کہ وہ اس ملک (بنگال) سے کوئی تعلق نہ رکھے - اس میں نجس و ناپاک (بدھ مرم) ہوجانے کا خطرہ ہے - آنند تیرتھ کے سے مشہور شارح کا قول ہے کہ بنگال راکھشسوں اور پشاچوں کا مسکن ہے " اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تک شمال مغربی ہندستان کے ہندوؤں کے نزدیک بنگالی قوم کا درجہ ہندو سماج میں بہت ہی ادنیٰ ہے —

سب سے پہلے بدھ مذہب والوں نے سنسکرت کو چھوڑا ' اور ملکی زبانوں میں مذہبی لٹریچر کو رائج کیا - بنگالی زبان کے پہلے محسن وہی ہیں - یہ دسویں صدی مسیحی کی بات ہے - لیکن جب برہمنوں نے

قتل عام اور جلا وطنی کے ذریعہ سے بودھوں کو برما اور چین کی طرف بھگا کر ملک کو صاف کر دیا، تو کرشنا پنڈت نے بارھویں صدی مسیحی میں بنگالی زبان کا نام پیشاچی پراکرت (بھوتوں کی زبان) قرار دے کر ایک گرامر (قواعد زبان) لکھی، سنسکرت کے حامیوں نے اسے قبول نہیں کیا، اور بنگالی بولی تحریری زبان ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مذہب، عبادت و قربانی کے اجارہ داروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بودھوں کی زبان، مذہب اور رسوم کو مٹاتے بلکہ کمال یہ کیا کہ خود اپنے لٹریچر کے کسی حصے میں اس واقعہ کا تذکرہ بھی نہیں آنے دیا۔ لیکن بودھ گیا کا وہ عظیم الشان بدھ مندر زبان حال سے اس کی شہادت دے رہا ہے کہ مذہب کے نام پر اہنسا کے ماننے والے جب ہنسا پر اُتر آتے ہیں تو سیکڑوں بتوں کے نہ صرف ناک کان کاٹ لیتے ہیں، بلکہ زندہ آدمیوں کے ساتھ ایسے مندروں کو بھی دفن کر دیتے ہیں جن کی شکست و ریخت اُن کی اُستواری کی وجہ سے ناممکن ہوتی ہے۔ سیکڑوں سال کے بعد آج گیا کا مندر، جو چار مینار سے دونا بلند ہے، زمین کی گہرائیوں سے اس طرح برآمد ہوا ہے کہ گویا ہندوستان کے فرنگی حکمران حضرت مسیح کے سچے جانشین ہیں کہ مردوں میں جان ڈال رہے ہیں۔ بہرحال ہندوؤں نے اس غم و غصہ کا بنگال میں جس طرح اظہار کیا وہ بزدلانہ انتقام کی مکروہ تصویر ہے۔ ایک نمونہ راجہ سودھنوا اس طرح پیش کرتا ہے کہ جب وہ بودھوں اور جینوں کے ہم خیال راجاؤں کو گرفتار کرتا تھا تو حکم دیتا تھا کہ "اُن کے سر کلہاڑیوں سے کاٹے جائیں اور اوکھلیوں میں ڈال کر موسلوں کی مار سے ان کا بھرتا بنایا جائے"۔ (تاریخ ادبیات بنگال صفحہ ۶) —

عام حالات بنگال

عام حالات سے میرا منشا بنگال کا مختصر جغرافیہ اور تاریخ بیان کرنا ہے - جغرافیہ اس لیے، کہ طبعی اور جغرافی کیفیتوں کا ہر ایک زبان پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے، اس کے بغیر زبان کا صحیح ارتقا سمجھنا نا ممکن ہے - حقیقت یہ ہے زبان نہ صرف اظہار خیال کا ذریعہ ہے بلکہ ایک ایک لفظ اپنے اندر ایک پوری تاریخ پوشیدہ رکھتا ہے جو اس کے طبعی ماحول، تمدن اور فلسفہ کا آئینہ ہوتا ہے - تاریخ اس لیے، کہ سیاسی حالات کا انسان کے تمدن و معاشرت سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر اس کا علم نہ ہو تو کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ شمالی افریقہ کی زبان عربی کیوں ہے، امریکہ میں انگریزی کیوں رائج ہے - حالانکہ نہ سندھ میں عربی بولتے ہیں نہ افغانستان میں فارسی - ایک طرف قدیم تمدن و زبان مٹ گئی، دوسری طرف ملکی بولیوں کو زبان بننے کا فخر حاصل ہوا -

جغرافیہ

موجودہ بنگال کا رقبہ چوراسی ہزار مربع میل سے کچھ زیادہ یعنی برطانیہ سے کسی قدر کم ہے - لیکن اس کی آبادی پورے جزائر برطانیہ و آئرستان سے زیادہ ہے - یہاں ہمیشہ ہرے بھرے سدا بہار درخت دکھائی دیتے ہیں اس لیے کہ زمین زرخیز ہے اور پانی کی کثرت ہے - اتنی کثرت کہ سیلابوں کی وجہ لاکھوں آدمی خانماں برباد ہوجاتے ہیں، مویشی مرجاتے ہیں اور بونے کا غلہ اور آلات کشاورزی تک تباہ ہوجاتے ہیں - نتیجہ قحط ہوتا ہے - لیکن بسا اوقات یہی سیلاب مفید بھی ثابت ہوتے ہیں جن سے ہر سال نئی قسم کی کھاد کی ایک تہ زمین پر چڑھ جاتی ہے جس میں دھان، کپاس اور اسی قسم کی چیزیں اچھی پیدا ہوتی ہیں - سیلابوں کی وجہ علاوہ بارش کے یہ بھی ہے کہ

اس ملک میں پورے شمال مغربی ہندوستان کا کیچڑ اور مٹی دریاؤں کے ذریعہ جمع ہوتا رہتا ہے اور دریا اکثر اپنا رخ بدل دیتے ہیں یا مختلف ندیوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں - یہ حالت پٹنہ سے شروع ہوجاتی ہے - قدیم شہر پٹالی پتر دریائے گنگا کے کیچڑ میں بیس فٹ نیچے دفن ہے - اب نیا شہر اُسی پر آباد ہے - لیکن جہاں جہاں دریاؤں نے اپنا راستہ بدل دیا ہے اُس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ وہ بستیاں جو اُن کے کنارے آباد تھیں، تباہ ہوگئیں - یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم تمدن ہند دریاؤں کا مرہون منت ہے - اور اب بھی دریاؤں سے سیکڑوں صنعتوں اور حرفتوں کو نہ صرف مدد ملتی ہے بلکہ ان کے ذریعہ سے بہت کم خرچ میں زیادہ مال ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا سکتا ہے —

پانی کی کثرت کا لازمی نتیجہ تالابوں کی کثرت ہے - کنویں بھی ہیں لیکن اُن کی ضرورت ہی نہیں - اس لیے کہ یہاں کوئی ایسی چیز مثل گیہوں یا جو کے کاشت نہیں کی جاتی کہ اُس کے لیے آب پاشی کی ضرورت ہے - عموماً سب کاشتکاری بارانی ہے چاہی کا وجود نہیں - آبادی کا تین چوتھائی حصہ زراعت پر گزران کرتا ہے - مشرقی بنگال میں صرف چاول اور جوٹ کی کاشت کی جاتی ہے - اور مؤخرالذکر دنیا میں سوائے بنگال کے کہیں پیدا نہیں ہوتا - تلہن، نیشکر اور تمباکو کی بھی کاشت کی جاتی ہے، اور کہیں کہیں روئی بھی پیدا ہوتی ہے - اور زیادہ تر چاول، مچھلی، تیل پر پوری آبادی کی زندگی کا انحصار ہے —

فرنگیوں کی آمد کے ساتھ ساتھ دیہی مصنوعات کی مانگ گھٹ گئی ہے اور کارخانوں کا تیار کیا ہوا مال، خصوصاً کپڑا، فروخت ہونے لگا

ہے - چاء، کان کنی، جوٹ مل، لوہے کی صنعت اور ریلوے کے کارخانوں میں ہندوستانیوں کو مزدوری مل رہی ہے، جن کے سرمایہ دار اور ناظم زیادہ تر یوروپین ہیں - بعض چھوٹی صنعتوں میں ہندوستانی کمپنیاں بھی کام کر رہی ہیں - مثلاً صابون، دیاسلائی، چھتری، ٹین کے صندوق، پنسل اور سگرٹ سازی کا کام شروع ہوگیا ہے - مرشد آباد میں خالص ریشم اور مالدہ میں تسر (روئی اور ریشم کو ملا کر) کپڑا تیار کرتے ہیں - چونکہ بنگالی تمدن کا انحصار یہاں کی معتدل آب و ہوا کی وجہ سے بہت سادہ ہے یعنی صرف ایک دھوتی اور ایک چادر کے سوا مرد و زن کو کسی لباس کی ضرورت نہیں ہوتی، اور کثرت باران کی وجہ سے ننگے پاؤں رہنے کا عام دستور ہے - کپڑوں کا سینا اور دیگر لوازم تمدن کی ابتدا مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ترقی پذیر ہوئی - اس لیے جتنی عمدہ صنعتیں یہاں ترقی کرسکیں وہ سب مسلمان امرا کے درباروں کی فن نوازی کا ثبوت دیتی ہیں - ریشمی کپڑوں کے نام ظاہر کرتے ہیں کہ تمدن اسلامی کا اثر کس طرح مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا تھا - یہاں چلدری کا نام "بابل چشم" ہے - جس کپڑے میں چاند تارا بناتے ہیں اُسے "چاند تارا" کہتے ہیں - "آب رواں" باریک کپڑا ہوتا ہے - مرشد آباد میں ہاتھی کا دانت کا بے مثل کام ہوتا ہے - کٹک، ڈھاکہ اور مرشد آباد میں سونار اور سادہ کار اس کثرت سے پائے کے ہیں کہ بہت کم ممالک ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں - ڈھاکہ کی کشیدہ کاری اور سوزن کاری کا مال اب تک ترکی جاتا ہے - اور جامدانی اور چکن دور دور مشہور ہے - پورنیہ اور مرشد آباد میں تھوڑا سا بدری کام بھی ہوتا ہے —

ضروری التماس | اس سلسلے میں ضروری عرض یہ ہے کہ ماہرین علم‌اللسنہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان اپنے فطری ماحول سے اثر پذیر ہوکر الفاظ بناتا ہے - جو نیا لفظ بنتا ہے وہ یا تو مقامی احوال کا مظہر ہوتا ہے یا کسی دوسری قوم کے تمدن کے اثر سے مستعار لیا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ مقامی زبان کا جز بن جاتا ہے - اس قسم کی ہزاروں مثالیں اُن اقوام میں پائی جاتی ہیں جن کا دوسری قوموں سے سیاسی ' تجارتی یا مذہبی تعلق ہوتا ہے - جن قوموں کا تمدن پست ہوتا ہے وہ مجبور ہوتی ہیں کہ خصوصیت سے اسما (Names) اور صفات (Adjectives) کی کمی کو دوسری زبانوں سے لے کر پورا کریں - اس نظریہ کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے حتی کہ رشتے ناتے اور موسم و وقت کے متعلق بھی سیکڑوں الفاظ اردو زبان کے بنگال میں رائج ہیں - اس طرح اردو نے ہندوستان کی مختلف قوموں میں جو اتحاد و اتفاق پھیلانے کی مضبوط بنیاد ڈالی وہ نہ تو کسی مذہب سے ہوسکی اور نہ کسی حکومت کے دباؤ سے - اس بنیادی اتحاد میں رخنہ ڈالنا یقیناً ہندوستان کی متحدہ قومیت کو تباہ کرنا ہے —

تاریخ | بنگال کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہاں کے اصلی باشندے دراوڑ تھے جو اب تک چھوٹا ناگپور ' اوڑیسہ اور سنتھال پرگنوں میں پائے جاتے ہیں - ان کا تعلق زبان اور شکل و صورت کے اعتبار سے ملکا ' پیگو ' انڈو چائنا اور جزائر شرق الہند سے لے کر آسٹریلیا کے باشندوں تک قائم کیا جاسکتا ہے - کہا جاتا ہے کہ پہلے ان کا عظیم الشان تمدن تھا - آریوں نے اسے مٹادیا - اور اب نہ ان کے پاس زمینیں ہیں

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

نے مستقل جائے قیام - زیادہ تر مزدوری پر بسر اوقات ہوتی ہے - سنتھالوں کی ایک خصوصیت یہ باقی ہے کہ ان میں چوری، بھیک اور بدکاری کا وجود نہیں - یہ لوگ عام بنگالیوں سے بہت زیادہ محنتی اور جفاکش ہیں اور سنتھالی بولی بولتے ہیں جس کی ڈکشنری بھی مشنریوں کی بدولت بن گئی ہے اور باوجودیکہ ان میں سے اکثر عیسائی بنالیے جاتے ہیں لیکن وہ اپنے قدیم تمدن و طرز زندگی کو نہیں چھوڑتے- آسام کی طرف 'کھاسی' بولی رائج ہے - یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے مغربی چین سے آسام' اور وہاں سے بنگال آئے ہوں گے —

آریوں نے گنگا کی وادی میں فتوحات شروع کیں - اور جنوبی بہار تک چلے آئے - مسیح سے چھ سو سال پہلے مگدھ (جنوبی بہار) کا راج قائم ہوگیا تھا - یہ ملک موریہ سلطنت کا مرکز تھا - اس کا مرکز پٹنہ کے قریب شہر راجگیر میں تھا - اسی کے قریب سیسنگا راجاؤں کا راج تھا' جس کا دارالسلطنت 'ویسالی' تھا - یہ مقام ضلع مظفر پور (بہار) کا موجودہ گاؤں بیسار ہے - اسی راج کے زمانے میں جین مذہب کے بانی مہاویر پیدا ہوے تھے' جنھوں نے پٹنہ کے قریب وفات پائی - یہ ویسالی کے راجاؤں کے خاندان سے تھے - گوتم بدھ' بھی اگرچہ مگدھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن بہار ہی میں بودھ گیا کے ایک پیپل کے درخت کے نیچے اُنھیں فراغت کاملہ (نروان) کا روشن خواب دکھائی دیا تھا - اشوک (۲۷۲ سے ۲۳۱ قبل مسیح) کے زمانے میں بدھ مذہب کافی عروج پر تھا - اس لیے سلطنت مذہب کے ساتھ تھی اور خود اشوک نے ڈیڑھ لاکھ باشندگان کالنگا و اوڑیسہ کو غلام بنانے اور ایک لاکھ سے زیادہ کو قتل

کرنے کے بعد خون ریزی سے توبہ کرلی تھی اور بدھ مذھب کا پیرو بن گیا تھا - اب باورچی خانے کے صرف کے لیے ھزاروں جانوروں اور چڑیوں کے بجائے صرف چند جانور کاٹے جاتے تھے —

ٹھیک اُس وقت جب کہ عرب سے آفتاب حریت و مساوات طلوع ھو رھا تھا ' بنگال بہار اور اوڑیسہ میں بنگال کے شاشنک راجاؤں نے مذھب کے نام پر قتل عام جاری کر رکھا تھا - پتالی پتر (پٹنہ) نذر آتش ھوچکا تھا - مقدس پیپل برباد ' اور بدھ مندر (وھار) زیر زمین کیے جا رھے تھے - لیکن راجہ ھرش نے ان مظالم کو روک دیا اور بہت جلد خانقاہ ' نالندہ ' (متصل پٹنہ) میں دس ھزار سے زیادہ بھکو اور طالبان علم جمع ھوگئے - یہ ھندوستان کی عظیم الشان یونیورسٹی صرف بدھ مذھب والوں کی مرھون منت ھے - ' ھرش ' کے بعد طوائف الملوکی رھی - نویں صدی مسیحی میں شمالی بنگال اور بہار پر ' پال ' خاندان کے راجاؤں نے راج شروع کیا - بارھویں صدی میں ' سین ' راجاؤں نے پورے بنگال پر قبضہ جمالیا اور پال خاندان کو نکال باھر کیا - یہ خاندان متعصب قسم کے ھندوؤں کا خاندان تھا جنھوں نے زبان سنسکرت کی کافی سرپرستی اور اشاعت کی —

جہاں تک بنگالی زبان کا تعلق ھے اس زمانے میں کوئی کام نہیں ھوا - سنسکرت کے مقابلہ میں اسے علمی زبان بننے کا کوئی موقعہ نہ تھا - یہ فخر مسلمانوں کو ھے کہ اُنھوں نے بنگالی بولی کو زبان بنایا - اور اب تو وہ ھندوستان کی بہترین زبانوں میں شمار کی جاتی ھے - مسلمانوں کے ابتدائی دور کی ایک کتاب " شنیسہ پران " ھے - اس میں پران کے خداؤں یعنی شیو ' وشنو اور برھما وغیرہ کا حال نئے انداز میں بیان

کیا ہے جس میں ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں جن سے بدھ کے نروان کی جھلک آتی ہے - اس میں خلق عالم سے لے کر دھرم پوجا کے طریقوں تک کا حال ہے - اس میں نثر بھی ہے - اور آخری باب ' جو بہت بعد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے ' " نرنجن کے غضب " کے عنوان سے شروع ہوتا ہے - اس کے ایک جزو کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے : -

" جاج پور اور مالدہ میں سولہ سو مضبوط برھمنوں کا اجتماع ہوا - یہ ویدک دھرم کے ماننے والے تھے - ان کا دس دس بارہ بارہ آدمیوں کا جتھا اُن ست دھرمیوں (بدھ مذھب والوں) کو قتل کرنے لگا جو اپنے مذھب پر لعنت اور گالیاں دینے سے انکار کرتے تھے - جب وہ ویدوں کے منتر پڑھتے تھے تو اُن کے منہ سے شعلے نکلتے تھے - ست دھرمی اُنہیں دیکھ دیکھ کر لرزتے تھے اور ' دھرم ' سے دعائیں کرتے تھے کہ وہ انہیں بچائے - دھرم کے سوا اُنہیں کون بچانے والا تھا ؟ (اس لیے کہ بدھ مذھب میں خدا کے متعلق خاموشی ہے - وہ صرف تین لفظ جانتے ہیں . بدھ ' دھرم ' سنگھ) اس طرح برھمنوں نے اس زمین پر ظلم کیا اور مخلوقات کو تباہ کیا - دھرم ' جو بیکنٹھ (بہشت) میں تھا ' یہ دیکھ کر رنجیدہ ہوگیا وہ دنیا میں مسلمان بن کر چلا آیا - اس کے سر پر سیاہ ٹوپی تھی اور ہاتھ میں ایک کمان وہ گھوڑے پر سوار تھا - اس کا نام خدا تھا - نرنجن نے بہشت میں اپنا یہ اوتار لیا - سب دیوتاؤں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ پاجامے پہنیں گے - برھما نے محمد کا اوتار لیا - وشنو یکام بر (پیغام بر یعنی جبریل ؟) بنا اور شیو آدمفا (آدم) - گنیش غازی کے روپ میں نمودار ہوا - کارتک قاضی بنا - نارد نے شیخ اور اِندر نے مولانا بننا پسند کیا - بہشت کے رشی فقیر بن گئے - سورج ' چاند اور دوسرے دیوتا سپاہی بن گئے

اور ڈھول بجانے لگے - دیوی چنڈی نے حیا بی بی اور پدماوتی نے بی بی نور کی صورت میں ظہور کیا - اب یہ سب دیوتا متفقہ طور پر جاج پور کی طرف روانہ ہوئے - اس میں داخل ہوکر انہوں نے مندروں اور مٹھوں کو توڑ ڈالا - ہر طرف شور تھا: "پکڑو! پکڑو!"

"رامائی پنڈت" اپنا سر 'دھرم' کے قدموں پر رکھ کر عرض کرتا ہے کہ آپ نے کتنا اچھا ہنگامہ بپا کیا ہے!"

(دیکھیے: History of Bengali Language & Literature
By D. N. Sen B. A., Calcutta University 1911. pp. 36 and 37.)

معلوم نہیں یہ کس لڑائی کی طرف اشارہ ہے - لیکن اتنا ضرور ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو دیوتا مانا جاتا تھا اور اب بھی مقابلتہً زیادہ جری اور جفاکش ہیں - یہ بھی نہیں معلوم کہ شاعر نے اِندر کو مولانا کیوں بنایا - حالانکہ اِندر کے متعلق حضرت جانعالم واجد علی شاہ مرحوم نے ایک حد تک صحیح نظریہ قایم کیا تھا کہ وہ ناظم بہشت و نغمہ و سرور ہے - ممکن ہے کہ مولاناؤں کی مجالس میں حال و قال، چنگ و رباب کی موجودگی سے شاعر کو یہ سوجھی ہو کہ یہ مسلمانوں کے اِندر ہیں - بیچارے غازیوں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ صرف قول و قوال تک محدود رہیں اور عمل جہاد اور نغمۂ شمشیر کو چھوڑ سکیں —

غرضکہ مسلمانوں کی بنگال میں اس طرح آمد آمد ہوتی ہے کہ "اندر سبھا" (امانت) میں گویا اِندر تشریف لارہے ہیں - اس سے پہلے کا زمانہ ہماری نظروں سے اس تیزی سے گزر جاتا ہے کہ سوائے مہابیر، بدھ، فاہیان، اشوک، ہیون سانگ کے قصوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خواب تھا جس کی تعبیر کہیں کسی لاٹھہ سے ہوتی ہے کہیں کتبہ سے ' کہیں کوئی مدفون مندر نکل آتا ہے یا کسی شاعر کا ہوج پتر پر لکھا ہوا کلام —

بنگال کا تاریخی زمانہ جنرل بختیار خلجی کے نام سے شروع ہوتا ہے جس کے سامنے بلا مبالغہ موجودہ زمانے میں کوئی سپہ سالار نظر نہیں آتا - اس نے ڈیڑھ درجن سواروں کے ساتھہ ' اپنی پوری فوج کو بہت پیچھے چھوڑ کر لکھنوتی پر (جو بعد میں گور کہلایا) حملہ کر دیا - اور سین راجہ کو جس کی راجدھانی بنارس سے سمندر تک تھی ' شہر سے فرار ہونے پر مجبور کیا - بختیار خلجی نے اُس کی جائے پناہ بکرم پور بھی لے لی اور غریب راجہ نے مع اپنے خاندان کے چتا پر جل مرنا پسند کیا - آخر کار فاتح نے ڈھاکہ کے قریب سنار گاؤں میں دم لیا ' جسے اپنا دارالسلطنت بنا کے اس نے غلام بادشاہ قطب الدین ایبک سے آزاد ہوکر بنگال میں پہلی مسلمانوں کی سلطنت قائم کی - یہ واقعہ رائے پتھورا کی شکست اور شہاب الدین غوری کے دہلی فتح کرنے کے چھہ سال بعد یعنی سنہ ۱۱۹۸ ع کا ہے - اب مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں شروع ہوگئیں اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان حمایت دین کے لیے ہمیشہ جنگ کیا کرتے ہیں اب ان کی حالت ملاحظہ فرمائیں -

باوجودیکہ بنگال کی آب و ہوا ایسی نہ تھی کہ کوئی یہاں رہنا پسند کرتا ' لیکن دولت و جاہ کی طمع نے سنہ ۱۲۲۵ ع میں التمش کو مجبور کیا کہ خود بدولت بنگال کے صوبہ دار کی گوشمالی کریں - لیکن اس کے مرنے کے بعد پھر بنگال میں خود سری کا دور دورہ شروع ہوگیا - جب بلبن فرمانروا ہوا تو اس نے طغرل خاں والیء بنگالہ کو خود جاکر

شکست دی - اور نہ صرف طغرل کو قتل کیا بلکہ گور کے باغیوں کے لیے دو میل تک پھانسیوں کی قطاریں کھڑی کرکے وہ سبق پڑھایا جس کا آموختہ دُھرانے کی نوبت اس عالم فانی میں پھر نہیں آئی - سنہ ۱۳۳۳ ع میں بہادر شاہ نے خود مختاری کا اعلان کیا اور شاہان تغلق کو اس کی سرکوبی کرنی پڑی - لیکن پھر پانچ سال بعد فخرالدین مبارک شاہ نے بنگال کو مرکزی حکومت سے آزاد کرھی لیا —

اس دور حریت و آزادی میں چار خاندانوں کے ۲۷ بادشاہوں نے بنگال پر دو سو سال تک حکومت کی - آخری خاندان حسین شاہی کا بانی ایک شخص علاءالدین عربی نسل سے تھا جسے شیر شاہ نے ختم کردیا اور وہ خود سنہ ۱۵۴۰ ع میں دھلی کا بادشاہ بن بیٹھا —

پٹھانوں کو زمانے نے زیادہ مہلت نہ دی - اور اگرچہ انھوں نے اوڑیسہ کو بھی سنہ ۱۵۶۸ ع میں اپنے زیر نگیں کرلیا تھا لیکن آخر کار سنہ ۱۵۷۲ ع میں اکبر کی فوجوں نے داؤد خاں تاجدار بنگال کو راج محال میں شکست دے کر بنگال کو فتح کرلیا - اب اُس زمانہ کی چند شکستہ عمارتیں اور شہسرام میں شیر شاہ (المتوفی سنہ ۱۵۴۵ ع) کا مقبرہ باقی رہ گیا ہے —

مغلوں کے ابتدائی سو سال کے زمانے میں بنگال میں بائیس صوبہ داروں نے حکومت کی - سولھویں صدی کے آخیر میں ٹانڈہ سے راجمحال میں دارالحکومت تبدیل ہوا - شائستہ خاں نے سنہ ۱۶۶۶ ع میں اُن پرتگیزوں کا صفایا کردیا جو لوٹ مار کرنے اور غلاموں کی تجارت کے سلسلے میں بحری ڈاکو بن گئے تھے اور ساحل ھی نہیں بلکہ ڈھاکہ تک تباھی پھیلا چکے تھے - چاٹگاؤں ان کا بحری مستقر سا ہوگیا

تھا - اس زمانے میں راستوں میں کافی امن و امان ہوگیا تھا - صنعت و حرفت و تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی - حتیٰ کہ برنیر کہتا ہے کہ :—

"بنگال نہ صرف ہندوستان یا مغلیہ سلطنت کا خزانۂ مال و دولت ہے، بلکہ ملحقہ ممالک اور یورپ کے لیے بھی یہیں سے مال مہیا ہوتا ہے - مجھے حیرت ہے کہ صرف ولندیزی تاجر اتنا سوتی سامان جاوا اور یورپ کو روانہ کرتے ہیں کہ اندازہ کرنا مشکل ہے - انگریز، پرتگیز اور ہندوستانی سوداگروں کا تو کہنا ہی کیا ہے - یہی حال ریشمی کپڑوں کا ہے - پٹنہ کی طرف سے شورہ کشتیوں میں آتا تھا، جسے بارود بنانے کے لیے ولندیز اور انگریز یورپ لے جاتے تھے - چاول مدراس، لنکا، اور جزائر مالدیپ (دیپ = دویپ=دوآب = جزیرہ) کی طرف جاتا تھا - غرضکہ بنگال ایسا ملک تھا جو سب کا داتا تھا" -

سنہ ۱۷۰۴ ع میں جب مرشد قلی خاں نے مرشد آباد میں دارالحکومت منتقل کیا تو ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ دہلی بھیجنا شروع کیا - تجارت کی ترقی نے مغو کے اس قانون کو توڑ دیا جس کی وجہ سے بنگال کو چنڈالوں اور بھوتوں کا ملک کہا جاتا تھا - شیر شاہی سڑکوں پر سرائیں، مسجدیں، کنویں اور ہندو مسلمانوں کے لیے علحدہ علحدہ خدمت گزاروں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ لوگ سونا اچھالتے چلے جاتے تھے - دریاؤں سے بھی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی - اور آخر کار مصنف ریاض السلاطین کو لکھنا پڑا کہ اس دور حکومت سے پہلے "نہ صرف مغل امرا بنگال کی آب و ہوا کو مہلک سمجھتے تھے بلکہ واقعی اسے بھوتوں کا مسکن تصور کرتے تھے - لیکن اب یہ ایسا باغ ہے جس میں

کانٹا نہیں - اب ان کی دلی خواہش ہے کہ وہاں کوئی عہدہ ملے "۔
عالمگیر (ح) کے بعد یہاں کے نواب وزیر موروثی ہوگئے - سنہ ۱۷۴۰ ع
میں علی وردی خاں کا زمانہ تھا - یہی زمانہ ہے جب کہ مرہٹوں نے
سر اُٹھایا تھا - اور ہر طرف لوٹ مار شروع کردی تھی - حتیٰ کہ اُنھیں
اُوڑیسہ دے کر پیچھا چھڑایا گیا - یوروپین سلطنتوں کی تجارتی کوٹھیاں
سبھی قلعوں اور میگزینوں میں تبدیل ہونے لگی تھیں - حتیٰ کہ جب
نواب سراج الدولہ تخت وزارت پر متمکن ہوئے تو اُنھوں نے انگریزوں
کو مار بھگایا اور کلکتہ پر قبضہ کرلیا - لیکن مرشد آباد میں اُن کے
خلاف ایک سازش ہوئی جس میں کلایو بھی شریک تھا اور سنہ ۱۷۵۷ ع
میں سراج الدولہ کو شکست دے کر انگریز سوداگروں نے میر جعفر کو
نواب بنادیا - یہ انگریزوں کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھا - اور
جب فوجوں کے لیے روپیہ نہ فراہم کرسکا تو نالائق کرکے نکال دیا گیا -
اور میر قاسم نواب بنائے گئے - انھوں نے منگھیر کو دارالحکومت بنایا -
اور جب انھوں نے حسب معاہدۂ وینسٹارت (Vansittart) منعقدہ جنوری
سنہ ۱۷۶۳ ع اپنے وصولیٔ محاصل چنگی کے جائز حقوق استعمال کرنا شروع
کیے تو کونسل کے دیگر افراد نے گورنر کے معاہدہ کو منسوخ کرکے ایلس
(Ellis) کو نواب پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا - غرضکہ پھر میر جعفر
۲۳ جولائی سنہ ۱۷۶۳ کو مرشد آباد لایا گیا - اور میر قاسم شکست
خوردہ الہ آباد کی طرف چلے گئے - فروری سنہ ۱۷۶۵ میر جعفر مرگیا -
لیکن اسی زمانے میں شاہ عالم نے انگریزی کمپنی کو بنگال کے حقوق
دیوانی عطا کردیے اور میر جعفر کے بیٹے کی نوابی بھی انگریزوں نے
ختم کردی - غرضکہ جو فتح پلاسی میں (سنہ ۱۷۵۷ ع) میں ہوئی تھی

اس پر بکسر کی لڑائی (سنہ ۱۷۶۴ ع) نے مہر تصدیق ثبت کردی، اور شاہ عالم سے معاہدہ ہوکر بنگال کی قسمت کا کچھ دنوں کے لیے فیصلہ ہوگیا - دارالحکومت مرشدآباد سے کلکتہ میں سنہ ۱۷۷۲ ع میں بدل دیا گیا - اور سنہ ۱۷۹۰ ع میں حقوق دیوانی کے علاوہ فوجداری کو بھی لارڈ کارنوالس نے مغلیہ حکومت سے آزاد کرلیا - یعنی ایک طرح کی نام نہاد حکومت جو نواب کے ہاتھوں میں تھی وہ بھی ختم کردی گئی —

مذاہب

بنگال میں ہندو مسلمان اس طرح آباد ہیں کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اور مغربی بنگال میں ہندوؤں کی کثرت ہے - اور مجموعی طور پر مسلمان ہندوؤں سے چند فیصدی زیادہ ہیں - صرف مسلمان یہاں اتنے ہیں کہ جانگ بلقان سے پہلے کی ترکی، ایران اور افغانستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہیں - لیکن ان کی عام تعلیمی حالت اور تمدنی زندگی زوال سلطنت کے بعد بہت پست ہوگئی ہے - انگریزوں نے جب یہاں نیا نیا انتظام کیا تو یہاں کے مسلمان زمینداروں کے جو ہندو "کارندے" اور "سرکار" تھے وہ سب زمیندار بن بیٹھے - یعنی مالگزاری کی ادائگی ان کے ذمہ قرار پائی - اس طرح یہاں تقریباً سب زمیندار ہندو ہیں اور مسلمان کاشتکار یا مزدوری پیشہ ہیں - جوت کی پیداوار جن علاقوں میں ہوتی ہے وہ تقریباً مسلمان کاشتکاروں کی محنت کا نتیجہ ہے، جوت (جس سے بورے وغیرہ بنتے ہیں) کا کاروبار سب انگریز اور اسکاچ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے - یہ چیز بنگال کے علاوہ دنیا میں کہیں پیدا نہیں ہوتی اس لیے اگر معقول قیمت پر فروخت ہو تو کسانوں کو بہت نفع ہوسکتا ہے - لیکن سرمایہ دار کمپنیاں بھی اب ایک طرف تو کسانوں اور مزدوروں کے اتحاد سے پریشان ہورہی ہیں -

اور دوسری طرف امریکہ اور دوسرے ممالک کی نئی ترکیبوں سے ان کی تجارت پر اثر پڑ رہا ہے - کہتے ہیں کہ وہاں کاغذ کے مضبوط بورے تیار ہونے لگے ہیں - روئی اب یہاں بہت کم پیدا ہوتی ہے' البتہ ریشم کی پیدا وار بڑھ رہی ہے —

مذہب ہنود رسم و رواج کے مجموعوں کا نام ہے' ان میں سیکڑوں فرقے ہیں جو اپنے کو ہندو کہتے ہیں - عجائب پرستی اور فطرت پرستی عام ہے - اسی کے ساتھ ساتھ ویدانتی اور فلسفی بھی ہیں جو ہمہ اوست وہمہ از وست کی بحثیں کرتے ہیں - عام طور پر مندر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ ہر ایک شخص بیک وقت پوجا کر سکے - جماعتی پرستش صرف مسلمانوں کی امتیازی چیز ہے - شیو کی پرستش کرنے والے بھی ہیں اور وشنو کی پوجا کرنے والے بھی - پہلا گوشت خور ہے دوسرا نہیں - شکتی یا شیو کی بیویوں کی قوت تانیث کی بھی پرستش ہوتی ہے - یہ درگا' کالی اور پاربتی ہیں - انہیں خوش کرنے کے لیے بکروں کے تازہ خون کی بھینٹ چڑھانا ضروری ہے - پہلے آدمیوں کی بھی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی - اس کی ایک شاخ اس حد سے گزر کر تانترک دھرم کے مطابق برہنہ عورت کی پرستش بھی کرتی ہے - گرو (مرشد) کی پوجا بھی ہوتی ہے جسے خدا سے بلند رتبہ دیا جاتا ہے —

راجہ رام موہن رائے سنہ ۱۷۷۴ع - سنہ ۱۸۳۳ ع) نے اسلام سے اثر پذیر ہو کر نہ صرف لباس و خوراک میں مغلوں کے اثر کو قبول کر لیا تھا' بلکہ مغلیہ تاجدار کی طرف سے ولایت سے واپسی کے بعد بھی انگریزی مذہب سے مرعوب نہیں ہوئے - انہوں نے توحید باری تعالیٰ کی تعلیم کے لیے ایک معقول مذہب (برہمو سماج) رائج کیا تھا - بیواؤں کی شادی کے حامی

تھے - اور چھوت اور کو دور کرنا چاہتے تھے - کیشب چندر سین (سنہ ۱۸۳۸ ع - ۱۸۸۴ ع) نے اور دوسرے پڑھے لکھے ہندوؤں نے اس کی ترویج کی - لیکن اب ان کی مجموعی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے - ان میں دو مسلمان بھی داخل ہیں - اور سب بت پرستی کے خلاف ہیں —

ہندو تصوف یعنی ویدانت کو رام کرشن پرم ہنس (سنہ ۱۸۳۴ ع - ۱۸۸۶ ع) کے مشن نے ترقی دی - یہ کلکتہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھے - ان کے شاگرد رشید سوامی وویکانند اور سسٹر نویدیتا (Sister Nivedita) نے یورپ اور امریکہ میں اس کو کافی شہرت دی - یہ مشن اب دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا ہے - ایک روحانیت کی طرف زیادہ مائل ہے اور گوشت نہیں کھاتا - اور دوسرا خدمت خلق و خدمت مریضاں کی طرف رجوع ہے اور گوشت کھانے پر معترض نہیں - مؤخرالذکر جماعت کو نومبر سنہ ۳۷ ع میں ایک امریکن عورت نے سات لاکھ روپے مندر بنانے کے لیے دیے ہیں جس میں رام کرشن پرم ہنس کا مجسمہ بھی ہوگا - "پرستش کے لیے نہیں" بلکہ یادگار کے طور پر - جس طرح لینن کی قبر روس میں ہے اور باوجود لادینیت کے جوشیلے روسی اس کو دیوتا سمجھنے لگے ہیں - لیکن اسے ان کی عقل کا قصور کہا جاتا ہے - آریہ سماج کا اثر بنگال میں نہیں ہے - اور دیانند سرسوتی (سنہ ۱۸۲۷ ع - سنہ ۱۸۸۳ ع) کی تعلیم کا زور بہار تک آتے آتے ختم ہوگیا ہے —

باوجود ان فرقوں کے بھکتی کی تعلیم کے ماننے والے بہت زیادہ ہیں - یہ لوگ کالی یا شکتی کی پوجا نہیں کرتے اور ایک قسم کے موحد ہیں - جس طرح کبیر اور نانک نے شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کے اثر سے جات پات کو توڑ کر توحید باری تعالیٰ پر زور

دیا تھا - اسی طرح بھگتی کے حامی خدائے واحد کی محبت کو ذریعۂ نجات تصور کرتے ہیں - 'چیتن' دیو نے' جو کرشن کے اوتار مانے جاتے ہیں' جب بھگتی کی تعلیم دینی شروع کی تو وہ بنگال سے بندرابن گئے اور وہاں جاکر انہوں نے قدیم بزرگوں کے استھانوں (مقامات) کو کشف کے ذریعہ سے معلوم کیا - نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند اور خصوصاً بندرابن اور متھرا کی طرف کثرت سے بنگالیوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی - اور بنگالی زبان پر اردو کے نقش و نگار بننا شروع ہوگئے —

گذشتہ صدی میں جن مسلمانوں کے نام احیائے ملت اسلامیہ کے سلسلہ میں لیے جاتے ہیں ان میں حضرت سید احمد بریلوی اور مولوی کرامت علی جونپوری کا شمار صف اول کے لوگوں میں ہے - بنگال میں جو اثر ہے وہ انہی بزرگوں کا ہے - اور تقلید کی جکڑ بند سے نکالنے میں ان حضرات کی کوششوں نے بہت کچھ کار فرمائی کی ہے - یہی وجہ ہے بنگال کے عام مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ روشن خیال ہیں - یعنی نہ تو وہ اتنے عجائب پرست ہیں' نہ ہندوؤں کی سی رسموں میں بندھے ہوئے ہیں - ایسے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے جو مشرکانہ رسوم کے ترک کرنے کی وجہ سے وہابی کہلاتے ہیں - ان کی کئی قسمیں ہیں - بعض اہل حدیث کہلاتے ہیں اور بعض فرائضی - لیکن قدامت پرستی اور ہندوستانی بدعتوں کے ماننے والے پیر پرست' قبر پرست' اور سماع و مولود کے قائل بھی موجود ہیں - موجودہ زمانے میں تقلید و تجدید کے پیروؤں میں مختلف جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں - مثلاً مولانا سید ابوبکر صاحب موضع فرفرا' ڈاکخانہ دکھشن دیہی ضلع ہگلی کے باشندے ہیں' حنفی ہیں یعنی اہل حدیث کے

مخالف سمجھے جاتے ہیں۔ تصویر کے خلاف ہیں۔ مولوی کرامت علی جونپوری کے پوتے ابوالفرح زندہ ہیں، کلکتہ میں بھی رہتے ہیں اور رنگپور میں بھی۔ یہ محمدی کہلاتے ہیں، امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز سمجھتے ہیں اور پیری مریدی کرتے ہیں۔ ابا خالد رشیدالدین عرف بادشاہ میاں، فرید پور (مشرقی بنگال) کے با اثر شیخ ہیں۔ سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے تیس لاکھ مرید ہیں۔ اور خلافت کے سلسلے میں جیل بھی جا چکے ہیں، یہ فرائضی ہیں۔ فرائضی جماعت کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ وہ زمین کو خدا کی ملکیت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکومت کو یہ حق نہیں کہ اُس پر کسی قسم کا لگان یا ٹیکس عاید ہوسکے۔ اس لیے وہ لگان و مالگزاری وغیرہ ادا کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوا ہے کہ اب یہ "حیلۂ شرعی" اختیار کیا گیا ہے کہ مالک زمین خود مالگزاری ادا نہیں کرتا بلکہ اس کا کوئی رشتہ دار دے آتا ہے۔ یہ لوگ کاشتکاری کے ذریعہ معاش حاصل کرنا بہتر تصور کرتے ہیں اور نوکری کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ خواہ کسی کی بھی ہو۔ پیر پرستوں کی ایک جماعت وہ بھی ہے جو سجدۂ مرشد کو جائز سمجھتی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ 'باؤل' فقرا کی جماعت میں نظر آتا ہے۔ یہ زیادہ تر ضلع 'ندیا' میں رہتے ہیں اور دوسرے اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے بعض نماز بھی پڑھتے ہیں اور بعض بالکل آزاد ہندو فقیر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا سلسلہ پنجاب کے کسی شیخ کے خاندان سے ہے —

جس طرح ہندوستان (سرحد تا پٹنہ) میں ہندی اردو کا اختلاف پیدا ہورہا ہے، اسی طرح بنگال میں بھی ہندو بنگالی اور مسلمانی بنگالی

موجود ہیں - یعنی ایک میں سنسکرت کی زیادتی اور دوسری میں تمدن اسلامی کی جھلک پائی جاتی ہے - رابندرا ناتھ ٹیگور نے تیس سال کی محنت کے بعد بنگالی زبان کو سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ و محاورات سے آزاد کیا ہے اور عوام کی بول چال سے زیادہ قریب کردیا ہے - اسی طرح قاضی نذرالاسلام نے حافظ و سعدی کی زبان کو فارسی بحروں میں بنگالی زبان کے لیے رائج کرنا شروع کیا ہے - اور زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے —

بنگالی زبان پر مسلمانوں کا احسان

جس طرح بودھوں کی فراخ دلی اور عدم عصبیت نے عوام کی بولیوں کو زبانوں کی صف میں لانے کی کوشش کی تھی اور ہندوؤں کی تنگ نظری یا قدامت پرستی نے اُنہیں مجبور کیا کہ اس تحریک کو کچل دیں، اُسی طرح، بلکہ اُس سے زیادہ انہماک اور فراخ دلی سے مسلمانوں نے مقامی بولیوں کو ترقی دی - جہاں وہ گئے ملکی بولی کو سلطنت کے طول و عرض میں رائج کرنے لگے - اب تک گجراتی، اردھی، بہاری اور بنگالی کو ہندوؤں نے اس قابل بھی نہیں سمجھا تھا کہ وہ اس میں ویدوں کو نہ سہی تو کم از کم رامائن اور مہابھارت ہی کو ترجمہ کرکے عوام کے قریب لے آتے - حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہر ملک میں چند مذہبی اجارہ دار علم کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اسی طرح ہندوستان کی بھی حالت تھی - یورپ کی حالت تو صرف تھوڑے دن پہلے یہ تھی کہ تعلیم کلیسا کی ساتھ تھی میں تھی اور سائنس کی روشنی

کو' حتیٰ کہ ریاضی و نجوم کو بھی' عوام تک پہنچانے والوں کو نہ صرف قید کردیا جاتا تھا بلکہ اکثر و بیشتر ملک عدم کو پہنچا کر دم لیا جاتا تھا - یہ تھی مذہب کے نام پر "ملحدون" کی خونریزی - اس سفاکی کی مثالیں اتنی طویل ہیں کہ ایک مکمل کتاب نہیں بلکہ پوری تاریخ انسانی اسی مذہبی ہٹ دھرمی اور اجارہ داری کی خون آشامیوں کے واقعات سے تیار کی جاسکتی ہے - بہر حال ہندوستان میں یہی ہوا - اور اب مسلمانوں کی سلطنت کے جانے کے بعد پھر ان مذہبی مجنونوں کو سر اُٹھانے کا موقعہ ملا ہے - مگر ہیں یہ سب رنگے سیار' مصنوعی مجنون - ان کا مقصد صرف دوسری ترکیب سے اپنی اقتصادی قیادت کو قائم رکھنا ہے - اس سلسلے میں مذہب بھی استعمال ہوسکتا ہے اور سیاست بھی - منشا دونوں کا ایک ہے یعنی ایک مخصوص علمی جماعت کے لیے روٹی دال —

دنیش چندر سین نے مجبوراً دبی زبان سے مسلمانوں کی اس رواداری کو اس طرح بیان کیا ہے - "بنگالی کو ادبی معیار تک پہنچنے کے لیے بہت سی چیزوں سے مدد ملی - اس میں بلا شبہ اسلامی فتح کو سب سے بلند درجہ حاصل ہے - اگر ہندو راجا آزاد رہتے تو بنگالی کو راجاؤں کے درباروں تک پہنچنا بہت مشکل تھا - پٹھانوں نے تیرھویں صدی کی ابتدا میں بنگال پر قبضہ کرلیا تھا - وہ بہت دور سے یعنی بلخ' آکسس اور اُس بھی آگے کے ملکوں سے آئے تھے' لیکن اُنھوں نے بنگال کے میدانوں کو اپنا وطن بنالیا تھا اور اپنے پہاڑی وطنوں کو واپس جانے کا ارادہ ترک کردیا - پٹھان شہنشاہوں نے بنگالی سیکھی' اور ہندوؤں کی اس کثیر آبادی کے ساتھ رہنے لگے جن پر وہ حکومت کرتے

تھے - ان کی مسجدوں کے مینار و گنبد آسمان سے باتیں کرتے تھے ' اور ہندوؤں کے مندروں کے دوش بدوش قائم تھے - جب نووارد اپنی شام کی نماز کے لیے جمع ہوتے تھے تو مندروں سے سنکھہ اور گھنٹے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں - ہندوؤں کے شاندار جلوس اور مذہبی رسمیں — درگا پوجا - راسا اور ڈول اُتسو — اتنا ہی جوش و خروش کا اظہار کرتی تھیں جو مسلمانوں کے محرم ' عید ' شب برات اور دوسرے تہواروں سے ظاہر ہوتا تھا - ان شہنشاہوں نے سنسکرت کی رزمیہ کتابوں کی شہرت سنی - اور وہ فطرتاً مہابھارت اور رامائن کو جاننے کے خواہش مند اس لیے ہوے کہ ان کا ہندوؤں کی خانگی اور مذہبی زندگی پر گہرا اثر ہے - پٹھان شہنشاہوں اور سرداروں کو ہندو راجاؤں کا سا صبر نہیں تھا کہ مذہبی جوش کی وجہ سے برہمن عالموں کی سنسکرت کو سنتے ' اُن کی علمی تفسیریں سمجھتے اور برسوں میں رامائن اور مہابھارت کا دورہ ختم کرتے - پٹھانوں نے ایسے عالموں کو مقرر کیا جو سنسکرت سے ان کتابوں کا ترجمہ اس بنگالی میں کریں جنہیں وہ بولتے تھے اور سمجھتے تھے - مہابھارت کا پہلا بنگالی ترجمہ نصیرا شاہا (نصیر شاہ) شہنشاہ گزر کے حکم سے سنہ ۱۳۲۵ ع میں ہوا - دوسرا ترجمہ پراگل خاں صوبہ دار چاٹگاؤں کے حکم سے ' کوندر پرمیشور ' نے کیا - نصیر شاہ بنگالی زبان کا اتنا حامی تھا کہ شاعر ودیا پتی نے اپنا ایک قصیدہ اُس کے نام سے معنون کیا ہے - اور سلطان غیاث الدین کا بھی نہایت احترام سے نام لیتا ہے " (Bengali Language and Literature pp I0 - 11) —

یہ سلسلہ اتنا طویل ہے کہ ایک علحدہ کتاب کی ضرورت ہے - مختصر یہ کہ حسین شاہ نے مالا دھر باسو اور اپنے ایک مصاحب کے

ذریعہ سے سنہ ۱۴۸۰ ع میں بھاگوت کا بنگالی میں ترجمہ کرایا اور اسے گن راج خان کا خطاب عطا کیا - اب تک انہی خطابات کے مطابق بہت سے بنگالی معظم دار' سرکار' ملک وغیرہ کہلاتے ہیں - پراگل خاں اسی بادشاہ حسین شاہ کا جنرل تھا - چھوٹے خاں ولد پراگل خاں نے بھی سنت پدری پر عمل جاری رکھا اور جب وہ چاٹگام کا صوبہ مقرر ہوا - تو 'نندی' سے بھارت کے ایک باب کا ترجمہ کرایا جسے عرصہ ہوا ساہتیہ پریشد کلکتہ شائع کر چکی ہے - سترھویں صدی میں شاعر علاؤل (علاء الدین) نے ملک محمد جائسی کی پدماوت کا نہایت ہی سنسکرت آمیز بنگالی میں ترجمہ کیا - یہ ترجمہ مانگن ٹھاکر کے حکم سے ہوا جو مسلمان تھا اور اراکان کے رئیس کا وزیر تھا - علاؤل نے امیر سلیمان کے حکم سے ایک فارسی کتاب بھی بنگالی میں ترجمہ کی تھی - حکام کی قدر دانی ہمیشہ برہمنوں اور پنڈتوں کو اپنے خیالات بدلنے پر مائل کرتی رہی ہے - آخر کار یہی ہوا کہ وہ بھی بنگالی میں لکھنے لگے اور راجاؤں نے بھی مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اس زبان کی سرپرستی شروع کردی - کمپنی کی حکومت کے زمانے میں ان - پی - ہال ہڈ (Nathaniel P'rassy Halhead) نے سب سے پہلے بنگالی گرامر اٹھارھویں صدی میں لکھی اور یوروپین مشنریوں نے بنگالی نثر کو کافی ترقی دی —

یہ ہے مختصر سی تاریخ اس علمی کوشش کی جو مسلمان بادشاہوں اور نوابوں نے شروع کی اور بنگالی بولی کو زبان بنادیا - بعض موجودہ زمانے کے فرقہ پرور اپنی اپنی تنگ نظری کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو دھرم اور سنسکرت زبان کو زندہ کرنے کے لیے ہندو مسلم سوال پیدا کرنا اور مذہبی طبیعت کو ترقی دینا مفید ہوگا - لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ہمیشہ یہ آلہ

کارگر نہیں ہوسکتا - اگر کوئی یہ کہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے ' مسلمان بادشاہوں نے اُسے ترقی دی ' اگر مسلمان چاہیں تو اُسے زندہ رکھیں ' عام ہندوستانیوں کو اس زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ سخت غلطی کرتا ہے - جس طرح اردو عام ہندوستانیوں کی زبان ہے اور یقیناً مسلمان امرا و سلاطین و شعرا و ادبا نے ایک عام ملکی زبان بنانے میں ضرورت سے زیادہ حصہ لیا ہے ' بالکل اسی طرح اُنہوں نے بنگالی بولی کو زبان بنایا اور برہمنوں کے اقتدار سے علوم و فنون کے خزانوں کو چھین کر عامتہ الناس کو مستفیض ہونے کا موقعہ دیا - یہ کام اُنہوں نے اُس وقت کیا تھا جب عام طور پر برہمنوں نے اُنہیں بھی ملیچھہ اور اچھوت سمجھہ رکھا تھا —

شاید دنیا میں اس عدیم المثال رواداری اور عدم تعصبی کا ثبوت ملنا مشکل ہے جو نووارد ' پر جوش اور تازہ ولایت مسلمانوں نے ہندوستان کے مذہبوں ' زبانوں اور رسوم و رواج کے ساتھہ کیا - آج جو کچھہ ادبی جواہر ریزے ہیں ' خواہ وہ ہندی میں ہوں یا گجراتی میں ' بنگالی میں ہوں یا پنجابی میں ' سب مسلمانوں کی بے نظیر کوششوں کی داد دے رہے ہیں - سمجھہ دار ہندوستانی ' خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں ' ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ ہندوستانی زبانوں میں پھر ملکی الفاظ و محاورات کا جو سرمایہ آگیا ہے اسے صرف تعصب کے بدلے میں فروخت کردالیں - یہ صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ ' اور لاکھوں محبت بھرے دلوں کی یادگاریں ہیں جو مختلف ہندوستانی زبانوں میں نظر آرہی ہیں اور زبان حال سے کہہ رہی ہیں —

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بنگالی زبان میں اردو الفاظ

ذیل کے صفحات میں بنگالی زبان کی صرف و نحو سے بحث نہیں کی گئی اس لیے افعال و حروف کی فہرست نہیں دی گئی - گویا کہ یہ فہرست صرف اسما تک محدود ہے - لیکن باوجود اس حد بندی کے جو الفاظ درج کیے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ روز مرہ کی زندگی میں کس کثرت سے اردو اسما کا بنگالی زبان میں استعمال ہوتا ہے - اگر کوئی غیر بنگالی تھوڑی سی نحوی ترکیبوں سے واقف ہوجائے اور الفاظ کی بنگالی طرز ادا یا لہجے کو سمجھ لے تو اسے اردو اور بنگالی میں بہت کم فرق نظر آئے گا - میرا اندازہ ہے کہ بنگالی زبان میں پچاس فی صدی سے زیادہ ایسے اردو الفاظ ہیں جو لہجے کی تبدیلی کی وجہ سے بنگالی معلوم ہوتے ہیں ' لیکن حقیقتاً وہ خالص اردو الفاظ ہیں - اس کے علاوہ بیس فی صدی ایسے فارسی الفاظ ہیں جو بنگال میں رہتے رہتے بنگالی ہوگئے ہیں - باقی تیس فی صدی الفاظ میں زیادہ حصے میں سنسکرت اور کم حصے میں دراوڑ ' ملاؤ ' تبتی ' آسامی ' برمی اور دوسری مقامی بولیوں کے الفاظ مل جل گئے ہیں —

مختلف عنوانوں کے ماتحت جو مختصر فہرست درج ذیل ہے وہ پوری بنگالی لغات پر حاوی نہ ہونے کے باوجود ہمارے اس دعوے کو کو پورے طور پر ثابت کرتی ہے کہ بنگالی زبان اردو زبان سے بہت ہی قریب کا رشتہ رکھتی ہے : —

دنیا اور فطرت

بنگالی	اردو
اکاش	آکاش - آسمان
اماوشے	اماوس - شب هلال
اوگنی	اگنی - آگ
اندهر	اندهیرا
اتر	اتر
برشٹی	بارش
پرتھوی	پرتھوی - زمین
پورب	پورب
پھین	پھین - کف
پالا - برپھ	پالا - برف
بجلی	بجلی - برق
پورنما	پورنماشی - شب بدر
پوش چم	پچھم
تاپ	تپ - گرمی
تارا	تارا
ٹھنڈا	ٹھنڈک
جل - پانی	جل - پانی
جوگت	جگت - دنیا
چاند	چاند

بنگالی	اردو
دکھن	دکھن - جنوب
رام دھونک	رام دھنک - قوس و قزح
شجو - شرجو	سورج
میگھہ	میگھہ - بادل
ھوا	ھوا

خشکی (جل) اور تری (ستھل)

اترائی	اترائی (پہاڑ سے)
اِندارا	اندارا (بڑا کنوان)
بلی	بالو - ریت
بھانٹا	بھاٹا (جذر)
پہاڑ	پہاڑ
پاتھور	پتھر (چٹان)
پرونالی	پرنالی
پربوت	پربت
تیر - کنارا	تیر - کنارہ
جھورنا	جھرنا - آبشار
چھوٹو ندی	ندی
چڑھائی	چڑھائی (پہاڑ پر)
دیپ	دیپ - جزیرہ
دگھی	ڈگی - تالاب

بنگالی	اردو
شومدرو - شاگر	سمندر - ساگر
کوا	کنواں
طفردی	دریا (ندی)

معدنیات = دھاتو

اشپات	اسپات - فولاد
برونز دھاتو	برنج
پی تول	پیتل
پارا	پارا
تانبا - تاما	تانبا
تین	ٹین
چون	چونا
دھاتو	دھات
دوستہ	جستہ
روپا	روپا چاندی
سیمنٹ	سیمنٹ
شیشہ	سیسا
شونو	سونا
کاٹھہ	کاٹھہ
کوئلہ	کوئلہ
کانکور	کنکر
کھوزی	کھریا مٹی

بنگالی	اردو
کانچ	کانچ
مور مور	مرمر (سنگ مرمر)
موتی	موتی
متی	متی
نیلا	نیلم
هیرا	هیرا

چرند و پرند وغیرہ

اود بڑال	عود بلاؤ
اُٹ	اونٹ
باچھر	بچھیرا
بڑال - بیڑال	بلا - بلی
باج پکھی	باز
بھیڑار باچا	بھیڑ کا بچہ - مہملا
باندور	بندر
بلبل	بلبل
بوتھر	بتھر
باگھہ	باگھہ
باگھنی	باگھنی
لھشو جھور	پشو - جانور
پاکھی	پنکھی - چڑیا

بنگالی	اردو
پانٹھا	بکرا
پیرو	پیرو (ترکی مرغی)
بھیا بھیا کورا	بھین بھین کرنا
تی تر	تیتر
تتو	تتو
جنور	جانور
چیتا	چیتا
چوڑئی	چڑیا
دول	دل (گلہ)
راج ہنس	راج ہنس
رواں - پشم	بروان (بال)
شاپ	سانپ
شانڑ	سانڈ
شاروش	سارس
شیال	سیار - شغال
شنگھہ	سنگھہ (شیر)
ککر	کوکر - کتا
کھو چر	خچر
کٹھہ ٹھوکرا	ہد ہد
کٹھہ بڑالی	کٹھہ بلی (گلہری)
کھور	کھر

بنگالی	اردو
گورو گائے	گائے
گورو یا چھر	بیل
گادھا	گدھا
گھگھو	فاختہ
گھوڑا	گھوڑا
مہش - مہیش	بھینس
مرگ	مرغ
مرگی	مرغی
مو موکورا	مہوں مہوں کرنا
میوور	مور
مکوز شا	مکڑی
ہورن	ہرن
ہورنی	ہرنی
ہانس	ہنس (بطخ)
ہاتی	ہاتھی

نباتات

آم - آنب	
ابلس	آبنوس
ادا	ادرک

بنگالی	اردو
انگور	=
اکھروٹ	اخروٹ
بدام	بادام
بیل	=
بالنس	بانس
بے گُن	بینگن
باندھا کوپی	بند گوبھی
پان	=
پھول	=
پھولیر توڑا	ہار
پھول گوبی	پھول گوبھی
پھل	=
پاتا	پتہ
پھٹی	پھوٹ
پدینہ	پودینہ
پیانج	پھاز
تماکو	تمباکو
تورمُج	تربوز
ٹماٹو	ٹماٹر
جوب	جو
جھاؤ	... = ...

بنگالی	اردو
جوئین	جوھی (چمیلی)
چھال	
چینا بدام	مونگ پھلی
دار وچینی	دارچینی
ڈال - شاکھا	ڈالی - شاخ
روشن	لہسن
سیو پھل	سیب
سپاری	
شیم	سیم
شونٹھ	سونٹھ
شون	سن
شے گُن	ساگون
شال گوم	شلغم
شاکھ	شاخ
شوب جی	سبزی
کپاش	کپاس
کھے جر	کھجور
کان ٹھل	کٹھل
گاجور	گاجر
گھاش	گھاس
گوم	گلدم

بنگالی	اردو
لبو - نبو	لیمون - نیبو
سالا	مالا - ہار
نرکل	ناریل

رنگ

اشمانی نیل	آسمانی
بدامی	بادامی
بیگنی	بینجنی
پھیکے - ہلکا	ہلکا رنگ
پھیکے لال - گلابی	گلابی
دھانی	...=
شوبج	سبز
فیروجہ	فیروزئی
کالو	کالا
لال	...=
نیل	نیلا
نارنگی رنگ	نارنجی
گاڑھو - گہلو	گہرا - گاڑھا رنگ
گاڑھو نیل	بلنشی
شادہ	سفید
ہلدے	زرد

بنگالی	اردو
وقت اور موسم	
آج	
آج کل	
بوزودن	بزادن
بھورے بیلا	علی الصباح
بار	وار - دن
شوم بار	سوموار
مونگل بار	منگل
بدھ بار	=
برھپتی بار	جمعرات
شکر بار	جمعہ
بورشا	موسم برشگال
بوشونتو	بسنت - بہار
بیلا	وقت
بوچھر	برس
پرشون	پرسوں
تاریکھہ	تاریخ
دن	=-'-
دوپھر	دوپھر
دوج	روز

بنگالی	اردو
رتو	رت - موسم
رات - راتری	رات
شانجھہ	سانجھہ - شام
شرو	شروع
کال	کل
گھونٹا	گھنٹہ
ماش	ماہ - مہینہ
بوئے شاکھہ	بیساکھہ
اشارہ	اسارہ
سرابون	ساون
بھادر	بھادوں
کارتک	کاتک
اُگھہن	اگھن
پش	پوس
ماگھہ	ماگھہ
ہوپتہ	ہفتہ

شہر اور دیہات

اڈا	اڈا (گاڑیوں کا)
آنگن	آنگن
بے زا	بارا (مویشوں کا)

بنگالی	اردو
باجر - هاٹ	بازار هاٹ
پل	=
تهانه	=
جونگل	جنگل
جیل کهانه	جیل خانه
دیش - پرگنه	دیهات
دوکن	دوکان
ڈاک گهور	ڈاک گهر
ڈاک بنگله	=
ڈاکٹر کهانه	دوا خانه
رستہ - شوڑک	رستہ - سڑک
شهور - نوگور	شهر - نگر
کهیت	=
کهیت بازی - گولا بازی	کهیت
کٹهر	کٹنی - چهونپڑی
کول	کل - کار خانه
کار کهانه	
گرجا	=
گور استهان	گورستان
گور - کوبور	گور - قبر
گرام	گاؤں

بنگالی	اردو
گھاٹ	=
گولی	گلی
موڑ	چوراہا
موشجد	مسجد
موکتب - مودرشہ	مکتب مدرسہ
موندر	مندر

رشتے ناتے

استری	عورت
بابا - پتا	باپ
بالک	بچہ
بور	بر - دولہا
ببا ہو	بیاہ
بون	بہن
۱ بوڑو بھائی	بڑا بھائی
۲ مجھو "	منجھلا "
۳ شیجو "	سنجھلا "
۴ نوتن "	(نیا) "
۵ پھول "	(پھول) "
۶ چھوٹو "	سب سے چھوٹا "
دادا (بھائی)	بھائی (جو کوئی اپنے سے بزرگ ہو)

بنگالی	اردو
پترو	بیٹا - بچہ
جیٹھا	جیٹھہ
چھوکرا	لڑکا
دیور - دیبور	دیور
دوھتا	دختر
دی دی	بڑی بہن
شالا	سالہ
شامی	سوامی - شوھر
شالج	سرھج
شالی	سالی
شوشر	سسر
ششری	ساس
کاکی	چچی
کماری	کنواری
ماشی	موسی . خالہ
مامی	ممانی
منش	آدمی
ماماتا	ماں - ماتا
ماما	ماموں
نوتن دئی	نندوئی

بنگالی	اردو
نانی	نانی - نواسہ
نونود	نند

اعضائے جسم انسانی

آنگل	اپوز
انگشٹھو	انگوٹھا
باهو - هات	بانہہ - هاتھہ
بوگول	بغل
بهرو	ابرو
پیلا	تلی
پیٹ	...
پیٹھہ	...
پا	پاوں - ٹانگ
ٹھن ٹی	ٹھڈی
ٹھونٹ	هونٹ
جیب	جیبهہ - زبان
چهاتی	... ...
چوربی	چربی
چمڑا	کهال - جلد
دیهو	دیهہ - بدن
دانت	... ...

بنگالی	اردو
روان	بال (علاوہ سر کے)
کان	
کلے جا	(کلیجہ) بمعنی دل
کاندہ	کاندھا - کندھا
کوبجی	قبضہ - کلائی
گال	
گورو	گورا (رنگ)
گلا	گلا
ماتھا	سر
موگوج	مغز سر
مکھہ	منہ
ناک	... ...
نوکھہ	ناخن
اُھار	ھڈی
ھات	ھاتھہ

امراض ادویہ وغیرہ

آون دھو	اندھا
آرام کورا	صحت دینا
آتمھتیا	اتماھتیا (خودکشی)
بپود	بپت - مصیبت

بنگالی	اردو
بودھجم	بدھضمی
بش	بس - زہر
بوشونتو	(لبسلت) چھچک
پھولا	آماس - سوجن
پھوتکری	پھتکری
پوٹی	پٹی
پوش دی	(تصدیع) تکان
ٹھنڈا - شوردی	ٹھنڈک - سردی
جولونی	جلن
جوکھان	(زکام) - دق
دائی	... ...
داگ	داغ
روگ - روگی	
شرو پیڑا	سر کا درد
شوردی گورمی	(سردی گرمی) لون لگنا
کاشی	کھانسی
کوشرت	کسرت - ورزش
کوبیراج - (وید)	کویراج - (وید)
کملا	کنول - یرقان
کرمی	کرم - کیڑا
کانا	... ...

بنگالی	اردو
کوپ پر	کافور
مہاماری	(وبا)
مولوم	مرہم
مچکانو	موچ
ھلپلی	دمہ - ضیق النفس

اشیائے خورد توش

اچار	
آٹا	
برفی	
بوروف	برف
بھاجا	بھنا ھوا
پونر	پلیہ
پھلپر مربا	مربہ
تیل	
تورکاری	ترکاری
چپاتی	
چلی	چیلی
دودھ	
دوئی	دھی

بنگالی	اردو
رٹی	روٹی
شوجی	سوجی - روا
شوربوت	شربت
شرکا	سرکہ
کورمہ - کلیا	قورمہ - قلیا
کھابر	کھانا - غذا
کھچڑی	
کاباب	کباب
کھیر	پکا ہوا دودھ
گڑ	
لچی	لچوئی - پوری
ماکھون	مکھن
ماچھہ	مچھلی
مورچ	مرچ
موھن بھوگ	(حلوہ)
موشلا	مسالہ
متھائی	
مود	مدھ - شراب
نون - لون	نون - نمک
ھاجری	حاضری . ناشتہ

مکان اور اسباب خانہ داری

بنگالی	اردو
آرام کرسی	
الماری	
آئینا - آرشی	آئینہ - آرسی
برانڈا	بر آمدہ
باورچی کھانا	باورچی خانہ
بلش	بالش - تکیہ
باشن	Basin باسن - برتن
بھنڈار	نعمت خانہ
بکشو	بکس
بتی	بتی - لمپ
بتی دان	شمعدان
بالش - گودی -	(بالش) گدی
پائے کھانا	پیخانہ
پیالہ	
پوردہ	پردہ
پکھا	پنکھا
تالا - کلپ	تالا - قفل
تھالا	تھالی
توا	

بنگالی	اردو
ٹکری	ٹوکری
جلا	جنگلہ (کھڑکی)
جھلملی	
چادان	چاء دان
چابی	
چمٹا	
چھاتا - چھاتی	چھاتا - چھتری
چابک	
چھت	
چھوبی	شبیہ (تصویر)
چھری	
چلی	چولھا
دیاشلائی	دیاسلائی
دالان	دالان (Hall)
دیال	دیوار
دوات	
دراج	دراز
ڈولا	ھنڈولا
ڈوری	
ڈھکنی	
رکابی	رکابی
شنان	اشنان - غسل

بنگالی	اردو
شورائی	صراحی
شیلڑی	سیڑھی
کمرہ	
کوئلہ	
کافی دان	
کانٹا	Fork
کالی	روشنائی - سیاہی
کیتلی	
کاگوج	کاغذ
کولوم	قلم
گلیچا	غالیچہ
گھوڑی	گھڑی
گھور -	کمرہ (گھر)
غوشول کھانا	غسل خانہ
لون ٹھون	لال ٹین
لفافا	لفافہ
میج	میز
موشوک	مشک (بہشتی کی)

لباس و زیور وغیرہ

اوس تور	استر

بنگالی	اردو
آنگٹی	انگوٹھی
اوڑنا	نقاب
بوٹ جوتا	بوٹ
بوگ لش	بکلس - بکسوا
بونت	بانات
برش	برش
بوتام	
بورشاتی جاما	برساتی - باران کوٹ
بچھانا	بچھونا
پاجامہ	
پھیتہ	فیتہ
پوشوم	پشم - اون
پوشاک	لباس
جاما یا پنجابی	کرتہ
جوتا	
جھب	
جھالور	جھالر
چادر	چادر
چپل - چپلی	=
چوڑی - بالا	چوڑی
چھوڑی	چھڑی

بنگالی	اردو
دوستانا	دستانہ
رے شوم	ریشم
شال	شال
شابن	صابون
شتی	سوتی
کاچ - گھور	(بٹن کا) کاچ
کرتا	=
کوٹ	=
کالر	=
کرم بل	کمبل
کنگن	کنگن
کنکھاب	کمخواب
کانچی	قینچی
کمیج	قمیص
کھوروم	کھڑاؤں
کاپڑ	کپڑا
گھاگرا - شایا	سایا (انگریزی)
گوھونا	گہنا
گولا بوندھو	گلوبند
لاٹھی	=
ماجن	منجن

بنگالی	اردو
موجہ	موڑہ
موکھہ مل	مخمل
مول مول	ململ
نمدہ	=
ہار	=
	پیشے
اُکیل	وکیل
اُمیدار	امیدوار
بھات	بھات - گویا
باورچی	باورچی
باجی گور	بازی گر
پہرا والا	پولیس مین
پھول والا	پھل والا
پھول والا	پھول والا
پادری	=
جوتشی	=
جوہری	=
جریب کرتا - امین	پیمائش کرنے والا امین
چاکور	چاکر - نوکر
چھاپا کھانا والا	طابع

بنگالی	اردو
چترو کار	مصور
درجی	درزی
دھوبا - دھوبی	=
چوکیدار	=
دوروان	دربان
دوکن دار	دکاندار
دائی	=
دو بھاشی	ترجمان
دلال	دلال
ڈاک پیادہ	ہرکارہ
ڈھولی	ڈھولچی
روپو کار	مصور
رونگ ریج	رنگریز
سپائی	سپاہی
شوھس	سائیس
کاری گور	کاریگر
کل وت	کلانوت - گویا
کوبی	کوی - شاعر
کمار	کمہار
کرشان - چاشی	کسان - کاشتکار
از چاشت بمعنی = کاشت	

بنگالی	اردو
کوشی ء	قصائی
کھلاشی جوھاجی	خلاصی - جہازی قلی
گرنتھو کار	مصنف
گوالہ	=
نال بوند	نعل بند
نائب	ایجنٹ
نوٹ	نٹ - اکٹر - اداکار
نٹنی	نٹنی - اکٹرس
موجور	مزدور
میش پالک	گڈریہ
موچی	=
موھاجون	مہاجن
مُدی	مودی بنیا
ھلوئی کار	حلوائی

متفرق الفاظ

ذیل میں متفرق بنگالی الفاظ کی فہرست درج ھے - اور جہاں جہاں ضرورت سمجھی گئی ھے ان کا صحیح اردو تلفظ یا ترجمہ قوسین کے اندر دے دیا گیا ھے - تاکہ سمجھنے میں آسانی ھو - بنگالی الفاظ کے

تلفظ میں صحت کی بہت زیادہ پابندی نہیں ہو سکی اس لیے کہ اعراب کے استعمال کرنے میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو ان الفاظ کے سلسلے میں ہو سکتی ہے —

الف

اُپ واس (فاقہ روزہ)

آبکاری

آپ نی (آپ)

آتما (روح)

آئین (قانون)

آئین انوسار (حسب قانون)

آشا (امید)

آلسامی (ملزم)

اختیار

اقرار

ادم شماری

آمدنی (آنے والا مال Import)

آمدنی (معمولی معنی)

آنند

الہہ - ایشور

آوار کرنا (گولی چلانا)

اوتار

ایک جن (ایک شخص)

ایک ٹا (ایک ٹہو - ایک تا - بمعنی ذرا یا کچھ

احمق

انازی

انصاف

اجلاس

اظہار (بیان عدالت)

اندھار (اندھیرا)

اونچا

الگ

ب

باقی - ھاتھہ جمع (میزان)

بازار

برا

باجنا (گانا)

بچار (خیال)

بے قصور خلاص (ملازم کا صاف بری ہونا)

بحث

برخواست

بدھی (عقل ضمیر - وجدان)

بکری (فروخت)

بدیشی

بے جوڑ (فرد واحد) جوڑا (دو)

بیگ

بھاڑا

بھاڑا گاڑی

بندوبست

بندر (بندرگاہ)

بشواش (یقین)

بیمہ

بندوق

بھاؤ (جذبہ)

بھول (غلطی)

بھوکا

بھاری

بھلا

بھیانک

بھیجا (بھیگا)

بے آئین (غیر قانونی)

بلام

برھو (بہت)

بوڑھا

بیشی (زیادہ)

بیانہ (بیعانہ)

پ

پاپ

پرانا

پورا

پال (بادبان)

پوتر

پریک (پریگ - کیل - میخ)

پریم

پرارتھنا (عرض - گزارش - دعا)

پھانسی

پیکاری (تھوک Wholesale)

پکا

پیش کار

ت

تاریخ

تار
تازہ
تپتا (گرم)
تمادی (قانون)

ٹ

ٹھیکہ گاری
ٹھکانا (پتہ)
ٹھلڈا

ج

جائداد (سرمایہ)
جال
جہاز
جرح (قانونی)
جمع بلدی تشخیص لگان
جبر دستی ادائی (استحصال بالجبر)
جریمانہ (جرمانہ)
جمع
جنس (شے - قسم)
جوتی (روشنی)
جوگی
جواری
جواب
جے کیو (جو کوی)
جے (جو)
جھوٹ
جیون (زندگی)
جعلیت (جعلساز)

چ

چارا (شکار ماهی کے لیے)
چاقو
چورا
چوٹ پٹے (جھٹ پٹ)
چورس (پوربی میں ہموار زمین - بنگالی میں مربع زمین)
چکر لگنا (چکر آنا)
چلگی
چلنا (فکر - خیال)
چھوٹرہ (چھرہ کارتوس کا)
چالانی (جانے والا مال)
چھری
چھڑی

ح = (h)

حساب

حساب چکانا

حفاظت

حاجت (حوالات)

حاکم (جج)

حق - دابی

حلف

حصہ

خ (= kh)

خدا

خبر

خرچ

خرچہ بعد (خرچہ چھوڑنے کے بعد)

خرید

خریدار

خالی

خاص (خانگی - Private)

خانساماں

خدمتگار

خون (قتل)

خلاص (مقدمی سے بری ہونا - ختم ہونا - آزاد ہونا)

خسارت (خسارہ

خزانہ (مالگزاری - ٹکس)

خوشی

د

دام

دان (خیرات

دابی (دعوی - حق)

دائرہ سپرد (عدالت سشن سپرد کرنا)

دھار (اُدھار)

دستوری

دیوانی عدالت

دیوتا (فرشتہ)

دیا (کرم - عنایت)

دور

دیندار (قرضدار)

دیوالہ

دلیل (دستاویز)

دستخط کرنا - صحیح کرنا (دستخط کرنا

درنالہ (دو نالی بلدرق)

دنکا

دھرم

دشت (پاجی - شریر)

درکار (ضرورت)

درکاری (ضروری)

در در (دلدر - غریب - مفلس)

دھرمی (دین دار)

دفتر

دکھہ

درخواست

ڈ

ڈانٹر (چپو)

ڈورا - ڈوری (موٹی رسی)

ر

راس (لگام)

ریتانی (باہر جانے والا مال - رفتنی)

Export.

رشی

رسید

رس (جذبہ)

رد کرنا

رقم (طرح - مانند - قسم)

رجوع کرنا - پیش کرنا (عدالت میں مقدمہ داخل کرنا)

روگی (بیمار)

ز

زخم (زخمی)

س

سامنے

سب

سب کچھو (سب کچھہ)

سستا

سبیتا

ست (حق)

سادھو - سنت

سبالک (بالغ)

سر براھکار (ایجنٹ)

سوجا (سیدھا)

سہج (آسان)

سود

سیوا

سہائتا (مدد)

سورگ

سندر

سخت

سہندہ چوری

ش

شکار

شکاری

شتی ! (سچ ؟ !)

شکتی

شیطان

شریک

شرط (اقرار)

شناخت

ک

کپتان - سارنگ

کچہری

کبتا (شاعری)

کاروبار

کارخانہ - کل

کارتوج (کارتوس)

کتھن

کرپا

کڑا

کرکس (سرکش)

کرتا (میلیجر)

کھچڑا (خوردہ فروشی)

کوچوان

کوڑی (۲۰ عدد)

کیئو (کوئی)

کیو نہ کیو (کوئی نہ کوئی)

کچھو (کچھہ)

کی (کیا - پنجابی بھی یہی ہے)

کے (کون)

گ

گھات

گھائل

گھوڑا

گھن

گودام

گولی

گول

گوئندہ (جاسوس)

گرم

گرفتاری پروانہ (وارنٹ)
گھان
گنت ودیا (حساب)
گرفتار
گیتی (گیت)
گھنا (موٹا)

ل

لمبا
لابھ (نفع)
لنگر
لگام
لین دین

م

مال (پونجی - سرمایہ)
مانچی
مان (عزت)
مارپیٹ
مرن (موت)
مورتی (بت)
موٹا
میلا
میٹھا

ن

ناستک (مُلحد)
ناٹک
نیا (نوا = نیا)
نبالک (نابالغ)

ھ

ھلپھہ (حلف)
ھلکا -

بنگالی پر اردو کے اثرات کے اسباب

بنگالی زبان پر اردو ، ھندی اور دیگر شمالی مغربی زبانوں کے اثرات کے کئی اسباب ھیں -

(۱) تیرتھہ یا ترا

شاید یہ کہنا نامناسب نہ ھوگا کہ بنگال کے لاکھوں جاتریوں نے اُن مقدس زیارت گاھوں اور تیرتھہ استھانوں سے

بہت کچھہ "ہندوستانی" تمدن اور زبان حاصل کیا جو شمالی و شمال مغربی ہندوستان میں واقع ہیں - کاشی و پریاگ (بنارس و الہ آباد) میں اب بھی ہر سال کئی کئی دفعہ لاکھوں ہندوؤں کا مجمع ہوتا ہے اور مقدس گنگ وجمن کی ہم آہنگی سے جو وحدت وجود کا سبق الہ آباد کے سنگم سے ملتا ہے وہ اپنے ساتھہ زبان ' تمدن اور رسم و رواج کی ہندو مسلم یکسانگت کو مشرق سے مغرب تک اُستوار بنا دیتا ہے - سیکڑوں الفاظ اور محاورے یہاں سے جاتریوں کے ساتھہ ساتھہ ملکوں ملکوں پھیل جاتے ہیں - اور خود بخود ایک مشترک زبان جسے ریختہ یا اودو کہہ سکتے ہیں تیار ہوتی رہتی ہے - بنارس اور الہ آباد میں تو اب بنگالیوں کی مستقل آبادیاں قائم ہوگئی ہیں اور روز بروز بڑھتی جاتی ہیں - یہی حال برندرابن کا ہے ' جہاں کے آٹھہ ٹھاکروں میں سے سات ٹھاکر بنگالی ہیں اور سب اردو بولتے ہیں - اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چیتن دیو پندرھویں صدی میں برندرابن گئے تھے اور چونکہ وہ صاحب کشف وکرامات تھے لہذا اُنہوں نے مٹے ہوئے آثار اور مقدس استھانوں کو اپنی بصیرت سے معلوم کیا اورعوام کو بتایا - نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہاں بارہ ہزار بنگالی آباد ہیں اور لاکھوں ہر سال آتے جاتے رہتے ہیں - چیتن دیو کرشن کے اوتار مانے جاتے ہیں - اس طرح وشنو کے پرستاروں نے جتنی کتابیں لکھیں وہ سب " برج بولی " میں لکھیں اور اب تک یہی " برج بولی " بنگال میں گھر گھر پڑھی اور سمجھی جاتی ہے - یہ بولی در حقیقت برج بھاشا ہے جو بنگالی مصنفوں کی زبان سے ادا ہوکر کسی قدر بنگالی آمیز ہوگئی ہے - اور بنگال میں اسے " برج بولی " کہتے ہیں - اسی طرح برندرابن کے بنگالی اور غیر بنگالی شاعروں نے جو

گانے برج بولی میں تصنیف کیے وہ بھی بنگال میں رائج ہیں - اور " برج بولی " کے ذریعہ سے اردو کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں —

اسی سلسلے میں ودیاپتی شاعر کا ذکر ضروری ہے - یہ چودھویں صدی مسیحی کا شاعر تھا - اُس کی تصنیفات میتھلی یعنی بہاری بولی میں موجود ہیں - بنگال میں اس کا کلام بہت مقبول ہوا حتیٰ کہ وہ بنگال کا شاعر مانا جاتا ہے - اور عام طور سے اس کی شاعری ہر شخص سمجھ لیتا ہے اور داد دیتا ہے - آج کل " ودیاپتی " نامی ایک فلمی کہانی بھی بن گئی ہے اور سینماؤں میں چل رہی ہے —

ملک محمد جائسی کی پدماوت اتنی مقبول عام ہوئی کہ رائے بریلی (اودھ) کے ایک قصبے کے شاعر کا کلام سو سال کے اندر اندر سولھویں صدی مسیحی میں بنگالی زبان میں ترجمہ ہوگیا - اس کا باعث بھی ایک مسلمان راجہ مانگن تھاکر والئی اراکان و آسام ہوا - اور ترجمہ کرنے والا بھی بنگال کا مشہور مسلمان شاعر علاؤل شیخ تھا - اگرچہ یہ ترجمہ سنسکرت آمیز بنگالی میں ہے لیکن بہت سی فارسی کی اصطلاحات تصوف بھی اس کے ذریعہ سے بنگالی میں داخل ہوگئی ہیں —

بنگال میں نابھا داس ہندی شاعر کی تصنیف موسومۂ " بھگت مال " بھی ترجمہ کی گئی اور ہندی زبان سے بنگالی کا رشتہ قائم کرنے میں مفید ثابت ہوئی - یہ شاعر تلسی داس کا ہمعصر تھا - یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ تلسی داس اور میرابائی کے ہندی گانے اب تک بنگال میں مقبول ہیں اور عام طور سے گائے جاتے ہیں —

سترھویں صدی مسیحی میں شاعر برند کی " ست سئی " ہندی زبان میں ڈھاکہ میں لکھی گئی اور بنگال میں رائج ہوئی - بہار اور ممالک

متحدہ کے مشرقی اضلاع میں اس کتاب کے دو ہے بچے بچے کی زبان پر ہیں - اس کے دو ہے ایسی ہندی میں ہیں جو بنگالی اور اردو سمجھنے والے دونوں سمجھ لیتے ہیں - مثلاً :—

سبھے سہائے سبل کو کوؤ نہ نبل سہائے
پون جگاوت آگ کو ' دیپک دیت بجھائے

(۲) دارالسلطنت دہلی سے تعلقات

بنگالی زبان پر اردو کے اثر کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جب تک ہندوستان کی سلطنت کا مرکز دہلی رہا ' اُس وقت تک مسلسل سرکاری اور غیر سرکاری افراد و افواج و تجار کی آمد و رفت برابر قائم رہی - عام قاعدہ ہے کہ رعایا اپنے حکام کے طرز بود و ماند اور تمدن و زبان کو اختیار کرنے یا کم از کم نقل کرنے کی کوشش کرتی ہے - بنگال اس سے مستثنیٰ نہیں تھا - یہاں مرشد آباد ' ڈھاکہ ' عظیم گنج اور دوسرے مرکزوں میں امرا و رؤسا نے نہ صرف دہلی دربار کی نقل اُتاری تھی بلکہ اُس میں کافی کامیابی بھی حاصل کی تھی - دہلی کے اثر سے یہاں کی سرکاری زبان فارسی ہوگئی تھی - اور جو لوگ صوبہ کے دربار یا انتظامات ملکی میں رسوخ حاصل کرنا چاہتے تھے وہ فارسی سیکھنا فخر سمجھتے تھے - اسی طرح شیر شاہ کے زمانے سے جو فوجی آبادیاں قائم کی گئی تھیں وہاں سب اچھی خاصی اردو بولتے تھے حتیٰ کہ آج تک وہ لوگ اردو بولتے ہیں ' باوجودیکہ کہ اپنے وطن کو چھوڑے ہوئے اُنہیں صدیاں گزر گئیں - اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ان کی عورتیں بھی اردو بولتی ہیں اور شاید ان کے ساتھ ہی یہاں آئی تھیں - شانتی نکیتن سے ۳ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کاشی پور ہے - یہ پٹھانوں کی بستی ہے ' جن کا پیشہ کاشت کاری ہے - میں نے خود جاکر

وہاں دیکھا کہ وہ بنگالی مسلمانوں سے بنگالی زبان میں بات چیت کرتے ہیں - لیکن آپس میں اردو بولتے ہیں اور اُن کی عورتیں اور بچے بھی اردو بولتے ہیں - لیکن ان کے دیہی مدرسہ کا مدرس دوسرے گاؤں کا بنگالی مسلمان ہے اور اردو نہیں بول سکتا - اسی طرح کی بہت سی بستیاں پورے بنگال میں موجود ہیں —

بنگال کے صوبہ داروں کے یہاں کثرت سے ہندوستانی سیتھ اور شمالی ہندوستان کے رہنے والے سپاہی اور منشی ملازم رہتے تھے - مرشد آباد میں اب تک خالص اردو کے بولنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں - اور محلہ ضیاء گنج تو پورا اُن مارواڑیوں سے بھرا ہوا ہے جن کے آباؤ اجداد کلائو کے زمانے سے پہلے یہاں آکر آباد ہوگئے تھے - نواب مرشد آباد کے یہاں انشاءاللہ خاں کے والد ملازم تھے' اور یہیں یہ پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی —

۳ - تجارت

تجارت کے سلسلے میں علاوہ مارواڑیوں کے' دوسری قومیں بھی برابر آمد و رفت رکھتی تھیں - خود بنگال میں کپڑے اور ریشم کی بے مثل مصنوعات نے اتنی ترقی کی تھی کہ انگلستان' فرانس' ہالینڈ وغیرہ تک ان کی رسائی ہوگئی تھی - اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں یہاں سے ڈھاکہ کی ململ' سلکھہ کی چوڑیاں' سیلدور اور دوسری چیزیں بنگالی لے جاتے تھے - بنجاروں اور تاجروں کی آمد و رفت سے اردو کو بہت ترقی ملتی تھی - اور صرف اسی زبان کے ذریعہ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کے رہنے والے سے گفتگو کر سکتا تھا —

ع - ہندوستانی مزدور

آج کل مغربی بنگال میں کثرت سے بہار اور ممالک متحدہ کے آدمی نظر آتے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی بنگال کے باشندے فطرتاً کمزور ہیں اور جسمانی محنت کے لائق نہیں ہیں - کثرت سے مزدوری کرنے والے دوسرے صوبوں کے ہیں - جو آدھے منافع میں شریک ہوکر یا تو کاشتکاری کرتے ہیں یا دوسرے قسم کی مزدوریاں کرتے ہیں - ملیریا بخار اور چاول اور تیل کے استعمال نے غریب بنگالی کسانوں کو بہت کمزور کردیا ہے - بہرحال باہر سے آنے والے مزدور سب اردو بولتے ہیں اور بنگالی بولنے والوں کو بھی بہت سے الفاظ سکھا جاتے ہیں —

تبدیل معنی

ذیل میں ہم چند فارسی الفاظ درج کرتے ہیں جن کا تلفظ تو بدل ہی گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اکثر الفاظ ان معنوں میں بولے جاتے ہیں جو ہم عموماً اردو میں نہیں بولتے - بالکل یہی حال بہت سے فارسی اور عربی الفاظ کا اردو میں ہوا ہے - یعنی ان کے اصلی معنی ہماری زبان میں کچھہ سے کچھہ ہوگئے ہیں - اور اگر وہ خالص لغوی معنوں میں استعمال کیے جائیں تو محاورہ کے خلاف معلوم ہوتے ہیں - بنگالی زبان میں اردو کے بعض حروف تہجی نہیں ہیں - اس لیے ان کی جگہ جو حروف مستعمل ہیں وہ یہ ہیں - ث - س - ص کے لیے شین استعمال ہوتا ہے - شاذ و نادر سین بھی سننے میں آجاتا ہے - ہاے ہوز اور حاے حطی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، حالانکہ

اردو میں بھی یہی حال ہے ' لیکن بہرحال لکھنے میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے - جس کی وجہ ہم آواز الفاظ کے معنوں میں آسانی سے تمیز ہوسکتی ہے - خ کے لیے کھ - (ذ ' ز ' ض ' ظ) کے لیے جیم ' عین کے لیے الف ' غ کے لیے گ ' ف کے لیے پھ ' قاف کے لیے کاف کا استعمال ہوتا ہے - کبھی کبھی بائے عربی کی جگہ بائے فارسی (پ) کا استعمال بھی کیا جاتا ہے - مثلاً گلاب کو گلاپ اور جلاب کو جلاپ کہتے ہیں - لیکن اگرچہ سنسکرت کی نقل میں اس زبان کے حروف تہجی میں زائے ہوز داخل نہیں ہے لیکن گفتگو میں اکثر غیر بنگالی الفاظ کی جیم کو "زے" سے اور زے کو جیم سے بدل دیتے ہیں - مثلاً پوسٹ مین ہی حازی محمد ازمل نہیں کہتا ' بلکہ انگریزی پڑھا لکھا ٹائپ نویس بھی ہمیشہ حاجی کو Hazi اور اجمل کو Azmal ٹائپ کرتا ہے اگرچہ اس کے سامنے دونوں لفظوں میں بجائے J کے Z کبھی نہیں لکھا جاتا - بہرحال وہ چند الفاظ جن کے معنی تبدیل ہوگئے اور جو مجھے بہ مشکل دستیاب ہوئے ہیں - درج ذیل ہیں - الفاظ کے سامنے ان کے اصلی معنی لکھ دیے گئے ہیں -

بنگالی الفاظ	تبدیل شدہ معنی
بہار (باہار)	حسن
بہادر	شاباش
برات	حاجت
بیگانہ (بگانہ)	لامعلوم
زیر بار (جیر بار)	تھک جانا
خالی (کھالی)	صرف
دادن (دادون)	پیشگی دینا

بنگالی الفاظ	تبدیل شدہ معنی
داخل	پہنچنا
دخل (دکھول)	علاقہ
درکاری	مفید
رجوع دینا	مقابلہ کرنا
روشنائی	روشنی
دلدار	بہادر - دل والا
ربط (زپتو)	مشق
طبق (تابوک)	تہ
فرمائش (پھرماج)	حکم
گوشہ	غصہ
کشتی	قسط
گھیرے	گرہ
مطلب (متلوب)	نقشہ
مقابلہ (مکابلا)	ملاقات
ہنگام (ہنگامہ)	فساد
ناراض (ناراج)	انکاری (جو کسی کام کے کرنے پر راضی نہ ہو)

فارسی الفاظ

ذیل میں وہ فارسی الفاظ درج کیے جاتے ہیں جو بنگالی زبان میں اب تک رائج ہیں - اور تھوڑے سے اختلاف تلفظ کے بعد ہر وہ شخص جو ہندوستانی ہے انہیں سمجھ سکتا ہے - بنگالیوں میں ان الفاظ کو

جو لوگ استعمال کرتے ہیں انہیں یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی غیر ملکی زبان کے الفاظ ہیں - بلکہ بعض الفاظ تو اس قدر تبدیل ہو گئے ہیں کہ اچھی خاصی فارسی جاننے والے بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کا ماخذ فارسی تھا اور اب یہ بنگالی ہو گئے ہیں - مثلاً چھوہی اصل میں شبیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور تصویر کے لیے استعمال ہوتا ہے - اس قسم کی مثالیں پہلے لکھی جا چکی ہیں - اب صرف فارسی الفاظ، فارسی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں - بنگالی میں ز، ذ، ض، ظ کے لیے صرف زیا ج کا استعمال کیا جاتا ہے - اسی طرح غ کے لیے گ، ق کے لیے ک، ث، ص، س کے لیے س رائج ہے:

الف

أستاد - آئینہ - آستین - آسامی - آتشبازی - افیون - آسان - اسباب - آبنوس - اِزار - آرام - اکثر - آب ہوا - آخر - آفت - اگر - اشتہار - ادا - امیر - امرا - اصول - آواز - انجام - البتہ - اردو آسمان - الائچی - امین - اطلاع - آبخورہ - آبادی - ابر - آبلہ - اثر - اجھر - احمق - احوال - اخبار - آفۃ - اختیار - آنکس - اذاں - ارضی - استر - أستان - استعفی - استعمال - آشنا - اصیل - اظہار - افسوس - الوبخارا - الوان - الہی - آمادہ - آمدنی - انتظار - انتظام - انتقال - انصاف - انعام - اولاد - ایمان - آتشی - اجارہ - اجلاس - افطار - امام - امروز - آبادی - اعتبار - آئندہ - آشوب - آشنائی - اوقات -

ب

باطل - باغ - برداشت - بک بک - بے وقوف - بوتام - بلدوق باورچی -

بیشی - بخشی - بالش - بازو بند - باقی - باد - بخشش - بندگی - بغل - بغچہ - برج - برات - بابت - بارود - بندہ - بہشتی - بلا - بانات - بدام بارھا - بز - بندوبست - بستہ - بیشتر - برخواست - برقنداز - بارگاہ - بازی باشندہ - باغبان - بافتہ - بالکل - بانگ - بچہ -

پ

پیالہ - پیادہ - پاپوش - پتنگ - پشم - پنجہ - پرگنہ - پیغمبر - پیچ - پرواہ - پلاؤ - پیل خانہ - پادشاہ - پرواز - پیاز - پنیر - پیش - پوشاک پیشاب - پری - پا - پیرہن -

ت

تعلق - تمادی - تحصیل - توپچی - تفاوت - تصویر - تعویذ - تدارک تاریخ - تلوار - توپ - تفنگ - تختہ - تنخواہ - تقاضا - تدبیر - ترکیب تازہ - تکمہ - تیر - تاج - توشک - تلور - توقع - ترکاری - تخت پوش - تار - تعجب - تائید - ترازو - تفسیر - تلگ - تعلیم - تا —

ج

جور - جمع - جریب - جرح - جامہ - جوان - جیب - جان - جلس - جوش - جگر - جدا - جواب - جائگہ - جادوگری - جانور - جاگیر - جلوس - جعل - جبہ - جنگی —

چ

چشمہ - چغلی - چغہ - چراغ - چربی - چہرہ - چلم - چرخہ - چاکر - چست - چابک - چالاک -

ح

حاضر - حضور - حرامی - حرامزادہ - حساب - حال - حکیم - حاشیہ - حور - حدیث - حکمت - حاجت - حد - حجام - حق - حاصل - حیا - حنا - حلوہ -

خ

خام خیالی - خوشبو - خوبصورت - خاکی - خاک - خاص - خراب - خریدار - خون - خوب - خالی - خام - خوش نویس - خطاب - خبر - خوشی - خبر - - خیال - خرگوش - خانگی - خیرات - خدا - خاطر - خط - خزانہ - خود - خوانچہ - خوار - خواب گاہ - خواجہ - خیرخواہ - خستہ - خواہ مخواہ - خواھش - خزانچی - خرچ - خلجر - خارج - خدمت - خلیفہ - خانسامان - خضر - خبردار - خیانت - خشکی —

د

دوات - دلخوش - دروازہ - دار - دنیا - دماغ - دلیل - دستاویز - دائر - دیوار - دم - دعوی - دکان - دق - دواخانہ - دستور - دام - دیوان - دیو - دربان - درگاہ - درخواست - دیوانہ - درکار - دیگ - دیگچی - دجال - دفعہ - داغ - دین - دراز - دارو - دوربین - - دغاباز - درد - دولت - دشمن - دور —

ذ

ذات —

ر

رنگ - رجوع - راہ - رکاب - رومال - رسد - ردی - روشنائی - روزگار - رگ - رفو - رعیت —

ز

زین - زبان - زمین - زمیندار - زری - زنجیر - زیرہ - زعفران - زراعت - زنانہ —

س

سبز - سپرد - سپید - سوال - سزا - سود - سرکار - ستار - سادہ - سرہنگ - سخت - سراغ - سیر - سن - سرشتہ دار - سردار - سرمہ - ساز - سرخی - سوداگر —

ش

شرم - شال - شہنائی - شرط - شیخ - شناخت - شائستہ - شمعدان - شہید —

ص

صبر - صدر - صف - صرف - صراف - صوبہ - صندوق - صیقل - صحیح -

ض

ضبط - ضد - ضامن - ضلع - ضرور - ضروری —

ط

طاق - طاؤس - طبق - طبلہ - طلاق - طاقت —

ظ

ظلم —

ع

عرض - عرضی - عرق - عزت - عدالت - عمارت - عطر - عید - علیحدہ -

غ

غل - غلط - غلام - غازی - غسل - غزل - غصہ - غالیچہ - غیبی —

ف

فاضل - فتیلہ - فرق - فرش - فرد - فریادی - فراری - فرار - فکر - فوارہ - فیصلہ - فیروزہ - فیتہ - فوجداری عدالت - فرمائش (پھرمائچ) —

ق

قتل - قلم - قبضہ - قبضی - قدم - قلمدان - قلب - قفل - قلندر - قواعد - قورمہ - قید - قینچی - قصور - قاعدہ - قانونگو - قائم (صحیح) - قرق - قسط (کشطی) —

گ

گرہ - گردن - گریبان - گرد - گرفتار - گرم - گرمی - گز - گزران - گلاب - گم - گناہ - گور - گورستان - گوش مالی - گواہ —

ل

لگام - لاجورد -

م

ملنسی - مالک - مکان - مقام - مشق - مغز - ملک - مصالہ - مرد - مزہ - میدان - مشکل - موزہ - مجلس - معنی - مشغول - مسطول - محصول - مختار - موضع - مسودہ - معمولی - مست - ماہ - مطلب - مصاحب - مسجد - موت - معرفت - مفت - مضبوط - مدد - میوہ - موافق - مشعلچی - منصب - محلت - موسم - مسافر - معاف - ملتوی - معاملہ - مقدمہ - منظور - محل - مقابلہ - مرضی - مع -

ن

نقل - نرخ - نائب - ناظر - ناخن - نالہ - نالش - ناخدا - ناشپاتی - نابالغ - نام - نقد - نقشہ - نزدیک - نہر - نشہ - نشہ خور - نواب - نواب زادہ - نظیر - ناقص - نرخ - نقد - نیلام - نقل نویس - ناراض - نشان (جھنڈا) - نقصان - نمونہ - نشانہ - نرم -

و

واپس - وکیل - وکالت - وزن - وقت - وجوہات - ولایت -

ہ

ہمیشہ - ہوبہو - ہوا - ہضم - ہنگام (بمعنی ہنگامہ) —

ی

یار - یعنی —

بنگالی مثلیں اور کہاوتیں

المثل فی الکلام ' کالملح فی الطعام

مثلیں اور کہاوتیں اُس وقت بنتی ہیں جب زبان اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے - اکثر تاریخی استعارے ' بہت سے فطری مشاہدے ' لاتعداد روزمرہ کے تجربے خاص معنوں میں استعمال ہونے لگتے ہیں - اگر ان کہاوتوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں لغوی ترجمہ کیا جائے تو خاک سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے - اسی لیے یہ نتیجہ یقیناً صحیح ہے کہ ہر ایک زبان اپنے مخصوص محاورات رکھتی ہے اور ضرب الامثال کی بنا پر ہم ایک زبان کو دوسری سے تمیز کرسکتے ہیں - بنگالی میں جو کہاوتیں استعمال ہوتی ہیں وہ تقریباً سب اردو زبان سے مستعار لی گئی ہیں - بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ بنگالی زبان میں لہجے کے اختلاف سے قطع نظر کرنے کے بعد جو چیز بنگالی اور ہندوستانی زبانوں میں مشترک ہے وہ اردو کہلائے جانے کی مستحق ہے - ذیل میں چند بنگالی کہاوتیں درج کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ بنگالی زبان اردو سے کس قدر قریب ہے - یہ مثلیں مسٹر اس - سی - متر اکی بنگالی لغت موسومۂ " شرول * بانگلا ابھیدان " کے چھٹے باب سے لی گئی ہیں - یہ باب تمامتر " شلوک بولی " یا کہاوتوں پر مشتمل ہے - اور اس میں پندرہ بیس ہزار کہاوتیں ہیں —

۱ - تمی پیرو ڈالے ڈالے آمی پھری پاتے پاتے - یعنی تم ڈال ڈال

---

* See. Subal Chandra Mitra's : The Studets Bengali Dictionary, New Bengal Press, 66 - 67 College Street Calcutta, 6th. Chapter page 1419.

ہم پات پات —

۲ - اجگرے داتا رام - یعنی اجگر کا داتا رام

۳ - آدھک سنیاسی تے گاجن نشت - ترجمہ : بہت سے فقیروں سے خانقاہ برباد ہو جاتی ہے - اردو میں کہا جا سکتا ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام —

۴ - سات کھون ماپھ - یعنی سات خون معاف ہیں —

۵ - کاکے لئے گیلو کان ، کا کیر پیچھونے پیچھونے چھوٹو -
(ترجمہ) کوا لے گیا کان ، کوے کے پیچھے پیچھے دوڑو -

۶ - کاجے کوم ، کھیتے جوم - (ترجمہ) کام کم کرنا ، لیکن کھانا جم کے کھانا - اردو میں اس کہاوت کی ہم معنی ایک اور کہاوت ہے یعنی : کھانے میں شیر ، کمانے میں بھیڑ - ہندی میں اسی طرح کی کہاوت ہے : رام بھجن میں آلسی ، بھوجن میں ہُشیار -

۷ - کارشد ہو کیوا مارے ، کھودا جار راجی - یعنی جس سے خدا راضی ہو اس کو کوئی نہیں مار سکتا - کبیر کہتا ہے :-
جاکو راکھے سائیاں مار سکے نا کوئے - بال نہ بانکا کرسکے جو جگ بیری ہوئے -

۸ - اے بھی جائے گا - یعنی موجودہ حالت بھی باقی نہ رہے گی اور مصیبت راحت سے بدل جائے گی - چلیں نماند و چناں نیز ہم نخواہد ماند -

۹ - سب لال ہوجاے گا - یہ ضرب المثل قصہ طلب ہے - راجہ رنجیت سنگھہ کا ایک بنگالی کلرک تھا - اس کے پاس ایک ہندوستان کا نقشہ تھا جس میں انگریز کمپنی کی حاصل کردہ اراضی کو سرخ رنگ سے ظاہر کیا گیا تھا - رنجیت سنگھہ نے پوچھا یہ سرخ رنگ کیسا ہے تو منشی نے کہا یہ کمپنی کی ملکیت کو ظاہر کرتا ہے - اس پر

راجہ نے کہا کہ باقی جگہ جو باقی ہے وہ بھی کچھہ دنوں میں لال ہوجائے گی یعنی کمپنی کا اس پر قبضہ ہوجائے گا۔

۱۰ - کمیر یر شُنگ باد کُرے ' جْل باش کورا

(ترجمہ) مگر کے سنگ بیر کرے ' پانی میں رہے

یہ کہاوت "برند" کی سمت سنسکرت سے لی گئی ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے - اردو کی کہاوت ہے "پانی میں رہنا اور مگر سے بیر"-

۱۱ - کھائے نا ' دے نا پاپی ' سنچوے کُرے - تار دھن کھائے چورے اور پورے یعنی کنجوس آدمی نہ خود کھاتا ہے ' نہ کسی کو دیتا ہے بلکہ جمع کرتا ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت کو چور اور پرایا آدمی کھاتا ہے - فارسی مثل ہے :- نہ خود خورد نہ بہ کس دہد ' گندہ گند بہ سگ دہد -

۱۲ - گرج بوز بلائے - غرض بڑی بلائے ہے -

۱۳ - آکاش دھول چھوڑے ' آپن چوکھے پوڑے - یعنی آسمان پر دھول ڈالنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی آنکھہ میں پڑتی ہے - اسی طرح کی کہاوت اردو کی ہے چاند پر خاک ڈالے سے خاک تھوڑے پڑتی ہے —

بنگالی زبان کا نمونہ

اب تک ہمارا مطالعہ صرف ان اسماء و صفات تک محدود رہا ہے جو اردو اور فارسی سے بنگالی نے مستعار لیے ہیں - افعال سے ہم نے اس لیے بحث نہیں کی ' کہ اس کے لیے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہے - اور مضمون شاید زیادہ طویل ہوگیا ہے - لیکن دلچسپی سے خالی نہ ہوگا -

اگر ہم رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور ڈرامے "ڈاک گھر" کے پہلے منظر کے چند جملے اصل زبان میں پڑھیں - ترجمہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ بنگالی کتابیں اگر اردو رسم الخط میں لکھی جائیں تو کس آسانی سے ہم ان کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں -

ڈاک گھر

۱

(مادھودت ایر گھر)

مادھب دت :

مشکلے پوڑے گے چھی !
جا کھن او چھیلا نا ' تا کھن چھیلائی
نا — کونو بھاؤ ناہی چھیلا نا -
ایکھوں او کوتھا تھیکے ایشے -
آمار گھر جوڑے بوشلو -
او چلے گیلے آمار ا ے گھر -
جانو آر گھری تھا کبے نا -
کبیراج موشائے آپنی کی منے
کرین ؟ او کے ... ...

کبیراج :- اُور بھاگے جدی
آیو تھا کے ' تا حال دیر گھا
بانچتیو پارے ؛ کلتو آیور بیدے
جے رکم لکھے چے تاتے تو .....

مادھب دت :- بولن کی ؟!

ڈاک خانہ

پہلا ایکٹ

(مادھودت کا گھر)

مادھودت :-

(کتنی) مشکل پڑ گئی ہے !
جب تک وہ نہیں تھا ' تب تک تھا ہی
نہیں — کوئی فکر ہی نہیں تھی -
اب وہ کہاں سے آگیا -
ہمارے گھر (پر) قبضہ کیے ہوئے تھا (ہے) '
اس کے چلے جانے (کے بعد) ہمارا یہ گھر
گویا پھر گھر ہی نہ رہے گا -
کبیراج صاحب آپ کیا من (میں)
کر رہے ہیں ؟ اس کو ... ...

کبیراج :- اُس کے بھاگوں میں اگر
زندگی ہے ' تو دیر تک
زندہ رہے گا ؛ لیکن ایو روید
جس رقم (طرح) لکھتی (ہے) اُس سے تو...

مادھودت :- کیا کہا ؟!

کبیراج :- شاستر ے بولچن ... ...
مادھب دت :- تھاک ، تھاک !
آپلی آراوئی اشلوک گولو آورا
بین نا — اوتے آرو آمار
بھائے بیڑے جاے -
ایکھن کی کرتے ہوے ، شئی
تے بولے دین —
کبیراج :- (نس لوئیا) کھرب
شبدھانے رکھتے ہوے -
مادھب دت :- شے تو ٹھیک کتھا -
کلتو کی لبشے شبدھان ہوتے ہوے
شے اِی تے ستبھیر کرے جان -
کبیراج :- آمی تو پوبئی بولے چھی -
اوکے باڑے ایکے بارے
جیتے دیتے پاربن نا -
مادھب دت :- چھیلے مانش !
اوکے دن رات گھریر مُدھے
دھرے ریکھا ، جے بھاری سکتو-

کبیراج :- کتابیں کہتی ہیں...
مادھوت :- ٹھیرو - ٹھیرو
آپ اور وہ اشلوک وغیرہ مفید
نہ ہوں گے - اُس سے اور ہمارا
خوف بڑھ جاے (ہے) -
اب کیا کرنا ہوگا - یہی
چیز بول دیجیے -
کبیراج :- (نسوار لیکر) خوب
حفاظت رکھنا ہوگا -
مادھودت :- یہ تو ٹھیک بات (ہے) -
لیکن کس طرح حفاظت ہوگی
یہی بات صاف کر جائیے -
کبیراج :- میں تو صاف بول چکا
اس کو باہر ایکبار (یعنی بالکل)
جانے دینا نہیں (چاہیے) -
مادھودت :- بچہ ہے !
اس کو دن رات گھر کے اندر
دھرے رکھنا ، یہ بھاری سخت (ہے)

بنگال میں ترقی اردو کے راستے

صراط مستقیم یا سیدھا راستہ تو یہ تھا کہ موجودہ حکومت بھی

اُس عہد کی پاسداری کرتی جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے دیوانی عدالت کی زبان کے متعلق سلطنت مغلیہ سے ہوا تھا - لیکن زمانہ بدل گیا - انگریزی زبان کی گرفت مضبوط ہو گئی - اور فارسی نہ صرف عدالتوں سے مٹ گئی بلکہ مدارس سے بھی نام نہاد طریقہ پر اردو اور عربی پر زور دیا جاتا ہے - فارسی کا کوئی نام بھی نہیں لیتا - جہل کی حد یہاں تک پہنچ گئی ہے کی اچھے خاصے پڑھے لکھے ہندوؤں کو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ عربی فارسی دونوں ایک ہی زبانیں ہیں اور جاہلوں کا ذکر ہی کیا' وہ تو عربی فارسی تو کیا اردو کو بھی " نوبی کا جوبن " (نبی کی زبان) یعنی مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں - معلوم نہیں کس نبی نے اردو کو دریعہ تعلیم بنایا تھا —

بنگال میں نہ صرف فرقہ پروری کی وبا عام ہے بلکہ تعلیم یافتہ بنگالیوں کو یہ مغالطہ بھی ہے کہ وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے زیادہ بہتر دماغ رکھتے ہیں - یعنی سوچتے زیادہ ہیں لیکن آب و ہوا کی کمزوری کی بنا پر اپنے نظریات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے - یہی وجہ ہے کہ یہاں کی تحریکوں میں جوش و خروش تو بہت ہوتا ہے لیکن عملی اقدام ہونے تک سرد ہو جاتا ہے —

آج کل کانگرس کی تجویز کے نام پر شہر شہر قصبہ قصبہ " راشٹریہ بھاشا پرچارنی سبھا " کے دفتر قائم ہو رہے ہیں - یہ ہندوستانی زبان پھیلانے والی انجمنیں اس چیز کو بھول گئی ہیں کہ ہندوستانی زبان خود اپنے زادبوم میں اتنی قدامت پرست اور تنگ نظر نہیں ہے' جتنا بنگالی خادمان ملک نے اسے سنسکرت سے قریب تر لانے میں اپنا نام نہاد فرض ادا کرنا شروع کیا ہے - یہاں " ہندی پرچارنی " سبھائیں بھی

ہیں اور اس جماعت کے لوگ بھی اگرچہ ثقیل ہندی کی تعلیم دے رہے ہیں لیکن اول الذکر جماعت کے مقابلہ میں زیادہ جبری اور سچے معلوم ہوتے ہیں کہ جو کرنا چاہتے ہیں اُس پر محض دکھاوے کے لیے " راشٹری " یا وطنی رنگ نہیں دیتے اور صاف اور سیدھے طریقے سے جس زبان کو وہ ہندی سمجھتے ہیں اُس کی تعلیم دیتے ہیں - اور جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں اُنہیں سندیں اور انعامات بھی دیتے ہیں - ہندی زبان کا رسم خط دیوناگری ہوتا ہے اور اس تحریک کی اعانت بنگال کے غیر بنگالی تاجروں یعنی مارواڑیوں اور گجراتیوں کی طرف سے ہوئی ہے —

اس سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ بنگالی زبان ہندی کے ذریعہ سے اردو کے قریب تر آرہی ہے - اور ہمیں امید ہے کہ جلد ایک عام ملکی زبان جو " راشٹریہ " نہیں ' بلکہ ہندوستانی ہوگی ' بنگال میں رائج ہو جائے گی - بنگالی زبان میں مذکر و مونث میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا - اسی طرح واحد اور جمع کے لیے واحد ہی صیغہ مستعمل ہے - یہی حال جاوی اور ملائی زبانوں کا ہے - اب ہندی کے رواج سے بنگالیوں میں اردو کی یہ دو خصوصیتیں پیدا ہو جائیں گی —

بنگالی اور دیوناگری رسم خط بہت کچھ ملتے جلتے ہیں - لیکن یہاں کے باشندوں میں بنگالیت اتنی غالب ہے کہ وہ اس پر تیار نہیں کہ بنگالی کے بجائے دیوناگری استعمال کرنے لگیں - اِن کا خیال صحیح ہے کہ ہندی لٹریچر سے کہیں زیادہ بنگالی ادب وسیع و عمیق ہے - لیکن میکس ملر (Max Muller) نے برہمی کی بجائے اتفاقیہ طور پر دیوناگری کو ویدوں کی کتابت کے لیے تجویز کرلیا - اس حسن یا سوء اتفاق کا یہ نتیجہ

ھے کہ ناگری رسم خط کو ھندو مقدس ماننے لگے ھیں اور پورے ھندوستان پر اسے عاید کرنا چاھتے ھیں —

حامیان اردو کا یہ فرض ھونا چاھیے کہ ملکی یکجہتی اور اردو کی ترقی کے خیال سے ھندی تحریک کی مخالفت نہ کریں - البتہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھیں کہ اردو کی ترقی اردو رسم خط کے ذریعہ سے زیادہ تیزی سے ھوسکتی ھے - دنیا کا کوئی معقول انسان اس رسم خط کی زود نویسی اور اختصار سے انکار نہیں کرسکتا - اور جب کہ کراچی کانگرس نے اقلیتوں تک کے رسم خط کو بطور بنیادی حق کے تسلیم کرلیا ھے تو کیا وجہ ھے کہ اردو رسم خط جو ھندوستان کے ھر صوبہ میں رائج ھے اور دنیا کے ھر حصہ میں پڑھا جاسکتا ھے وہ بنگال میں رائج نہ ھو - اس رسم خط کو زیادہ وسعت دینے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے مناسب ھوسکتے ھیں —

۱ - محکمۂ تعلیمات بنگال کا فرض ھونا چاھیے کہ ممالک متحدہ کی طرح ھندی اور اردو دونوں زبانوں کے لیے ایک ھی (Common) زبان کا کورس مقرر کرے - اور ھر طالب علم کے لیے ھندی اور اردو دونوں رسوم خط سیکھنا لازمی قرار دیے جائیں —

۲ - ھندی اور اردو جاننے والوں کے لیے عدالت میں یہ سہولت ھونی چاھیے کہ جس رسم خط میں چاھیں درخواست دے سکیں اور نقل لے سکیں —

۳ - عام طور پر سرکاری محکمہ میں نہ صرف اردو اور ھندی میں مراسلت کرنے کی اجازت ھو بلکہ اس کی بھی اجازت ھو کہ جو شخص جو اردو یا ھندی نہیں جانتا بلکہ صرف بنگالی جانتا ھے وہ بھی

اردو یا ہندی رسم خط میں اپنی بنگالی زبان کو لکھوا کر مراسلت کرسکے -

اس آخری تجویز کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوگی جب وہ لوگ جو بنگالی رسم خط نہیں جانتے اور اردو یا ہندی رسم خط جانتے ہیں ان میں سے کسی رسم خط میں بنگالی زبان لکھنے لگیں گے - نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ بنگالی زبان اردو اور ہندی سے بہت قریب ہو جائے گی اور خصوصیت سے وہ پابند مذہب مسلمان جو اپنے بچوں کو قرآن کریم پڑھانا ضروری سمجھتے ہیں نہایت آسانی سے اردو رسم خط میں اپنی بنگالی زبان کو لکھنے لگیں گے - یعنی جو مشکل اُن بچوں کو بنگالی رسم خط سیکھنے میں ہوتی ہے وہ رفع ہوجائے گی —

اس کے علاوہ ان کو ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن کریم کے وہ بنگالی ترجمے جو اب تک بنگالی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں اردو خط میں لکھے جائیں گے - اور عربی متن کے نیچے بنگالی ترجمہ اردو خط میں ہوگا جو زیادہ آسانی سے سمجھ میں بھی آئے گا اور اردو سے اجنبیت کو بھی دور کردیگا - مجھے یقین ہے کہ اگر صرف ترکیب نماز وحج و زکواۃ اور چند ضروری سورتیں معہ بنگالی ترجمہ کے اس طرح اردو رسم خط میں شائع کردی جائیں تو نہ صرف شائع کنندہ کو مالی فائدہ ہوگا بلکہ مشرقی بنگال میں دس سال کے اندر اندر اردو رائج ہو جائے گی - اس کام کے لیے اگر اُن بنگالی طالب علموں کو جو یو - پی ' بہار اور مختلف ریاستوں میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے چلے جاتے ہیں ' منظم کیا جائے تو غالباً ترقی اردو کا کام زیادہ سرعت سے ہو سکے گا —

فارسی غزل

از

جناب فضل احمد کریم صاحب، فضلی بی - لٹ (آکسفورڈ)، آئی ۔ سی ایس

حصہ دوم

باب اول

فارسی غزل کے ارتقا کی تاریخ حسب ذیل چھ دوروں میں تقسیم کی جا سکتی ہے:۔

(۱) ابتدا سے اُس شاعر تک جس نے سب سے پہلے ایک مکمل دیوان غزل چھوڑا یعنی حضرت احمد جام —

(۲) احمد جام سے سعدی تک جب غزل سب سے زیادہ ہر دلعزیز صنف سخن بن گئی —

(۳) سعدی سے حافظ تک جب غزل اپنے معراج کمال کو پہنچی —

(۴) حافظ سے فغانی تک جب غزل میں ایک نئی طرز ظہور پذیر ہوئی۔

(۵) فغانی سے مرزا عبدالقادر بیدل تک —

(۶) نیا دور —

ان ادوار سے بالترتیب بحث کی جائے گی —

پہلا دور

خصوصیات

یہ وہ دور ہے جس میں موجودہ فارسی ادب نے جنم لیا۔ اس

دور میں ایرانیوں نے از سر نو اپنی آزادی و خود مختاری حاصل کی؛ دلوں میں ولولے تھے، سر افتخار بلند ہو رہا تھا - لہذا انہیں اپنی جداگانہ قومی تہذیب و تمدن اور روایات کو زندہ رکھنے اور اپنی مادری زبان یعنی فارسی کو ترقی دینے کی قدرتاً خواہش پیدا ہوی - بادشاہوں اور رئیسوں نے کچھ سیاسی مصلحت اور کچھ رجحان طبیعت کی بنا پر اس جذبے کی تربیت اور نشو نما کا بار اُٹھایا - اس لیے اس دور میں دو اصناف سخن نے سب سے زیادہ ترقی کی یعنی ایک تو مثنوی جس میں قومی تاریخ و روایات نظم کی گئیں؛ دوسری قصیدہ، جس میں ممدوح کی شان میں رطب اللسانی کی گئی - غزل پس پشت پڑی رہی مگر اس کا اصل موضوع یعنی عاشقی و مے نوشی متذکرہ بالا ہر دو اصناف سخن اور رباعیات میں ترقی پاتا رہا —

اس دور کے ابتدای زمانوں ہی میں غزل بہ حیثیت ایک جداگانہ صلف سخن کے موجود پای جاتی ہے - اگرچہ لفظ غزل کا اطلاق عموماً ایسی نظموں پر بھی کیا جاتا ہے جو کسی تک سے غزل نہیں کہی جا سکتیں تاہم اس زمانے کے قریب قریب ہر شاعر کے کلام میں چند خالص غزلیں پای جاتی ہیں - اس دور کے متوسط زمانے میں (اگر اس سے قبل نہیں تو) مطلع لوزامات غزل میں داخل ہو جاتا ہے - مقطع کا استعمال بھی زیادہ کثرت سے ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ دوسرے دور کے ابتدائی زمانوں میں وہ بھی جزو غزل بن جاتا ہے —

غزل کے لیے مناسب زبان ابھی تک نہیں پیدا ہوئی - کرخت و ثقیل الفاظ عموماً اشعار میں پائے جاتے ہیں - اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فارسی زبان اس زمانے میں اسی قسم کی تھی، دوسری یہ

کہ شعر و سخن کا مرکز فارسی زبان کے اصل وطن یعنی فارس سے بہت دور تھا - مصرعوں کی ترکیب بھی چست نہیں ہوتی - غیر ضروری الفاظ اکثر پائے جاتے ہیں - عروض کی پابندی کا بھی چنداں خیال نہیں کیا جاتا —

اس دور کی غزل میں عموماً ذاتی واردات و جذبات بیان کیے جاتے ہیں - شعرا آپ بیتی سناتے ہیں اور اپنے اشعار میں اس مادی دنیا کا نقشہ کھینچتے ہیں جسے وہ اپنی گوشت پوست کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں - بعد کے زمانوں کی خیالی دنیا اور اس دنیا کی شاعری ابھی وجود میں نہیں آئی —

معشوق کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا جاتا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صنف ذکور کا فرد ہے - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شعرا اصلی واقعات بیان کرتے ہیں - دوسری یہ ہوسکتی ہے کہ یہ زمانہ زمانہ قدیم سے قریب ترین ہے جب بقول ابن رشیق اور مولانا حالی کے شعرا اپنے آپ کو عورت اور محبوب کو مرد فرض کرتے تھے اس لیے اس زمانے میں اس پرانی رسم کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے —

چونکہ غزلوں میں ذاتی واقعات بیان کیے جاتے ہیں اس لیے ان میں عموماً تسلسل اور ہم آہنگی ہوتی ہے - یہ امر خاص طور سے قابل لحاظ ہے کیونکہ مولانا شبلی شعرالعجم میں فرماتے ہیں " قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا (یعنی مسلسل غزلوں کا) بہت کم رواج ہوا " (شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۱۸۲) - ان صفحات سے ظاہر ہوگا کہ صورت معاملات برعکس ہے - غیر مسلسل غزلیں بھی پائی جاتی ہیں مگر مقابلتاً کم —

خیالات میں عموماً سادگی ہوتی ہے اور ان کا انداز بیان بھی سادہ

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

ہوتا ہے - تکلف و تصنع کو بہت کم دخل ہوتا ہے - یوں ہی کہیں کہیں لطافت خیال و حسن بیان بھولے بھٹکے نظر آجاتا ہے - تشبیہات و تمثیلات بھی عموماً سطحی ہوتی ہیں ' ان میں بعد کے زمانوں کی لطافت و نفاست نہیں پائی جاتی - اکثر جنگ و شکار کے مصطلحات استعمال کیے جاتے ہیں ' کچھہ تو اس وجہ سے کہ اس زمانے میں اِن چیزوں کا دور دورہ تھا اور کچھہ اس وجہ سے کہ محبوب خود فوجی سپاہی ہوتے تھے —

اخلاقی مضامین بھی کبھی کبھی غزل میں بیان کیے جاتے ہیں - یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے کیونکہ مولانا شبلی فرماتے ہیں " خواجہ صاحب سے پہلے غزل عشقیہ مضامین کے لیے مخصوص تھی اس کے سوا اور کوئی خیال غزل میں ادا نہیں کیا جاسکتا تھا " (شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۴۹) - ہم دیکھیں گے کہ دامان غزل خواجہ حافظ کی ولادت سے پہلے بھی اسی قدر وسیع تھا جس قدر کہ ان کی وفات کے بعد . اس وسعت کی ابتدا اسی زمانے سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی ہے —

اس دور کے اواخر میں تصوف کو لوگوں کی زندگی میں کافی دخل ہونے لگتا ہے - بہت سے صوفی شعرا پیدا ہوتے ہیں اور ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر اس مقالے کے حصہ اول میں کیا جاچکا ہے ' ان کے اقدام سے غزل کی اہمیت بڑھنے لگتی ہے - مدت دراز تک صوفی شعرا ہی بہترین غزل گو نظر آتے ہیں اور جس شاعر نے سب سے پہلے ایک مکمل دیوان غزل چھوڑا وہ ایک عظیم المرتبت صوفی بزرگ تھا ' یعنی حضرت احمد جام جن سے ہمارے دور دوم کی ابتدا ہوتی ہے - غزل نے جو اہمیت اس دور کے آخر زمانوں میں حاصل کرلی تھی اس کا ثبوت

اس امر سے ملتا ہے کہ خالص قصیدہ گو شاعر بھی اسے ممدوح کی تعریف کے لیے استعمال کرتے نظر آتے ہیں - اس بات نے اس کی اہمیت اور بڑھا دی ہوگی (مثال بعد میں مناسب موقع پر بیان کی جائے گی) —

باب دوم

عام خیال ہے کہ غزل کی ایجاد کا سہرا سعدی کے سر ہے - سرگور اوزلی Ouseley اُس مقدمے میں جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے نسخۂ دیوان حافظ مکتوبۂ میر علی کے شروع میں تحریر فرمایا ہے لکھتے ہیں (یہ مقدمہ ان کی کتاب Notices of Poets میں شامل ہے) —

The origin of lyric poetry may certainly be ascribed to Shaykh Sadi

ان کی یہ رائے متعدد فارسی مصنفین کی تحریرات پر مبنی ہے اور مشرق و مغرب کے اہل علم بالعموم اسے تسلیم کرتے ہیں - مولانا جامی بہارستان میں فرماتے ہیں "ہیچ کس پیش وے طریق غزل نورزیدہ" صاحب ریاض الشعرا یوں رقمطراز ہے * "مخترع فن غزل حضرت شیخ است چہ قبل از شیخ احدے از استادان طریقہ غزل نہ پیمودہ اگرچہ در دیوان بعضے از قدما غزلے یافت میشود' لیکن غزلیات آنہا بطریق قصیدہ است' اختصار دادہ نامش را غزل کودہ اند حالانکہ غزل گوی را طریق علحدہ است کہ مطلق مشابہت بہ طریق قصیدہ ندارد - از جملہ واضع و مخترع این فن خود شیخ اند" مخزن کے الفاظ یہ ہیں +" اشعار غزل را شیخ رونق دادہ و بانیء غزل اوست و پیش ازوے غزل بطور قصیدہ بود" اسی قسم کے الفاظ دوسرے فارسی مصنفین کی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں - انہی نے مولانا شبلی کو دھوکے میں ڈال دیا - وہ

* ص ۱۳۸ - + ص ۱۵۳ -

متعدد مقامات پر اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس وثوق کے ساتھ کہ بے اختیار ان کی ذہانت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے - ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں " غزل بھی اس وقت تک گویا قصیدہ ہی کی ایک دوسری صورت تھی - محبت عشق کے جذبات اس میں ادا نہیں کیے جاتے تھے بلکہ جس طرح مدحیہ قصائد میں ممدوح کی شجاعت ... کی مدح کرتے تھے غزل میں معشوق کے حسن اور اعضا کے اوصاف بیان کرتے تھے " (شعر العجم جلد دوم صفحہ ۹۱) - ایک اور جگہ رقمطراز ہیں "غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی، شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کیے " (شعر جلد دوم صفحہ ۹۹) - مولانا کو بحیثیت زمانہ حال کے مورخ و مبصر کے اس کی وجہ بھی دینی ضروری تھی - انگریزی مثل ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے - ادھر ضرورت محسوس ہوئی ادھر ان کے ذہن کی جدت طراز قوت خلاقی نے فوراً ایک وجہ گڑھ دی - چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "شیخ کے زمانے سے پہلے جو شعرا گزرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے " (شعر جلد دوم صفحہ ۹۹) - اس آخری جملہ کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل ہے - ایک تبسم زیر لب کافی ہے —

اس مقالے کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ مندرجہ بالا بیانات یا تو سرے سے بے بنیاد ہیں یا جہاں ان میں کسی قدر حقیقت کی جھلک ہے وہاں بے انتہا مبالغہ سے کام لیا گیا ہے - واقعہ یہ ہے کہ سعدی نے غزل پر اتنا احسان کیا اور ان کی شخصیت ایسی زبردست تھی کہ اس نے ان کے پیشروؤں اور ہم عصروں کو پس پشت ڈال دیا اور لوگوں نے حسب عادت غلو سے کام لے کے انہیں بمنزلہ بانی کے سمجھا اور اپنی رائے کی تائید میں متعدد وجوہ پیش کرنے شروع کیے جنھیں حقیقت سے کوئی

سروکار نہ تھا - جب ایک بات ایک دفعہ تسلیم کرلی گئی تو بعد کی نسلوں نے اسے بغیر کسی جرح قدح کے مان لیا - اس میں شک نہیں کہ سعدی غزل کے عظیم ترین محسنین میں ہیں - لیکن محسن ہونا ایک چیز ہے اور بانی ہونا دوسری - یہ کہنا بھی کہ سعدی نے غزل میں بجاے معشوق کے اعضا کی تعریف کے جذبات دل کو بیان کرنے کی ابتدا کی' اصلیت سے دور ہے - جیسا ہم دیکھیں گے سعدی سے پہلے بھی غزل عمیق ترین جذبات انسانی سے مملو تھی - جہاں تک اس کی ساخت کا تعلق ہے وہ شیخ کی وفات کے بعد بھی بجنسہ ویسی ہی رہی جیسی کہ ان کی ولادت سے پہلے تھی - مرأت الخیال کا یہ بیان کہ " ازعہد مصلح الدین سعدی شیرازی علیہ الرحمہ ذکر تخلص نیز لازم غزل شدہ " حقیقت پر مبنی نہیں - ہم دیکھیں گے کہ دور اول ہی میں شعرا نے تخلص کا استعمال شروع کردیا تھا - اگرچہ شروع میں یہ رسم بہت عام نہ تھی مگر رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور سعدی سے بہت پہلے استوار ہوگئی تھی - اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ سعدی نے مطلع کو لازمۂ غزل گوی قرار دیا - صاحب مخزن الغرائب لکھتا ہے (صفحہ ۱۵۳) " پیش ازوے مطلع و مقطع لازم نبودہ "- یہ بات ' ممکن ہے کہ غزل کے بہت ابتدائی زمانوں ' صحیح رہی ہو (مناسب موقع پر اس کا ذکر کیا جائیگا) مگر مطلع و مقطع دونوں سعدی سے بہت پہلے جزو غزل بن چکے تھے اس طرح سعدی نے غزل کی ساخت و ماہیت تک میں کوئی تبدیلی نہ کی اس کے بانی ہونے کا کیا ذکر —

باب سوم

(غزل کی ابتدا)

غزل کی ابتدا پر عہد قدیم کی خاموش تاریکیوں کا پردہ پڑا ہوا

ہے - جہاں تک اس کے اصل موضوع یعنی داستان حسن و عشق کا تعلق ہے ہم اسے قدیم ترین فارسی اشعار میں موجود پاتے ہیں - ایسا ہونا قدرتی امر ہے - علاوہ اس امر کے کہ ہر شاعری کا اصل موضوع عشق ہی ہوتا ہے اہل ایران کی زود مشتعل فطرت بھی اسی بات کی مقتضی تھی کہ ان کی شاعری میں یہ شعلہ بداماں جذبہ سب سے پہلے کارفرما نظر آئے —

فارسی کے قدیم ترین اشعار میں حکیم ابو حفص سُغدی سمرقندی کا یہ شعر ہے (مجمع الفصحا جلد ۱ ، صفحہ ۹۵) -

آہوے کوہی در دشت چہ گونہ دودا او نہ دارد یار بے یار چگونہ رودا

چونکہ صرف یہی ایک شعر ہم تک پہنچا ہے اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تن تنہا وجود میں آیا یا اس کے ساتھہ اور بھی اشعار تھے - ظاہر ہے کہ یہ بہ آسانی کسی پرانی غزل کا مطلع ہو سکتا ہے -

بلحاظ قدامت حنظلہ باد غیسی کے حسب ذیل دو شعر اس کے بعد آتے ہیں (لباب صفحہ ۲)

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند از بہر چشم تا نہ رسد مرو را گزند

او را سپند و آتش ناید ہمی بکار باروے ہمچو آتش و با خال چون سپند

اس کے بعد ابو سالک گورگانی کے یہ اشعار ہیں (لباب صفحہ ۳)

بہ مژہ دل ز من بدزدیدی اے بلب قاضی و بہ مژگان دزد

مزد خواہی کہ دل ز من بہ بری این شگفتی کہ دید دزد بہ مزد

یہ مثالیں اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ فارسی کے قدیم ترین اشعار بھی غزل کے اصل موضوع ہی کے متعلق تھے - جب بعد میں آل سامان اور آل سبکتگین کے زر افشاں دربار شعرا کے ملجا و ماوا بنے اور

انہوں نے زور شور کے ساتھہ قصیدہ خوانی شروع کی تو اس وقت بھی انہیں مجبوراً قصیدہ کے ابتدائی اشعار میں داستان حسن و عشق ہی چھیڑنی پڑتی تھی تاکہ ممدوح ان کے اشعار کو برغبت سنے - زبدۃ الاشعار کے الفاظ میں (صفحہ ۹۰) " نسیب غزلے باشد کہ شاعر علی الرسم ان را مقدمۂ مقصود خویش سازد تا بہ سبب میلے کہ بیشتر نفوس را بہ استماع احوال محب و محبوب و اوصاف مغازلت عاشق و معشوق باشد طبع ممدوح بشنود - آن رغبت نماید و حواس را از دیگر شواغل باز ستاند و بدین واسطہ آنچہ مقصود قصیدہ است بخاطر مجتمع و نفس مطمئن ادراک کند" - اس میں شک نہیں کہ نسیب یا تشبیب کی ابتدا عربی شعرا کی تقلید کی وجہ سے ہوئی مگر یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ فارسی شعرانے جس قدر تشبیب میں تغزل پیدا کیا وہ ان کے استادوں کے بس کی بات نہ تھی - تشبیب کے علاوہ عشق و مے پرستی کے مضامین رباعیوں، قطعوں اور مثنویوں کو بھی رونق بخشتے تھے - اس طرح جہاں تک غزل کے اصل موضوع کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس صنف سخن کے باضابطہ ظہور پذیر ہونے کے بہت پہلے سے وہ رفتہ رفتہ دوسرے اصناف سخن میں تربیت و ترقی پا رہا تھا - اسی کا نتیجہ تھا کہ غزل بہ حیثیت ایک جداگانہ اور اہم صنف سخن کے نمودار ہوئی اور جلد شاہ راہ ترقی پر گامزن ہونے لگی —

غزل کی موجودہ ساخت کی ابتدا اور ارتقا

ہمیں اس بات کا صحیح علم نہیں کہ غزل کی ابتدا کیونکر ہوئی - صاحب مجمع الفصحا رقمطراز ہے (صفحہ ۴۴)

" پس ازوے (عباس مروزی) چون دولت بہ آل طاہر و آل لیث

رسید، شعرائے عجم بنائے غزل و قطعہ و ترانہ گوی نہادند" -
ہم تک اس ابتدائی زمانے کے شعرا کا کلام اتنی مقدار میں نہیں پہنچا کہ ہم اس بیان کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کوئی رائے قائم کرسکیں - یہ امر کہ حنظلہ بادغیسی نے ایک دیوان چھوڑا تھا چہار مقالہ کے ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے "احمد بن عبداللہ الخجستانی گفت بہ بادغیس در خجستان روزے دیوان حنظلہ باد غیسی ہمی خواندم" - ہمارے پاس اس امر کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ اس دیوان میں کیا تھا - اگر مجمع الفصحا کا مندرجہ بالا بیان صحیح ہے تو اس میں شائد کچھ ٹوٹی پھوٹی غزلیں بھی رہی ہوں - اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس چند شہادتیں ایسی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غزل کسی کسی نہ صورت میں رودکی سے پہلے بھی پائی جاتی تھی —

خود رودکی کا ایک شعر لغات فرس میں حسب ذیل ہے (صفحہ ۳۲) —

دریغ مدحت چون زر و آبدار غزل کہ چابکیش نیاید ہمی بہ لفظ پدید

ابو سالک گورگانی کے بھی یہ اشعار غالباً کسی غزل کے ہیں (لباب صفحہ ۳) —

خون خود را گر بریزی بر زمیں بہ کہ آب روے ریزی در کنار

بت پرستیدن بہ از مردم پرست پند گیر و کار بند و گوش دار

ان اشعار کا ایک دوسرے سے غیر متعلق ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ غالباً کسی غزل کے جزو ہیں اور اگر صرف یہی دو اشعار مصنف نے نظم کیے تھے (جس کا امکان کم ہے) تو انہیں وہ تخم خیال کرنا چاہیے جس سے غزل کا تناور درخت پیدا ہوا —

فرالاوی کا بھی جس کی رودکی نے تعریف کی ہے ایک شعر ہے جو یا تو کسی غزل کا معلوم ہوتا ہے یا کسی بہت غزل نما تشبیب کا —

ز چشم مست تو عالم خراب است　　به بند زلف تو دلها گرفتار *

اس کے بعد شہید بلخی † کا ایک شعر لغات فرس اسدی طوسی میں ملتا ہے (صفحہ ۱۱) —

دهان دارد چو یک پسته لبان دارد به مے شسته
جهان بر من چو یک پسته بدان پسته دهان دارد

اس شعر کی بحر، اس کا لہجہ اور اس کا مضمون اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ غالباً کسی غزل کا ہے - شہید کے تین اور اشعار بھی غزل کے معلوم ہوتے ہیں (لباب صفحہ ۴) —

دانشا چوں دریغ ای از انک　　بے بہای و لیکن از تو بہاست
بے تو از خواستہ مبادم گنج　　ہم چنیں زار و اربا تو رواست
باادب را ادب سپاہ بس است　　بے ادب با ہزار کس تنہا ست

ان اشعار کا بذات خود مکمل اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ہونا ان کے جزو غزل ہونے پر دلالت کرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ خلاصۃ الافکار نے

---

* یہ شعر مجمع الفصحا کے صفحہ ۶۵ پر مندرج ہے، دوسرے تذکروں میں بھی پایا جاتا ہے - ظاہرا اس پر براؤن کی نظر نہیں پڑی ورنہ وہ فرالاوی کا ایک قطعہ مندرج کرنے کے بعد یہ نہ لکھتے کہ (The following fragment alone survives of his poems (vol. I. p. 455

† شہید بھی رودکی سے پہلے گذرا ہے - اخرالذکر اس کا بہت بڑا مداح تھا جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے —

کاروان شہید رفت از پیش　　واں ما رفتہ گیرو می اندیش
از شمار دو چشم یک تن کم　　وز شمار خرد ہزاران بیش

آخری شعر کے پہلے غزل * لکھا ہے - اگر صرف اتنے ہی اشعار مصنف نے کہے تھے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخزن الغرائب کے اس قول کے مطابق جسے ہم اوپر لکھہ آے ہیں شروع شروع میں مطلع و مقطع غزل کے لازمی اجزا شمار نہیں کیے جاتے تھے - چند مثالیں ہمیں اور بھی ایسی ملی ہیں (ان کا ذکر بعد میں کیا جاے گا) جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس ابتدای زمانے میں شاید ایسا ہی رہا ہو —

ہمارے پاس اس امر کے ثابت کرنے کے لیے کہ رودکی سے پہلے بھی غزل کسی نہ کسی صورت میں موجود تھی صرف مندرجۂ بالا اشعار ہیں - اصل سوال یہ ہے کہ وہ وجود میں کیسے آئی - آیا مثل رباعی کے وہ ایک جداگانہ صنف سخن بن کے حیز وجود میں آئی یا مولانا شبلی کے خیال کے مطابق قصیدہ کی تشبیب نے بتدریج ترقی کر کے غزل کی صورت اختیار کی -

پہلے آخرالذکر امر سے بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے - اس میں شک نہیں کہ قصیدے کی تشبیب کو ابتدائی زمانے میں اکثر غزل بھی کہتے تھے - عوفی ادیب صابر کے متعلق لکھتا ہے (لباب صفحہ۱۱۹)

"ہم او راست در مدح مجدالدین رئیس خراسان - در ہر بیتے

---

* عوفی ان اشعار کا کوئی نام نہیں دیتا ' صرف ولہٗ کہہ کے ٹال دیتا ہے ' عوفی نظموں کا نام عموماً بے تک لکھتا ہے ' کبھی تو ان نظموں کو جو صاف غزلیں ہیں صرف نظم و شعر کہتا ہے اور کبھی ان نظموں کو جو کسی غزل کے نام سے موسوم نہیں کی جاسکتیں غزل کہتا ہے مثلاً فرخی کے حسب ذیل اشعار کو غزل قرار دیتا ہے (صف ۴۹) -

شہ زاولستان محمود غازی سر گردن کشان ہفت کشور
بہ نیزہ کر گدن را بر کند شاخ بہ زوبین بشکند سیمرغ را پر

لباب ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن کے نمونے ان صفحات میں بھت جگھہ نظر آئیں گے -

از غزل سرو و یاقوت لازم دارد و در هر بیتے از مدح آفتاب و آسمان"۔
یہاں ظاہر ہے کہ لفظ غزل بمعنی تشبیب استعمال کیا گیا ہے۔ عوفی نے
سلجوقی شاعر خالد طولانی کی ایک اٹھارہ شعر کی نظم مندرج کی ہے
اور اسے غزل کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مگر اس کے حسب ذیل دو شعر
یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ در حقیقت کسی قصیدے کی تشبیب ہے
(لباب صف ۱۴۴)

من چو در مدح شہ در افشانم　　بر من از عارضم زر افشانی
شہ حسن انکہ از جلالت یافت　　تاج شاہی و تخت سلطانی

عنصری اپنے ایک قصیدے کی تشبیب کے آخر میں کہتا ہے* —

ترا کہ ماہ زمینی پس ار من انکہ کنم
تخلص از غزل تو بہ مدح شاہ زمن

ایسی مثالیں بکثرت پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان سے یہ بات تو
پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ تشبیب کو اکثر غزل بھی کہتے تھے؛ مگر
سوال یہ ہے کہ آیا یہی تشبیب بعد میں علحدہ ہو کے غزل کہلانے لگی
یا غزل جداگانہ طور پر ظہور پذیر ہوی اور تشبیب کو اس وجہ سے
غزل کہتے تھے کہ دونوں کا موضوع ایک تھا۔ ہمارے پاس جو مواد ہے
وہ اس مسئلہ کے قطعی فیصلہ کے لیے ناکافی ہے لیکن اخرالذکر امر
حسب ذیل وجوہ سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے —

مولانا شبلی کی راے کو تسلیم کرنے کے لیے اس امر کی ضرورت
ہے کہ قصیدہ غزل سے اتنے عرصے پہلے وجود میں آے کہ تشبیب کو
ارتقائی منازل طے کر کے غزل کی صورت اختیار کرنے کا وقت ملے؛ لیکن

* دیوان عنصری ایلیٹ ۱۱۴ —

صورت حال ایسی نہیں - قدیم ترین فارسی شاعر جس کا معتدبہ کلام ہم تک پہنچا ہے رودکی ہے اور وہی فارسی شاعر کا بابا آدم مانا جاتا ہے - جیسا ہم بعد میں دیکھیں گے رودکی کے وقت تک غزل نے بہ حیثیت صنف سخن کے ایک جداگانہ حیثیت حاصل کرلی تھی - خود مولانا شبلی اسے ان الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں (شعرالعجم جلد ۵ صفحہ ۲۳) —

"اس کے (رودکی کے) زمانے میں غزل کی صنف مستقلاً وجود میں آچکی تھی" رودکی سے پہلے کے اشعار اس قدر کم* تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ ان سے اس مسئلہ کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی - ان سے قصیدہ کا وجود† بھی اسی قدر ثابت ہوتا ہے جس قدر کہ غزل کا - الغرض ہمارے پاس کوئی شہادت اس امر کی نہیں کہ فارسی زبان میں قصیدہ غزل سے پہلے ظہور پذیر ہوا - برخلاف اس کے قدیم ترین زمانے سے ہم دونوں اصناف سخن کو موجود پاتے ہیں - ہاں غزل کی اہمیت بمقابلہ قصیدے کے کچھ عرصے تک کم ضرور نظر آتی ہے —

یہ سچ ہے کہ قصیدہ و تشبیب دونوں نے عربی میں موجودہ فارسی شاعری کی ابتدا سے بہت پہلے متعدد منازل ترقی و ارتقا طے کر لیے تھے - لیکن اس بات سے ہمیں اس وقت تک کوئی خاص مدد نہیں مل سکتی جب تک کہ ہم یہ نہ تسلیم کریں کہ فارسی شعرا نے جیسے ہی قصیدہ کو عربی سے لیا ویسے ہی انہوں نے یہ بھی طے کرلیا کہ وہ اپنی زبان میں

---

* ہم اس قصیدے کو جو عباس مروزی کی طرف منسوب ہے' قابل قبول نہیں خیال کرتے - پرفیسر براؤن نے اس کی اصلیت پر بجا طور سے شبہ کیا ہے -

† عوفی لباب صفحہ ۲ پر شہید بلخی کے متعلق لکھتا ہے "در قصیدہ میگوید" -

تشبیب کو ایک جداگانہ صنف سخن قرار دیں گے - اس میں کوئی شک نہیں کہ مدت دراز تک قصیدوں کی تشبیبیں اصل غزلوں سے زیادہ عمدہ غزلیں ہوتی تھیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ شعرا اپنا سارا زور قلم قصیدوں پر صرف کرتے تھے- مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان ہی تشبیبوں سے غزل پیدا ہوی —

اس سوال کا جواب بھی، کہ آیا غزل بہ حیثیت ایک جداگانہ صنف سخن کے اپنی موجودہ صورت میں شروع ہی سے پیدا ہوئی یا اس نے یہ صورت بتدریج اختیار کی، آسان نہیں - ہمارے پاس مواد اس قدر کم ہے کہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے - مگر آخرالذکر امر زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - ممکن ہے شروع شروع میں مفرد خیالات مفرد اشعار میں نظم کیے گیے ہوں - اگر یہ خیالات تھوڑے عرصہ کے اندر پیدا ہوے تو انہیں قافیہ کی فراوانی اور اس کے موسیقی اثر کی وجہ سے ہم قافیہ الفاظ اور ایک ہی بحر میں نظم کیا گیا ہو - اس کا نتیجہ ایک ایسی نظم ہوئی ہوگی جس میں چند اشعار بحر و قافیہ کی یکسانی کے رشتہ میں پروئے ہوے ہوں گے اور اس کی صورت مخزن الغرائب کی تحریر کے مطابق غزل کی اس پرانی شکل کی رہی ہوگی کہ جس میں مطلع و مقطع نہ ہوتا تھا - بعد میں قصیدہ کے اثر سے مطلع کا اضافہ کر دیا گیا ہو اور اس کے کچھہ عرصے کے بعد مقطع کا - شعراے آل سامان کی غزلوں میں مطلع و مقطع دونوں نظر آتے ہیں اگرچہ اس عہد میں وہ غالبا غزل کے لازمی اجزا نہیں خیال کیے جاتے تھے —

باب چہارم

(شعرائے آل سامان)

رودکی

جس شاعر کے کلام میں سب سے پہلی مکمل غزل پائی جاتی ہے اور جس سے موجودہ فارسی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے، رودکی ہے - وہ متفقہ طور پر فارسی زبان کا پہلا بڑا شاعر ہے - اس نے سنہ ۹۴۰ ع میں وفات پائی - کہا جاتا ہے کہ اس نے دس لاکھ سے زیادہ شعر کہے بقول رشیدی (لباب صفحہ ۷) —

شعر او را من شمردم سیزدہ صد سی ہزار
ہم فزون آید اگر چونانکہ باید بشمری

زمانے کے دست تطاول نے ان میں سے صرف چند سو اشعار باقی چھوڑے ہیں، کچھ قصیدوں کے منتخبات، کچھ قطعات رباعیات اور غزلیں - بہ حیثیت غزل گو کے اس کی عظمت کا اعتراف عنصری نے ان الفاظ میں کیا ہے - (لباب صفحہ ۶) —

غزل رودکی وار نیکو بود غزل ہائے من رودکی وار نیست

خوش قسمتی سے رودکی کے کلام میں چند خالص غزلیں پائی جاتی ہیں ورنہ اس عہد میں لفظ غزل جن وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا اس کی بنا پر ہمیں شبہ ہوتا کہ آیا عنصری کا مقصد غزل سے وہی ہے جو اب ہم سمجھتے ہیں یا صرف قصیدے کی تشبیب —

کتب خانہ باذلین میں ایک قلمی نسخہ ہے (اوزلی ایچ ۱۱۷) جس میں رودکی کا قریب قریب جملہ موجودہ کلام یک جا کر دیا گیا ہے اور مشکل اشعار کے معنی بھی سہل فارسی میں بیان کیے گیے ہیں -

نسخے پر کوئی تاریخ ترتیب مندرج نہیں، مگر مقدمے میں حسب ذیل جملہ پایا جاتا ہے " در زمانۂ ما کلیات مرزا صائب مرحوم کہ یک صد ہزار وکسرے بالابیت میشود، کس نہ نویسد "- اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ صائب کے سال وفات یعنی ۱۶۷۸ کے بعد کا لکھا ہوا ہے - اس کے علاوہ رودکی کے بہت سے اشعار اُس بیاض یعنی بتخانہ میں پائے جاتے ہیں - Ethe نے انہیں دو ذرائع سے رودکی کے موجودہ کلام کا بیشتر حصہ جمع کرکے اپنے مضمون Rudagi der Samanidendichter مطبوعہ Gottinger Nachrich 1873 میں شائع کیا ہے - ان صفحات میں ہمیں اس مضمون کا اکثر حوالہ دینا پڑے گا - مندرجہ بالا منبعوں کے علاوہ ہم نے اسدی طوسی کی لغات فرس سے بھی مدد لی ہے جو Ethe کے زیر مطالعہ نہ تھی - اس تحقیق و تلاش کا نتیجہ آیندہ صفحات میں پیش کیا جاتا ہے —

رودکی کی صرف ایک مکمل غزل ہم تک پہنچی ہے - اسے ہم درج ذیل کرتے ہیں* -

زہے فزودہ جمال تو زیب و آرا را　　شکستہ سنبل زلف تو مشک سارا را
قسم بزار دل آہن خورم کہ از سختی　　ہزار طرح نہاد است سنگ خارا را
کہ از تو ہیچ مروت طمع نمیدارم　　کہ کس ندیدہ ز سنگیں دلاں مدارا را
تو رودکی بہ غلامی قبول اگر نہ کنی　　بہ بندگی نہ پسندد ہزار دارا را

---

* اوزلی ایڈ ۲۷، فولیو ۱۴ (بی) - مولانا شبلی نے اس غزل کی اصلیت پر، اس کی زبان اور اس میں مقطع کی موجودگی کی وجہ سے شبہ ظاہر کیا ہے - جہاں تک زبان کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ رودکی کے بقیہ کلام کی زبان بھی اسی قسم کی ہے - یہی دوسرے سامانی شعرا کے کلام کا حال ہے - مقطع بھی اس زمانے کے شعرا کے کلام میں کمیاب نہیں -

اشعار ۲ اور ۳ قطعہ بند ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے اشعار کا استعمال اسی زمانے سے شروع ہوگیا تھا - جملہ خیالات سادہ و سطحی ہیں اور بغیر کسی تصنع کے بیان کر دیے گئے ہیں —

رودکی کی ایک اور غزل حسب ذیل ہے (بتخانہ ' فولیو ۲۹۹ بی) -

اے جان من از آرزوے تو رنجاں بلماے یکے روے و بہ بخشاے برین جان
دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس آسان بربائی دل و آسان بہ بری جان
نزدیک من آسانی تو باشد دشوار نزدیک تو دشواریء من باشد آسان

خیالات اور طرز ادا کی سادگی کے علاوہ ان اشعار میں کئی اور باتیں قابل توجہ ہیں - ایک تو مطلع کے قوافی کا نقص' دوسرے آخری شعر کی بحر کی ناہمواری - جملہ اشعار میں تسلسل ہے - چونکہ صرف یہی تین شعر پائے جاتے ہیں اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا وہ کسی بڑی نظم کا حصہ ہیں یا رودکی نے تین ہی کہے تھے - اگر آخر الذکر صورت ہو تو مقطع کی عدم موجودگی قابل لحاظ ہے —

تیسری غزل یہ (اوزلی ایڈ ۱۹۸ فولیو ۱۷۵) —

صرصر ہجر تو اے سرو بلند ریشۂ عمر من از بیخ بکند
پس چرا بستۂ اویم ہمہ عمر گر نہ آں زلف دوتائیست کمند
بہ یکے جان نہ تواں کرد سوال کز لب لعل تو یک بوس بہ چند
بفگند آتش اندر دل حسن انچہ ہجران بود از سینہ فگند

دوسرے شعر کی تشبیہہ قابل لحاظ ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا نے جلگی تشبیہات کا استعمال شروع کر دیا تھا - تیسرے شعر میں لطافت خیال پیدا کرنے کی کوشش کا ثبوت ملتا ہے - چوتھے شعر میں تعلق حسن و عشق پر شاعر نے فلسفیانہ نظر ڈالی ہے جو اس ابتدائی دور کے لیے خاص چیز ہے - ان اشعار کے آخر میں بھی مقطع نہیں —

اس کے بعد ان نو اشعار کی باری آتی ہے جو حسب ذیل بحر و قافیہ میں ہیں اور جن کی ترتیب مختلف نسخوں میں مختلف طور پر پائی جاتی ہے —

فغان من ہمہ زان زلف تابدار سیاہ　　کہ گاہ پردۂ لالہ و گاہ معجر ماہ

Ethe نے انہیں دو الگ الگ ٹکڑوں میں ترتیب دیا ہے اور دونوں کو غزل کے نام سے موسوم کیا ہے - پہلا ٹکڑا مذکورہ مطلع سے شروع ہوتا ہے اور اس میں چھ شعر ہیں - یہ چھ شعر نسخہ اوزلی ایڈ ۱۲۷ اور دوسرے نسخوں میں بھی پائے جاتے ہیں - یہ اشعار دیوان قطران برٹش میوزیم کے نسخہ (OR 3317) میں ملے اس لیے ہم ان سے قطع نظر کرتے ہیں - ایسا کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے ' یعنی اگر بالفرض انہیں رودکی ہی کا کلام تسلیم کیا جائے پھر بھی بھی وہ صاف طور سے کسی قصیدے کے اشعار ہیں جن کا یہاں ذکر غیر متعلق ہے - اس بحر کے بقیہ اشعار کسی اور شاعر کے کلام میں نظر نہیں آئے اور وہ '' صورت و سیرت '' میں بدیہی طور پر کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں - انہیں ہم درج ذیل کرتے ہیں - (اوزلی ایڈ فولیو ۱۵ اے) -

سماع و بادۂ رنگین و ساقیان چوں ماہ　　اگر فرشتہ ببیند ہمی رود از راہ

نظر چگونہ بدوزم کہ بہر دیدن دوست　　ز خاک من ہمہ نرگس دمد بجائے گیاہ

کسے کہ آگہی از ذوق عشق جاناں یافت　　ز خویش حیفہ بود گر دمے بود آگاہ

یہ اشعار بلحاظ خیال و بیان گزشتہ اشعار سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس عہد کے معلوم ہی نہیں ہوتے —

آخری شعر صوفیانہ انداز میں ہے اور اگر وہ واقعی رودکی ہی کا کہا ہوا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف اس ابتدائی زمانے میں بھی غزل میں داخل ہونا شروع ہوگیا تھا —

ان کے بعد وہ پانچ اشعار ہیں جن کا پہلا شعر

شاہ زی باسپاہ چشمان شاد کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد

ہے اور آخری

باد، ابر است ایں جہاں افسوس بادہ پیش آر ہر چہ بادا باد

Ethe نے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کو "شادزی باسپاہ چشمان شاد" لکھا ہے اور ان جملہ اشعار کو غزل کے نام سے موسوم کیا ہے، مگر عوفی نے شاد کی جگہ شاہ لکھا ہے اور "در قصیدہ میگوید" لکھہ کر یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ قصیدے کے اشعار ہیں - عوفی کو قدامت کا فخر حاصل ہے اس لیے ہمیں مجبوراً اس کے قول کو Ethe کی رائے پر ترجیح دے کر ان اشعار سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے - بہرحال ان میں ایک بات قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ فارسی شاعری میں 'ابو نواس' کا فلسفہ اسی عہد سے داخل ہونا شروع ہوتا ہے جس سے بعد میں خواجہ حافظ نے گنبد افلاک میں غلغلہ پیدا کردیا - رودکی کے نام سے ایک اور غزل منسوب کی جاتی ہے جس کا مطلع یہ ہے —

یک بار بود عید بہر سال بہ یک بار ہموارہ مرا عید ز دیدار تو ہموار

یہ غزل کلام رودکی کے مذکورہ بالا نسخے میں مندرج ہے اور Ethe حسب معمول اسے بغیر چوں و چرا رودکی کا کلام سمجھتا ہے - لیکن یہ غزل لفظ بلفظ دیوان امامی کے نسخہ برٹش میوزیم (OR 3713, fol. 79 b) میں موجود ہے اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں —

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ رودکی کے چند ایسے متفرق اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو صاف کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں - انہیں ہم درج ذیل کرتے ہیں —

۱ - کار بوسہ چو آب خوردن شور

چوں خوری بیش تشنہ تر گردی *

تشبیہہ کی سادگی اور آخری ادوار کے معیار نفاست کے مطابق اس کی ناخوش گواری قابل لحاظ ہے —

۲ - منم خوکردہ بربوسش چناں چوں بازپر بستہ

چناں بانگ آرم از بوسش چناں چوں بشکنی پستہ †

اس شعر میں خیال اور تشبیب کی "دھقانیت" اور زیادہ پائی جاتی ہے - زبان بھی ثقیل ہے اور غزل کے لیے قطعاً ناموزوں —

۳ - ناز اگر خوب را سزاست بہ شرط

نہ سزد جز ترا کرشمہ و ناز ‡

رودکی کی غزل گوئی کے متعلق جو کچھہ سرمایہ اس وقت تک ہمارے پاس ہے وہ پیش کیا جاچکا - فارسی شاعری کے اس ابوالآبا کا ذکر چھوڑنے سے پہلے ہم اس کی تغزل سے لبریز تشبیبوں کی ایک مثال پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے (بت خانہ فولیو ۳۳۰) —

بخند دلالہ بر صحرا بسان چہرۂ لیلیٰ

بگرید ابر بر گردوں بسان دیدۂ مجنوں

ز آب جوے ہر ساعت ہمی بوے گلاب آید

دراو شست است پنداری نگار من رخ گلگوں

---

* اوزلی ایڈ ۱۲۷ میں بجاے "چوں خوری بیش" کے "بخوری بیش" تحریر ہے - اول الذکر ریاض الشعرا کے مطابق ہے اور چونکہ اس سے زیادہ اچھے معنی نکلتے تھے اس لیے ہم نے اسے ترجیح دی -

† لغات فرس صفحہ ۴۸ -

‡ لغات فرس صفحہ ۹۲ -

اگر یک زلف بفشاند از او صد دل رها گردد

اگر یک چشم بگمارد دو صد دل را کند پر خون

ظاہر ہے کہ ان غزل نما تشبیبوں سے، خصوصاً جب وہ رودکی جیسے مسلم الثبوت استاد کی کہی ہوی ہوں، غزل کی نشو و نما میں کس قدر مدد ملی ہوگی —

ابوشعیب

رودکی کے بعد جس شاعر کی غزل ہم تک پہنچی ہے وہ ابوشعیب بن محمد ہروی ہے - عوفی نے تو اسے رودکی سے بھی پہلے کا شاعر قرار دیا ہے مگر مجمع الفصحا کے مطابق وہ رودکی کے آخری زمانے کے شاعروں میں ہے * اور ہم اسی کو زیادہ قرین قیاس سمجھتے ہیں - عوفی نے ابوشعیب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے (صفحہ ۵)

"شعر ابو شعیب لطیف و بے بدل و ذات او نادرہ غیب" - اس کے بعد لکھتا ہے "در حق ترسا بچۂ میگوید - غزل" اور حسب ذیل پانچ شعر درج کیے ہیں —

دوزخی کیشی بہشتی روے وقد آہو چشمی حلقہ زلفی لالہ خد

لب چنان کز خامۂ نقاش چین برچکد از سیم بر شنگرف مد

گربہ بخشد حسن خود برزنگیاں ترک را بیشک ز زنگ آید حسد

بیلیء آں تارک † ابریشمین بستہ بر تارے ز ابریشم عقد

از فروسو گلبج و از برسو بہشت سوزنے سیمین میان ہر دو حد

---

* آخر زمان رودکی را دریافتہ - صفحہ ۶۶ -

† براون نے "نازک" لکھا ہے - "تارک" مجمع الفصحا کے مطابق ہے اور چونکہ اس سے مقابلتاً بہتر معنی نکلتے تھے اس لیے ہم نے اسے اختیار کیا -

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے بیان میں جدت اور مبالغہ سے کلام لینے کی کوشش کی ہے مگر پھر بھی خیالات سادہ وسطحی رہ جاتے ہیں اور متاخرین کے معیار کے مطابق طفلانہ —

جوئباری

یہ بھی عہد آل سامان کا شاعر ہے - عوفی اس کے متعلق لکھتا ہے (صفحہ ۱۱) "شاعرے کامل واین غزل کہ از کعب غزل شیرین تراست از گفتہ ہاے او شنیدہ آمدہ" اس کے بعد حسب ذیل غزل درج کرتا ہے -

بہ ابر پنہاں کرد آفتاب تاباں را　　برسبزہ بنہفت ان برگ لالہ * خنداں را
بہ سوے ہر دو مہش بر دو †شاخ ریحان بود　　بشاخ مورولے پوست شاخ ریحان را
بتے کہ خستہ دلان را بدرد درمانست　　دریغ دارد ازیں درد دیدہ درمان را
بہ ابر نیسان مانم کنوں من از غم او　　سزد کہ صنعت خوبست ابر نیسان را
بہ یک گذر کہ سحر گاہ در گلستان کرد　　بہشت کرد سراسر ہمہ گلستان را

اس غزل میں بھی حسب معمول خیالات صاف و سادہ ہیں - پہلے دو شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب صنف قوی کا فرد ہے - پہلے اور چوتھے میں بحر کی نا ہمواری بھی قابل توجہ ہے —

ابوالمویدبلخی کے دو شعر محبوب کی انگلیوں کی تعریف میں ہیں جنھیں عوفی نے غزل کے نام سے موسوم کیا ہے - وہ اشعار اور عوفی کی عبارت درج ذیل ہے (لباب صفحہ ۲۶) —

"در صفت انگشت معشوقہ می گوید - غزل

---

* براون نے لالہ برگ لکھا ہے مگر میرے خیال میں برگ لالہ ہونا چاہیے -

† براون نے "برد و شاخ" لکھا ہے مگر چونکہ اس سے معنی صاف نہ نکلتے تھے اس لیے میں نے اسے "بردو شاخ" پڑھا -

انگشت را بہ خون دل من کند خضاب کفے کزو بلائے تن و جان ہر کس است
عتاب و سیم اگو نبود ہاں روا بود عنایت بر سبیکۂ سیمین او بس است

اسی طرح یہ دو شعر ابو شکور بلخی * کے بھی ہیں جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بہ آسانی کسی غزل کے ہو سکتے ہیں (لباب صفحہ ۲۱) —

از دور بدیدار تو اندر نگریستم مجروح شد آن چہرۂ پر حسن و ملاحت
وز غمزۂ تو خستہ شد آزردہ دل من وین حکم قضائیست جراحت بہ جراحت

ان اشعار سے مضمون میں جدت و لطافت پیدا کرنے کی کوشش صاف ٹپکتی ہے —

خسروانی

خسروانی بھی آل سامان کے بڑے شاعروں میں گذرا ہے - صاحب مجمع الفصحا اس کے متعلق یوں رقمطراز ہے (صفحہ ۱۹۹) "از استادان ایام سلف است واز شعرائے آل سامان - فردوسی شعرے ازاو تضمین کردہ" اس کے بعد سات شعر دیتا ہے جن میں مقطع تو ہے مگر مطلع نہیں ' جو ایک غیر معمولی بات ہے - ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہے اور صاف غزل کا معلوم ہوتا ہے - ممکن ہے مطلع کسی وجہ سے نقل نہ کیا گیا ہو - لیکن اگر یہ بات نہیں اور خسروانی نے اس غزل میں صرف یہی سات شعر کہے تھے تو ان سے بھی اس امر کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانے میں مطلع و مقطع غزل کے لازمی اجزا خیال نہیں کیے جاتے تھے - وہ اشعار حسب ذیل ہیں † —

---

* مجمع الفصحا نے ابوشکور کو رودکی کے آگے کا شاعر قرار دیا ہے مگر عوفی کی رائے اس کے خلاف ہے اور زیادہ وقیع -

† خلاصۃ الافکار نے صرف شروع کے تین شعر لکھ کے انہیں قصیدے سے منتخب بتایا ہے مگر اشعار کی نوعیت اور مقطع کی موجودگی اس امر کی تائید نہیں کرتی -

فغاں زاں درنگت بہ ہنگام صلح　　فغاں زاں شتابت بہ ہنگام جنگ
در نگم بہ راحت ہمہ زاں شتاب　　شتابم بسردن ہمہ زاں درنگ
نہنگے ست ہجران و دریاست عشق　　بہ دریا بود جاودانہ نہنگ
رخت دید نتوانم از آب چشم　　سخن گفت نتوانم از بس فرنگ
رخ تست خورشید و خورشید خاک　　لب تست یاقوت و یاقوت سنگ
نہ چون خسروانی نہ چون توبتا　　بت و برہمن وید و مشکوے وگنگ

پہلے دو شعر قطعہ بند ہیں - تیسرے سے جدت تشبید پیدا کرنے کی کوشش ظاہر ہے - آخری شعر فخریہ انداز میں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خسروانی اپنے عہد کے بڑے شاعروں میں ضرور رہا ہوگا —

دقیقی

قدامت کے لحاظ سے رودکی کے بعد فارسی کا دوسرا بڑا شاعر دقیقی ہے - اس کی اہمیت بالخصوص اس وجہ سے ہے کہ اسی نے شاہنامہ کی بنیاد ڈالی اور اس کی شاعرانہ عظمت کے سب قائل ہیں - اس بات کا ثبوت، کہ دقیقی نے ایک دیوان چھوڑا تھا، اس امر سے ملتا ہے کہ قطران ناصر خسرو سے اس کا سبق لیتا تھا * - اس کی چند غزلوں سے جو اب تک پائی جاتی ہیں اور نیز اس امر سے کہ وہ عشق و عاشقی کا دلدادہ کیا جانداد تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دیوان میں بہت سی اور غزلیں بھی رہی ہونگی - بد قسمتی سے اس کتاب کا اب پتہ نہیں چلتا - اگر کبھی مل گئی تو اس عہد کی غزل گوئی پر غالباً اس سے قابل قدر روشنی پڑے گی - دقیقی کی چند غزلیں جو مختلف تذکروں میں پائی جاتی ہیں درج ذیل کی جاتی ہیں —

* ملاحظہ ہو سفر نامہ ناصر خسرو (پیرس ایڈیشن) صفحہ ۸ -

پہلی غزل (آتشکدہ - صفحہ ۱۹۴ بی)

در افگند اے صنم ابر بہشتی جہاں را خلعت اردی بہشتی
بدان ماند کہ گوئی از مے و مشک مثال دوست بر صحرا نوشتی
ز گل بوے گلاب آید بدینساں کہ پنداری گل اندر گل سرشتی
دقیقی چار خصلت برگزیدست جہاں را از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالہ جنگ مے خوں رنگ و دین زر دہشتی

دوسرے شعر کی لطافت تشبیہہ قابل داد ہے - ایک بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ تخلص بجاے آخری شعر کے اس سے پہلے کے شعر میں پایا جاتا ہے —

دوسری غزل (لباب - صفحہ ۱۲)

کاشکے اندر جہاں شب نیستے یا* مرا ہجران آن لب نیستے
زخم عقرب نیستے بر جان من گر ورا زلف معقرب نیستے
ور نبودے کوکبش در زیر لب مونسم تا روز کوکب نیستے
ور مرکب نیستے از نیکوئی جانم از عشقش مرکب نیستے
ور مرا بے یار باید زیستن زندگانی کاش یارب نیستے

اس غزل میں ہم آہنگی و تسلسل مضامین قابل توجہ ہے - دقیقی کی زندگی کے حالات اور اس غزل کے انداز بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالباً وہ اپنے ذاتی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے - اس امر کا ثبوت اس کی مندرجہ ذیل غزل سے جو آخری غزل ہے زیادہ پر زور طریقے سے ملتا ہے (لباب صفحہ ۱۲ - ۳)-

---

* لباب میں بجاے " یا " کے " تا " ہے - مگر چونکہ اول الذکر سے زیادہ اچھے معنی نکلتے تھے اس لیے ہم نے اسے اختیار کیا —

اے ابر بہمنی نہ بچشم من اندری　　دم زن زمانکے و بر آسائے کم گری
این روز و شب گریستن زار بہر چیست　　نے چون منی غریب و غم عشق برسری
دردا جدا بماندم و در غم ز عشق یار　　من زین تونگرم کہ مباد این تونگری
یارے گزیدم از ہمہ خلقاں پری نژاد　　زاں شد ز پیش چشم من امروز چون پری
لشکر برفت وں بت لشکر شکن برفت　　ہرگز مباد کس کہ دہد دل بہ لشکری

آخری شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ معشوق صاف قوی کارکن ہے اور سپاہی بچہ —

دقیقی کی غزلیں اس کے پہلے کے شعرا کی غزلوں سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ ہیں - ان میں مقابلتاً اظہار جذبات زیادہ ہے ' خیالات میں زیادہ لطافت ہے اور انداز بیان میں زیادہ نفاست —

عمارہ

عہد آل سامان کا آخری شاعر جس نے غالباً غزلیں کہی تھیں اور جو اس عہد کو عہد غزنویہ سے ملاتا ہے ' عمارہ ہے - ہمیں اس کی کوئی غزل نہیں ملی مگر بہارستان میں مولانا جامی کے یہ الفاظ اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ضرور غزل کہتا تھا - " در مقالات شیخ ابو سعید ابوالخیر مذکور است کہ روزے قوال در پیش ایشان این بیت بخواند —

اندر غزل خویش نہاں خواہم گشتن
تا بر لب تو بوسہ زنم چونش بخوانی

شیخ را وقت خوش آمد - پرسید کہ این شعر کیست - گفتند عمارہ "

اس شعر میں خود ندرت و لطافت ہے - اس کی خوبی اور نیز یہ امر کہ قوال اسے شیخ ابو سعید کے سامنے گا رہا تھا اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ عمارہ اپنے زمانے کا مقبول عام شاعر تھا اور غزلیں محفل سماع

میں گائی جانے لگی تھیں - عوفی نے اس کی شاعرانہ عظمت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے (لباب - صفحہ ۲۴) " شعرائے عصر آخر او را مقتدائے خود دانستند " - اب ہم عہد آل سبکتگین میں قدم رکھتے ہیں جہاں ہم اپنے کو پہلے کی طرح پادر ہوا نہیں پاتے اور جہاں ہمیں اپنے موضوع کے متعلق مقابلتاً بہت کافی ذخیرہ ملتا ہے —

باب پنجم

(شعرائے آل سبکتگین *)

فردوسی سنہ ۱۰۲۵ ع

فردوسی نہ محض فارسی کے عظیم ترین شاعروں میں ہے بلکہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں کی صف اول میں اس کی جگہ ہے - اسے حسن و عشق کے موضوع سے جو قدرتی لگاؤ تھا اس کا ثبوت شاہنامے کے ان حصوں سے ملتا ہے جن میں اس نے یہ دلچسپ داستان چھیڑی ہے ' مثلاً زال و رودابہ اور بیژن و منیژہ کے قصے - اِس کے علاوہ اس نے اس موضوع پر ایک مستقل مثنوی ' یوسف و زلیخا ' بھی تصنیف کی ' اس سے اور نیز اس امر سے کہ اس کی ایک آدھ غزلیں اب بھی پائی جاتی ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے غالباً کافی تعداد میں غزلیں کہی ہوں گی ' اس کی ایک غزل نمونتاً درج ذیل کی جاتی ہے † —

---

* ان ابواب میں شعرا کا ذکر تاریخ وفات کی تدامت کے لحاظ سے کیا جائے گا -

† تاریخ گزیدہ اور مخزن الغرائب میں مندرج ہے ' براؤن نے اسے J. R. A. S. بابت جنوری سنہ ۱۹۰۱ ع کے صفحہ ۸ پر شائع کیا ' مخزن الغرائب میں فردوسی کی ایک اور غزل کے چند اشعار اس بحر میں پائے جاتے ہیں -

اگر بدکنی کیفرش خود بری نہ چشم زمانہ بخواب اندرست

شبے دربرت گربہ آسودمے　　سر از فخر بر آسماں سودمے
قلم در کف تیر بشکستے　　کلاہ از سر مہر بربودمے
بقدر از نہم چرخ بگذشتمے　　بہ پے فرق کیواں بفرسودمے
جمال تو گر زانکہ من دارمے　　بجائے تو گر زانکہ من بودمے *
بہ بیچارگان رحمت آوردمے　　بہ درماندگان بر بہ بخشودمے

اس غزل میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں، ایک تو اس کا تسلسل، دوسرے آخری شعر کے آخری مصرعے کی زبان - زائد 'بر' کا استعمال مثنوی میں تو جائز ہے مگر غزل کے لیے نازیبا ہے - اس کی موجودگی فردوسی کی مثنوی نویسی کی عادت کے علاوہ اس وجہ سے بھی ہے کہ اس ابتدائی عہد میں غزل کی مناسب زبان پیدا نہیں ہوئی تھی لہذا اس قسم کی خامیاں ان ابتدائی عہدوں میں کمیاب نہیں -

فرخی

فرخی کے دیوان کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم میں موجود ہیں † دونوں طبع ہوچکے ہیں - اول الذکر کو محمد مہدی بن مصطفی مخلص طہرانی نے شائع کیا اور آخر الذکر کو رضا قلی خاں ہدایت نے - رضا قلی خاں کتاب کے مقدمے میں لکھتا ہے :

"دو دیوان اشعار اورا بدست آوردہ یکے سہ ہزار بیت و یکے نُہ ہزار بیت - لیکن درست تمام او خواندہ نمی شد، لہذا قریب دو ہزار و پانصد بیت از آنہا انتخاب کردہ نوشتہ شد"

رضا قلی خاں کا نسخہ مخلص کے نسخے سے زیادہ مفصل ہے - اس

---

* یہ مصرع تاریخ گزیدہ کے نسخہ بادلین (Ch : 8) میں نہیں پایا جاتا -

† نمبر ۲۰۳ و ۲۰۴ -

میں چھ غزلیں ہیں اور مخلص کے نسخے میں تین - اس بات کا ثبوت کہ فرخی نے چھ سے زیادہ غزلیں کہی تھیں رضا قلی خاں کے مندرجہ بالا بیان کے علاوہ حسب ذیل امور سے بھی ملتا ہے - اگرچہ مخلص کے نسخے میں صرف تین ہی غزلیں ہیں مگر پھر بھی ان میں سے دو رضا قلی خاں کے نسخے میں نہیں پائی جاتیں - ایک غزل لباب میں موجود ہے جو مذکورہ بالا نسخوں میں نہیں - یہی حال ان متفرق اشعار کا ہے جو مختلف تذکروں میں پائے جاتے ہیں اور جو بظاہر غزل کے معلوم ہوتے ہیں -

فرخی کی شاعرانہ عظمت سب تسلیم کرتے ہیں - وہ عظیم ترین قصیدہ گویوں میں ہے اور اس کے قصیدوں میں اپنے جملہ ہم عصروں سے زیادہ تغزل پایا جاتا ہے - صاحب مجمع الفصحا رقمطراز ہے (صفحہ ۴۳۹)

"الحاصل حکیم فرخی را در شاعری طرزے مرغوب است و تغزلات شیریں عاشقانہ مسرت انگیز دارد - سخن وے سہل ممتنع است" —

اس امر کا سب سے بڑا ثبوت کہ فرخی کے تغزل کے اس کے ہمعصر بھی قائل تھے عنصری کے اس شعر سے ملتا ہے * —

خارج شود ز نعت خطت طبع عنصری
عاجز شود ز وصف لبت و هم فرخی

عنصری نہ محض فرخی کے عظیم ترین ہمعصروں میں تھا بلکہ دربار محمودی کا ملک الشعرا بھی تھا - فرخی بھی اسی دربار کا شاعر تھا اس لیے جذبۂ رقابت و خوف مسابقت قدرتی امر تھا - ایسی حالت

* دیوان عنصری ایلیٹ ۱۱۴ - دیوان کے دوسرے نسخے (۱۴۷۹۷ - سی - ۸) میں یہ شعر یوں ہے
خارج شود ز نعت لبت طبع عنصری عاجز شود ز وصف خطت و هم فرخی

میں عنصری کا اپنے قصیدے میں فرخی کے کمال تغزل کا اعتراف کرنا اس کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے -

فرخی پر رنگ تغزل اس قدر غالب ہے کہ اس کے قصائد در حقیقت طویل غزلیں ہوتی ہیں - اس کی تشبیبیں اتنی لطیف ہیں کہ ان میں سے ایک کا یہاں مثالاً نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا -

خوشا عاشقی خاصہ وقت جوانی　　خوشا با پری چہرگان کامرانی
خوشا با رفیقان یکدل نشستن　　بہم نوش کردن مے ارغوانی
بوقت جوانی بکن عیش زیرا　　کہ ہنگام پیری بود ناتوانی
جوانی و از عشق پرہیز کردن　　چہ باشد نہ دانی بجز جانگرانی
جوانے کہ پیوستہ عاشق نہ باشد　　دریغ است از روزگار جوانی
در شادمانی بود عشق خوباں　　بباید کشادن در شادمانی
در شادمانی کشا دست بر تو　　کہ خدمت گر شہر یار جہانی

ان اشعار اور گریز کی تعریف محتاج بیان نہیں —

فرخی کے کلام میں ہمیں خوش قسمتی سے ایک ایسی مثال ملی جو اس کے میلان تغزل اور اس اہمیت کو جو غزل نے اس زمانے میں حاصل کرلی تھی، نہایت خوبی سے ظاہر کرتی ہے - اپنے ایک قصیدے میں کہتا ہے —

خوش بگوش آید شعر یکہ در ان شعر بود　　مدحت خسروے با نعت رخے ہم چو قمر
مطربا آن غزل نغز و دلاویز بیار　　ورنہ دانی بشنو تا غزلے گویم زر
اے در یغا دل من کاں صنم سیمیں بر　　دل من برد و مرا از دل او نیست خبر
او دلے داشت گرامی وولے دیگر یافت　　کاش کے من دلکے یافتمے نیز دگر
دل فروشان خراساں را بازار کجاست　　تا دلے یابم ازیشاں چو دل خویش مگر

اندریں شہر کسے را دل افزونی نیست ور بود و نیز ھمانا نہ فرشند بہ زر
ھرکہ او نزد بتاں گشت چو من بیدل شد حال از ینگونہ است اینجا حذر اے قوم حذر

ان اشعا کے بعد اصل قصیدہ پھر شروع ھوتا ھے - اوپر کی مثال میں حسب ذیل امور قابل توجہ ھیں —

(الف) قصیدہ کی ابتدا اس غزل سے نہیں ھوتی اس لیے اس پر تشبیب کا گماں نہیں کیا جا سکتا —

(ب) اسے خود شاعر نے غزل کے نام سے موسوم کیا ھے اور اس کی ابتدا مطلع سے ھوتی ھے - چونکہ یہ وسط قصیدہ میں واقع ھے اس لیے مطلع کا اس جگہ ھونا اس غزل کو قصیدے سے الگ کر دیتا ھے اور اس امر کو ثابت کرتا ھے کہ اس زمانے میں غزل نے جداگانہ صلف سخن کی صورت اختیار کر لی تھی اور مطلع جزو غزل سمجھا جانے لگا تھا —

(ج) غزل مسلسل ھے —

فرخی کی مطبوعہ غزلوں کی تعداد نو ھے - اس مقالے کے حدود اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ھم ان سب سے بحث کریں ' اس لیے ھم ایک مکمل غزل اور ایک کا انتخاب پیش کرنے پر اکتفا کرتے ھیں —

غزل

اے دوستی نمودہ وپھوستہ دشمنی در شرط من نبود کہ با من توایں کنی
دل پیش من نہادہ بقرد وئی مرا آگہ نبودہ ام کہ ھمی دانہ افگنی
پنداشتم ھمی کہ دل از دوستی دھی بر تو گماں کہ برد کہ تو دشمن منی
دادن دل تو ازپئے آں بود تا مرا اندر فریبی و دل از جاے بر کنی
کشتی مرا بدوستی و کس نہ کشتہ بود زین زار تر کسے را ھرگز بہ دشمنی

بستی بہ مہربا دل من چند بار عہد از چون توے سزد کہ کنوں عہد بشکنی

یہ غزل بھی مثل فرخی کی اور غزلوں کے مسلسل ھے - اس میں جس قسم کے جذبات کا اظہار ھے ان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں مگر وہ متاخرین کے معیار عشق و محبت کے منافی ھیں اور اس لیے ان کے کلام میں مفقود - یہ بات فرخی کی اور غزلوں میں بھی ھے - حسب ذیل اشعار سے جو اس کی ایک دوسری غزل سے منتخب کیے گئے ھیں، اس امر کا مزید ثبوت ملتا ھے —

کوے تو جایگاہ فتنہ شدہ است　　بر ہر کوے تو قدم نہ نہم

دوستاں از فراق تو خوں دل　　من ہمی از وصال تو خرم

فرخی حیلۂ بباید کرد　　تا از اں شوخ سنگ دل برہم

ان اشعار میں جو خیالات ادا کیے گئے ھیں وہ متاخرین کے مذھب عشق میں کفر ھیں - ان کے نزدیک عاشق صادق ھمیشہ ناکام نامراد رھتا ھے - شاد کامی و خوش بختی ھمیشہ رقیب روسیاہ کا حصہ سمجھی جاتی ھے - باوجود معشوق کی انتہائی جفا کاریوں کے عاشق ناکام راہ وفا سے ملہ نہیں موڑتا بلکہ "سرور تپ غم" بیان کرنے کے لیے "ھر موے بدن زبان سپاس" بن جاتا ھے - اس کی زبان سے معاذاللہ نکل سکتا ھے "فرخی حیلۂ بباید کرد" - ان اشعار میں جن جذبات کا ذکر کیا گیا ھے وہ متاخرین کے معیار سے گرے ھوے سہی مگر وہ اس بات کو ثابت کرتے ھیں کہ شعرا اس عہد میں جو خود محسوس کرتے تھے اسے اپنے اشعار میں بیان کرتے تھے اور متاخرین ایک خیالی و رسمی دنیا میں رھتے تھے جسے اصلیت سے بہت کم کم سروکار تھا - ان اشعار میں دو باتیں اور قابل توجہ ھیں (الف) ان

اشعار میں تسلسل نہیں بلکہ یک گونہ تضاد پایا جاتا ہے - اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلسل غزلیں اس زمانے میں زیادہ رائج تھیں تاہم غیر مسلسل غزلیں بھی کہی جاتی تھیں —

(ب) آخر شعر میں تخلص پایا جاتا ہے - یہ بات فرخی کی اور غزلوں میں بھی پائی جاتی ہے - یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ مقطع کا استعمال عام ہونا شروع ہوگیا تھا —

فرخی کی رباعیاں بھی تغزل سے لبریز ہوتی ہیں - ہم ان میں سے دو نمونتاً درج ذیل کرتے ہیں * —

گویند کہ معشوق تو زشت ست و سیاہ
گر زشت و سیاہ ست سوانیست گناہ
من عاشقم و دل بر او گشتہ تباہ
عاشق نشود ز عیب معشوق آگاہ

تا در طلب دوست ہمی بشتابم عمرم بکراں رسید و من در خوابم
گیرم کہ وصال دوست درخواہم یافت ایں عمر گذشتہ را کجا دریابم

کسائی

کسائی بھی اس عہد کے بڑے شاعروں میں گذرا ہے - اس نے بھی کچھ غزلیں ضرور کہی تھیں - عوفی نے کسائی کو بڑی اہمیت دی ہے اور اپنی کتاب کے پانچ صفحوں میں اس کا ذکر کیا ہے - صاحب چہار مقالہ بھی اس کا شمار ان شاعروں میں کرتا ہے جن کی وجہ سے ان کے ممدوح کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا - ناصر خسرو جیسا عظیم المرتبت شخص بھی اپنے کلام

* ریاض صفحہ ۲۵۴ -

میں اس کا بار بار حوالہ دیتا ہے * —

بد قسمتی سے کسائی کا کلام زیادہ نہیں پایا جاتا - حسب ذیل غزل اس / تغزل کا عمدہ نمونہ ہے † —

اے زعکس رخ تو آئینہ ماہ　　شاہ حسنی و عاشقانت سپاہ
ہر کجا بنگری دمد نرگس　　ہر کجا بگذری بر آید ماہ
روے و موے تو نامۂ خوبیست　　چہ بود نامہ جز سفید و سیاہ
بلب و چشم راحتی و بلا　　بہ رخ و زلف توبہ و گناہ
دست ظالم ز سیم کوتہ بہ　　اے بہ رخ سیم زلف کن کوتاہ

مطلع کے دوسرے مصرعے میں کی تشبیہ جنگی زندگی کے اثر کو ظاہر کرتی ہے - اس کی مثالیں بعد میں بکثرت ملیں گی - تشبیہ و طرز ادا

---

* Ethe کے نزدیک یہ حوالہ جات کسائی کی تصحیف کی غرض سے ہیں اور وہ انہیں جذبۂ رشک اور اختلاف عقائد کا نتیجہ خیال کرتا ہے - براؤن کی راے بجا طور پر اس کے خلاف ہے کیونکہ یہ حوالہ جات در حقیقت توصیفی ہیں - مگر عجیب بات یہ ہے کہ براؤن انہیں توصیفی خیال کرنے کے باوجود کسائی کے ساتھہ ناصر خسرو کے اختلاف کے وجوہ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ Ethe کے بتاے ہوے وجوہ سے مختلف تھے - ہمارے نزدیک ناصر خسرو نے کسائی کا بار بار حوالہ اس وجہ سے نہیں دیا کہ اسے اس کے ساتھہ کوئی عناد تھا بلکہ اس وجہ سے کہ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں - عوفی کسائی کے متعلق لکھتا ہے " اکثر اشعار او در زهد و عبادت " اور یہی خصوصیت ناصر خسرو کے کلام کی بھی ہے - ذیل کے اشعار متذکرہ بالا حوالہ جات کی عمدہ مثال ہیں (از بت خانہ) -

سوے شعر حجت در آ اے پسر　　(حجت ناصر خسرو کا تخلص تھا)
اگر هیچ در خاطر تو رضا ست
کہ دیباے رومی ست اشعار من
اگر شعر فاضل کسای کسا ست

† لباب صفحہ ۳۷ - عوفی حسب دستور اسے شعر کہتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ خالص غزل ہے -

میں لطافت پیدا کرنے کی کوشش ان اشعار سے ظاہر ہے اگرچہ خیالات ابھی تک سطحی ہیں —

بو علی سینا سنہ ۱۰۳۷

حکیم اعظم بو علی سینا کی بھی دو غزلیں ہمیں ملیں - ظاہر ہے کہ حکیم موصوف نے صرف یہی دو غزلیں نہ کہی ہوں گی - بو علی سینا جیسی عظیم المرتبت ہستی کی غزل سرائی کی وجہ سے اس صنف سخن کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہوگی وہ محتاج بیان نہیں - Ethe نے انہیں Gottinger Nachrichten (1875) میں شائع کیا ہے - پہلی غزل کے بجائے گیارہ شعروں کے Ethe نے صرف سات شعر دیے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے زیر مطالعہ صرف نسخہ ایلیٹ ۲۹۴ تھا - نسخہ اوزلی ایڈ ۶۹ میں تین شعر اور مندرج ہیں - آتشکدہ میں ایک اور شعر ہے - مکمل غزل حسب ذیل ہے —

غذائے روح بود بادۂ رحیق الحق * | کہ رنگ او کند از دور رنگ گل را فق†
بہ طعم تلخ چو پند پدر ولیک مفید | بہ نزد مبطل باطل بہ نزد دانا حق
سہیل ‡ بالش و خورشید فرومہ طاعت | بہ بوز عنبر و مشک و گلاب بردہ سبق
حلال بر عقلا و حرام بر جہال | کہ مے مضحک بود و خیر و شر از و مشتق
حلال گشتہ بہ احکام عقل بر دانا | حرام گشتہ بہ فتوائے شرع بر احمق
شراب را چہ گنہ زانکہ ابلہے بخورد | بہ سوے تیرہ برد دست یا سوے حق
§ چو در چکد زدہان ظروف در کاسہ | زلحن بالبدی خوشتر است آں لق لق

* الحق - ایلیٹ ۲۹۴ صفحہ ۹۸ - نے اس کی تقلید کی ہے -
† کہ بکند دور رنگ گل راشق - ایضاً
‡ صرف اوزلی ایڈ ۶۹ صفحہ ۴۹۵ میں -
§ ایضاً

* غلام آں مے تابم کہ از رخ خوباں　　بہ یک دوکاسہ بگیرد ہزار گونہ عرق
مے از جہالت جہال شد بہ شرع حرام　　چو ماہ کز سبب منکران دیں شد شق
† بدار خدائے کہ جزوے دگر خدائے نیست　　کہ مے چوں مے خورم اجزائے من بگیرد حق
چو بو علی مئے صاف ‡ ارخوری حکیمانہ　　بحق حق کہ وجودت شود بہ حق ملحق $

اس غزل میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں ایک تو مطلع و مقطع دونوں کی موجودگی، دوسرے تسلسل - شعر نمبر ۸ کی لطافت قابل داد ہے -

دوسری غزل چھے شعر کی ہے - یہ بھی مسلسل ہے - اس میں مطلع ہے مگر مقطع نہیں - غزل بحیثیت مجموعی خشک ہے اور اخلاقی مضامین سے مملو - ہم اسے درج ذیل کرتے ہیں (ایلیٹ ۲۹۲ - فولیو ۱۶۳ بی) —

حرامست دہ چیز بر راہ مرد　　کزاں شش بود مرد آزادہ فرد
حسد بردن و سفلگی و دروغ　　نمودن نیاز و ضعیفی و درد
چو نعمت بود دست بر دوستاں　　بباید کشودن بداد و بخورد
چو شدت بود راز پیدا مکن　　بہل تا شود رویت از درد زرد
سوالے نیرزد سراسر جہاں　　چہ فرجام باشد یکے آہ سرد
اجل نرد بازست و ما مہرہ ایم　　فلک کعبتین و جہاں تخت نرد

فضائری سنہ ۱۰۳۵

فضائری بھی اس عہد کے بڑے شاعروں میں ہے - وہ عنصری کا زبردست مد قابل تھا یہاں تک کہ آخر الذکر نے ایک دن انتہائی برہمی کی حالت میں اس کے دیوان کو اس کی موجودگی میں دھودھا برابر

---

* صرف اوزلی ایڈ ۶۹ صفحہ ۴۹۵ میں -
† آتشکدہ صفحہ ۱۷۵
‡ ناب - ایضاً -
$ حق مطلق ایضاً

کیا * - اس لیے غضائری کے اشعار بہت کم ملتے ہیں - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے عہد کے عمدہ غزل گویوں میں تھا - اس نے ایک بار محمود کی فرمائش پر ایاز کی تعریف میں ایک غزل لکھی اور انعام سلطانی سے مالا مال ہوا - اس کے شعر میں اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے —

ہزار برد و ہزار دگر ملک افزود بہ یک غزل کہ زمن خواست پر لطایف غزال

بدقسمتی سے ہمیں اس کی کوئی غزل نہیں ملی † اس لیے ہم اس کے ذکر کو یہیں چھوڑتے ہیں اور اس کے حریف عنصری کا ذکر کرتے ہیں —

عنصری سنہ ۱۰۴۰

عنصری دربار کا ملک الشعرا تھا اس لیے اس کی اہمیت محتاج بیان نہیں - اس زمانے کے دستور اور اپنے پیشہ کے مطابق عنصری کا زیادہ وقت قصیدہ خوانی میں گزرا - کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک عشقیہ مثنوی موسوم بہ وامق وعذرا بھی تصنیف کی تھی —

بتخانے میں اس کی چار غزلیں مندرج ہیں - باقلین میں اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ (ایلیٹ ۴۱) ہے جس میں تیرہ غزلیں ہیں - ان تیرہ غزلوں میں بتخانے کی جملہ غزلیں شامل ہیں - اس کے دیوان

---

* مجمع الفصحا (صفحہ ۳۶۸) کے الفاظ حسب ذیل ہیں" بالآخر کار بجائے رسید کہ بعد از ملاقات و مباحثات دیوان اورا گرفتہ در حضوروے فروشست و بر درید لہذا شعرش باقی نماند "-

† عوفی اس کے حسب ذیل دو اشعار کو غزل کہتا ہے (صفحہ ۵۹) -

مطربے خوبروے و بربط او چو یکے کوز پشت عاشق پیر
نالۂ شیر خوار دارد لیک بکنار اندروں نہ خواہد شیر

مگر ظاہر ہے کہ یہ غزل کے اشعار نہیں -

کے ایک مطبوعہ نسخے میں (۱۴۷۹۷ - سی - ۸ - ہم اسے آئندہ صرف سی - ۸ کہیں گے) صرف پانچ غزلیں ہیں اور ایک دوسرے مطبوعہ نسخے میں (۱۴۷۹۷ - سی - ۱۲ ہم اسے آئندہ صرف سی - ۱۲ کہیں گے) صرف تین - مگر یہ جملہ غزلیں متذکرہ بالا قلمی نسخے میں پائی جاتی ہیں - اس طرح عنصری کی موجودہ غزلوں کی تعداد صرف تیرہ رہتی ہے - ہم ان میں سے چند کا ذکر یہاں کریں گے —

اس کی ایک غزل ہے (بت خانہ اور ایلیٹ ۱۱۴) —

سر زلف مشکین جانان من مرا کشت و پیچید بر جان من
بیا ترک سیمیں تن و سنگدل هویدا به تو راز پنهان من
به فرمان من باش تا برخوری ترا بد نه آید ز فرمان من
نه گردم ز پیمان تو من به دل مگرداں تو دل راز پیمان من

آخرالذکر دو شعر اپنے مضمون کی وجہ سے قابل توجہ ہیں - جیسا ہم اوپر بیان کرچکے ہیں حضرت عاشق کی یہ معشوق نوازی اور معشوق کو تابع فرمان سمجھنے کے اس سے تعمیل ارشاد کی امید رکھنی ' جو اس عہد کی شاعری میں اکثر پائی جاتی ہے ' اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ یہ شاعری بہ مقابلہ زمانہ ما بعد کی شاعری کے حقیقت سے قریب تر تھی -

عنصری کا ایک اور غزل کا مطلع ہے (بت خانہ اور ایلیٹ ۱۱۴)

به مجلس اندر کان بت مرا شراب دهد به من شراب و بد خواه من عذاب دهد

بھلا یہ خوش قسمتی بعد کے اس عاشق کو جو بدقسمتی سے شاعر بھی ہو ' کہاں نصیب -

شاعر کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ یوں تو عاشق ہر زمانے ہی میں خوش قسمت و بد قسمت ہوتے آئے ہیں اور رہیں گے ' مگر شاعر کے لیے عاشق

ناکام بننا لازمی ہے، چاہے وہ بذاتہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔

عنصری کی ایک غزل صنعت ذو قافیتین میں بھی ہے - یہ صنعت ان ابتدائی دوروں میں قصیدہ گو شعرا کو بہت پسند تھی - اسی کا اثر ہے کہ عنصری نے، جو در حقیقت ایک قصیدہ گو تھا، اسے غزل میں بھی استعمال کیا۔ ہم اس غزل کے صرف تین شعر نمونتاً درج ذیل کرتے ہیں - (بت خانہ وایلیت ۱۱۴)۔

فغاں زاں پری چہرہ عیار یار — کہ با منش دائم بہ پیکار کار
دھانے چو یک نار دانہ دونیم — مرا ہست در دل ازاں نار نار
دو زلف سیاہش بماند بداں — کہ دوزاغ دارد بہ منقار قار

آخری شعر کی تشبیہہ قابل توجہ ہے - اس کی ثقالت متاخرین کے مذاق لطافت پر بار ہوگی - اتنے ابتدائی عہد میں اس مشکل صنعت میں غزل کا پایا جانا اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ قصیدہ کا تصنع اسی زمانے سے غزل میں داخل ہونا شروع ہوگیا تھا —

حسب ذیل اشعار اس کی ایک اور غزل سے منتخب ہیں (دیوان - سی - ۸) —

بہ گرد ماہ برار غالیہ حصار کہ کرد — بہ روے روز براز تیرہ شب نگار کہ کرد
بہ ماہ مانی آنگہ کہ تو سوار شوی — چگونہ اے عجبی ماہ را سوار کہ کرد

یہ اشعار صاف طور سے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا معشوق "تازھی باز" ہے اور اس لیے صلف قری کا فرد۔ مطلع کے دونوں مصرعوں میں "بر" کا زائد استعمال قابل لحاظ ہے —

عنصری کی ایک غزل کا شعر ہے * —

---

* سی - ۱۲ - یہ شعر سی - ۸ میں نامکمل درج ہے - پہلے مصرعے میں "است لیکن" اور دوسرے مصرعے میں "موزن" چھوٹ گیا ہے -

دولب چون دانہ نارست لیکن　　بہ نوک سوزن اندیشہ سفتہ

یہ تشبیہ اس کے ایک اور شعر میں پائی جاتی ہے جو اوپر درج کیا جاچکا ہے - لیکن اس شعر میں شاعر نے پہلے سے بہت زیادہ بلند پروازی کی کوشش کی ہے - یہی بلند پروازی اور مبالغہ ہے جس نے رفتہ رفتہ ترقی کرکے دور پنجم میں شاعری کو حقیقت سے کوسوں دور پھینک دیا اور اسے چیستان و معمہ بنا دیا —

عنصری کی غزلیں عموماً مسلسل ہوتی ہیں - ہر غزل میں مطلع ہے، اگرچہ مقطع نہیں - ان میں کوئی خاص خوبی نہیں اور وہ اس عہد کے دوسرے بلند پایہ شعرا کی غزلوں سے یقیناً کم رتبہ ہیں —

رابعہ بنت کعب

اب ہم ایران کی پہلی شاعرہ * یعنی رابعہ بنت کعب کا ذکر کرتے ہیں - اس کا قریب قریب جملہ کلام غزلوں پر مشتمل ہے اور سب نہایت بلند پایہ ہیں - تاریخ غزل گوئی میں اس کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے ہم اس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتے ہیں —

اس کے عہد شاعری کے متعلق کافی اختلاف رائے ہے - صاحب مجمع الفصحا رضاقلی خاں نے اس کی زندگی کے متعلق ایک طویل نظم لکھی ہے اور اس وجہ سے اس کی رائے اس موضوع پر قابل استناد سمجھی جاتی ہے - اس اس کے نزدیک رابعہ رودکی کی ہمعصر تھی † - برخلاف اس کے عوفی

---

* بڑا تعجب ہے کہ اگرچہ براؤن رابعہ کا ذکر اپنی کتاب میں دو جگہ کرتا ہے (صفحہ ۱۱۶ اور ۱۵۷) مگر پھر بھی جب مہستی کا ذکر کرتا ہے جو عہد سنجر کی شاعرہ تھی تو لکھتا ہے It would be unchivalrous to pass over in silence the first persian poetess that we have yet come across (P. 334 vol. II.) -

† " معاصرآں سامان و رودکی بودہ " صفحہ ۲۲۱ -

اسکا شمار عہد غزنویہ کے آخری دور کے شعرا میں کرتا ہے * - علاوہ اس وزن کے جو عوفی کی رائے کو بوجہ قدامت کے حاصل ہے خود رابعہ کا کلام ایسا ہے کہ ہم رضاقلی خاں کی رائے کو بغیرشبہ کی نظر سے دیکھ نہیں رہ سکتے - لیکن ہمیں عوفی سے بھی اتفاق رائے نہیں - مولانا جامی نے نفحات الانس † میں شیخ ابو سعید ابوالخیر کو، جن کی وفات سنہ ۴۹ ۱۰ ع میں ہوئی، رابعہ کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے دکھایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھہ عرصہ پہلے قیدہستی کو ترک کر چکی تھی - ان باتوں کو دیکھتے ہوئے اگر ہم اسے اس عہد کی شاعرہ تسلیم کریں تو زیادہ غلط نہ ہوگا —

عوفی اس کے متعلق لکھتا ہے (لباب صفحہ ۶۱) —

"اگرچہ زن بود اما بفضل بہ مردمان جہان بخندیدے - فارس هردو میدان و والی هر دو بیان - بر نظم تازی قادر و در شعر پارسی بغایت ماهر و بافایت ذکائے خاطر و حدت طبع پیوسطه عشق باختے و شاهد بازی کردے" —

صاحب مجمع الفصحا رقمطراز ہے (صفحہ ۲۲۲) -

"اورا میلے بہ یکتاش نامی غلامے از غلامان برادر خود بہمر سیدہ و انجامش بہ عشق حقیقی کشیدہ" -

یہی وجہ ہے کہ مولانا جامی نے رابعہ کو اپنے تذکرۃ الاولیا یعنی نفحات میں جگہ دی ہے اور اس کے متعلق حضرت شیخ ابوالخیر کا یہ

---

* لباب صفحہ ۶۱ -

† صفحہ ۷۳۲

قول نقل کیا ہے * —

" سخنے کہ او گفتہ است نہ چنانست کہ کسے را در مخلوق افتادہ باشد "

چونکہ عشق نے اسے آتش بجان کر دیا تھا اس لیے اس کے کلام میں بھی اس دھکتی ہوئی آگ کی گرمی پائی جاتی ہے - اس کی غزلیں صداقت جذبات و سوز و گداز سے لبریز ہیں - افسوس کہ ہمیں اس کی صرف چار غزلیں مل سکیں اور ایک اور غزل کے دو شعر - اس کی پہلی غزل حسب ذیل ہے (مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۲) -

عشق او † باز اندر آوردم بہ بند　　کوشش بسیار نامد سود مند
تو سنے ‡ کر دم ندانستم ہمی　　کز کشیدن سخت $ تر گردد کمند
عشق دریائے کرانہ نا پدید　　کے تواں کردن شنا اے ہوشمند §
عاشقی خواہی کہ تا پایاں بری　　پس بباید ساخت باہر نا پسند ¶
زشت باید دید و انگارید خوب　　زہر باید خورد و پنداریدقند

مطلع میں بعد کے غزل گو شعرا خصوصاً سعدی و حافظ کا محبوب مضمون ' یعنی حضرت انسان بے بس ہیں ' خاص کر معاملات عشق ' میں بڑی سادگی اور پراثر طریقے سے نظم کیا گیا ہے -

ان اشعار کے کوزوں میں غم و حزن کا بحر نا پیدا کنار جس طرح بند کیا گیا ہے وہ اہل دل سے مخفی نہیں -

---

* صفحہ ۷۳۲ - ممکن ہے شیخ کی مراد رابعہ بصری سے رہی ہو اور مولانا کو ہمنامی کی وجہ سے دھوکا ہوا ہو - مگر فی الحال ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں - اگر کبھی اس کا ثبوت مل گیا تو عوفی کی رائے کے مطابق رابعہ کو اواخر عہد غزنویہ کا شاعر تسلیم کرنا پڑیگا -

† را - نفحات صفحہ ۷۳۲ -　　‡ نفحات میں یہ غزل کا آخری شعر ہے -

$ تنگ - نفحات -　　§ مستمند - نفحات -

¶ نفحات میں یہ شعر یوں ہے - عشق را خواہی کہ تا پایاں بری　　بس کہ بہ پسندید باید نا پسند -

رابعہ کی دوسری غزل حسب ذیل ہے * -

مرا بہ عشق همی محتمل † کنی بہ حیل چہ حجت آری تو پیش خدائے عز و جل
بہ عشقت اندر عاصی همی نیارم شد بدیلم اندر طاعت همی شود بہ مثل
نعیم با تو نہ خواهم جحیم با تو رواست کہ بے تو شکر زهر است و با تو زهر عسل
برو بے نیکو تکیہ مکن کہ تا یک چند بہ سلسل اندر پنهان کنند نجم زحل
هر آئینہ نہ دروغ ست آنچہ گفت حکیم فمن تکبر یوماً فبعد عزذل

مطلع سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ اپنے ذاتی جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے - اس نے غزل میں خاص تاثر پیدا کر دیا ہے —

تیسری غزل ‡ —

زبس گل کہ در باغ ماوی گرفت چمن رنگ از رنگ مانی گرفت
مگر چشم مجنون بہ ابر اندر است کہ گل رنگ رخسار لیلی گرفت
بہ مے ماند اندر عقیقین قدح سر شکے کہ در لالہ ماوی گرفت
سر نرگس تازہ از زر و سیم نشان سر تاج کسری گرفت
چو رهباں شد اندر لباس کبود بلغشہ مگر دین ترسا گرفت

اس غزل کی زبان اتنی اچھی ہے کہ اسے بجا طور پر بہت بعد کے زمانے کی سمجھا جا سکتا ہے - دوسرا شعر اتنا لطیف ہے کہ اگر ہم اسے فارسی کے بہترین اشعار میں شمار کریں تو بیجا نہ ہوگا —

رابعہ کی چوتھی اور آخری غزل گیارہ شعر کی ہے، اس میں

---

* سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحب مجمع الفصحا اس غزل کو قصیدہ کیوں کہتا ہے ' عوفی اسے نہایت پر زور طریقے سے غزل قرار دیتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں (لباب صفحہ ۶۲)
" این غزل کہ از کعب غزال در حلاوت زیادہ است واز وصال یار صاحب جمال در طراوت پیش است ' میگوید - غزل " -

† متہم - مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۲ -

‡ مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۲ یہ غزل لکھتے وقت مصنف لکھتا ہے " بعضے برودکی نسبت دادہ اند "

مطلع و مقطع دونوں ہیں، چونکہ ہم اس کے کلام کا کافی نمونہ دے چکے ہیں اس لیے ہم اس غزل کے صرف چار شعر درج ذیل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں - (دقائق الاشعار - فولیو ۲۰۴ اے) —

الا اے باد شبگیرے پیام من بہ دلبر بر
بگو آن ماہ خوباں را کہ دل با جان برابر بر

نگارا چوں تو بینشینی میان نیکواں وانگہ
بداں ماند کہ بنشیند خطیب مہ بہ منبر بر

ہر آنچہ آیدز عشق تو بر ایں خستہ دل مسکیں
نیامد از غم یوسف بہ یعقوب پیمبر بر

مدار اے بلبت کعب اندہ کہ یار از تو جدا ماند
رسن گرچہ دراز آمد گزر دارد بہ خیبر بر

اس غزل کا قافیہ و ردیف بمقابلہ اور غزلوں کے زیادہ مشکل ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رابعہ مشاق شاعرہ تھی - افسوس کہ اس کا کلام زیادہ مقدار میں نہیں پایا جاتا - اس کی زبردست قوت شعری اور تیغ عشق کا زخم خوردہ ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے بہت کافی کلام چھوڑا ہوگا - آخرالذکر امر نے اسے غزل گوئی کی جانب مائل کیا ہوگا، اس کے قریب قریب جملہ موجودہ کلام کا غزل کی صورت میں ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ غالباً اس نے زیادہ غزلیں ہی کہی ہوں گی - علاوہ ان کی بذات خود بلند پایگی کہ رابعہ کی زبردست شخصیت، اس کے علم و فضل اور تقدس نے ان غزلوں کو اور وقیع بنا دیا ہوگا، اس سے صنف غزل کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہوگی - اس عہد کے اور شاعروں کا کلام، جس سے ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے، اس امر کو بخوبی

واضح کرتا ہے —

رابعہ کا ذکر چھوڑنے سے پہلے اس کے بقیہ دو شعروں کا، جو کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں، یہاں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ (لباب صفحہ ۶۲)

دعوت من بر تو آں شد کایزدت عاشق کُناد
بر یکے سنگیں دلے نا مہرباں چوں خویشتن
تا بدانی درد عشق و داغ مہر و غم خوری
تا بہ ہجر اندر بہ پیچی و بدانی قدر من

ان اشعار میں بھی وہی صداقت جذبات و سوز و گداز ہے جو رابعہ کے کلام کی خصوصیت ہے —

(باقی آئندہ)

میر انیس کے غیر مطبوعہ اشعار

از

(قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا ، پٹنہ)

میر انیس نے غزلیں کہیں یا نہیں؟ میر صاحب کے حالات زندگی کتابی صورت میں جن اصحاب نے لکھے ہیں ، نہ معلوم انہوں نے اس سوال کا کیا جواب دیا ہے - اس وقت وہ کتابیں پیش نظر نہیں - 'نساخ' نے سخن شعرا میں میر انیس کے تین شعر درج کئے ہیں جو کسی طرح مرثیے یا سلام کے نہیں ہوسکتے - یہ اشعار میر انیس کے شایان شان نہیں - نہ معلوم نساخ کو کہاں سے ملے - حال میں ایک قلمی تذکرے میں مجھے میر انیس کی ایک مکمل غزل اور ایک مطلع ملا ہے - یہ تذکرہ میر انیس کے ایک معاصر نے لکھا ہے ، اور کلام بھی میر انیس ہی کا معلوم ہوتا ہے -

خموش اے بلبل شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

شہید عشق ہوے قیس نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ
کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح

تمام خلق ہے خواہان آبرو یارب
چھپا مجھے صدف قبر میں گہر کی طرح

تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں
مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح

"انیس" یوں ہوا حال جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

لکھنؤ کا ایک لطیفہ

از

(جناب پنڈت کشن پرشاد کول صاحب)

'اکبر' اور بیربل کے لطیفے تو زبان زد خاص و عام ہیں - ویسے بھی آپ نے اچھے سے اچھے لطیفے سنے ہوں گے تاہم کچھہ مضائقہ نہیں جو لکھنؤ کا بھی ایک لطیفہ سنیں - لکھنؤ بھی خدا اس کو سلامت رکھے عجیب و غریب شہر ہے - بگڑ بگڑ کر سنورتا ہے - اس کی رعنائیاں و دلربائیاں نت نئے شیدائی پیدا کرتی ہیں - پر جہاں ایسے قدر دانوں کی کمی نہیں وہیں رقیبوں سے مفر نہیں - بہت دن نہیں ہوئے کہ ایک زمانہ تھا کہ لکھنؤ اور دلی میں رقابت تھی - آئے دن دلی والے لکھنؤ والوں پر چوٹیں کیا کرتے تھے - ادیبوں اور شاعروں کی بزم ادب میں بس یہی ایک چرچا رہتا تھا - خوب گرما گرمی ہوتی تھی - ذراسی بات پر صفحے کے صفحے سیاہ کیے جاتے تھے - لیکن اب تو نہ 'داغ' ہیں نہ 'امیر' نہ اُن کے ہوا خواہ و قدر دان - نہ مشاعروں کی وہ گرما گرمی - خدا مغفرت کرے سجاد حسین مرحوم کی 'اُن کے ساتھہ اودھ پنچ کا شباب بھی بیت گیا - ایک دولہا صاحب کا دم غنیمت تھا کل کی بات ہے کہ لوگ سال سال بھر تک اس دن کا انتظار کرتے تھے اور دور دور سے چلے آتے تھے کہ 'انیس' کے اس نام لیوا کو مجلس کے منبر پر

بیٹھا دیکھہ لیں اور اس کا مرثیہ سن لیں - لیکن -

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس کے یہ معنی نہیں کہ شاعری کا چرچا کم ہوگیا یا لکھنؤ سے مرثیہ خوانی اٹھہ گئی - چشم بد دور اب بھی اچھے اچھے کہنے والے موجود ہیں لیکن بقول جناب 'ظریف' کے اب تو خوش الحانی کی داد چاہی جاتی ہے' شاعری کہاں! مشاعروں کی بھی کمی نہیں - آئے دن ہر قصبے اور ہر ہوسٹل میں ہوتے رہتے ہیں لیکن جاکر دیکھیے تو وہ طوفان بد تمیزی کہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ نہیں کوئی سوراجیوں کا مظاہرۂ عام ہے - فرض کہنے کی یہ ہے کہ نہ وہ لوگ رہے نہ وہ زمانہ رہا - ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند!

پھر بھی نہ لکھنؤ کی رونق میں کمی ہے نہ اس کے رقیب ناپید ہیں - پہلے لکھنؤ اور دلی کا چرچا رہتا تھا اب لکھنؤ اور الہ آباد کا جھگڑا ہے - پہلے بزم ادب میں معرکے ہوتے تھے اب بساط سیاست پہ چالیں چلی جاتی ہیں اور الہ آباد کے پہلوان خم ٹھوک ٹھوک کر اکھاڑے میں اترتے ہیں - لکھنؤ فریب اب بھی آنکھوں میں کھٹکتا ہے - کوئی پوچھے کہ صاحب آخر یہ للہی بغض کیوں؟ جواب ملتا ہے کہ راجدھانی تو الہ آباد ہے مگر سرکار کی نگاہ تلطف جب دیکھو تب لکھنؤ پر رہتی ہے - ہر فرمایش پوری کی جاتی ہے - ساری دولت و خزانہ اس کی آرائش و زیبائش پر لٹایا جاتا ہے - بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ اپنوں سے بیر غیروں سے ناتا - ہم سے جیتے جی یہ رنڈاپا نہیں سہا جاتا - مانا کہ الہ آباد راجدھانی کہلاتا ہے پر نوشتۂ تقدیر تو نہیں کہ مٹایا بھی نہ جاسکے - ارے صاحب یہ تو بڑی پرانی مثل

ھے کہ جو پیا من بھائے سو ھی سہاگن کہلائے- کوئی بات تو لکھنو میں ھوگی جو پیا من بھاتا ھے - لاکھہ سیرت اچھی سہی پر صورت بھی تو کوئی چیز ھے- چہرہ پر نمکینی ھو جسے چھب کہتے ھیں - اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کا سلیقہ ھو - گفتگو میں انداز دلربائی ھو تو لاکھہ آپ متقی و پرھیزگار ھوں نظر ایک دفعہ اُٹھہ ھی جاتی ھے - پھر دنیا میں سب متقی و پرھیزگار ھی تو نہیں ھوتے - طبیعتیں شوقین مزاج و طرحدار بھی ھوتی ھیں - الہ لگتی کہیے گا ' شرمانے کی کوئی بات نہیں - کتنے ھیں کہ جو چاھے کالی ھو' بھدی ھو' بھونڈی ھو ' لیکن محض بیوی ھی پر اکتفا کرتے ھیں اور کبھی کسی اچھی صورت پر نظر اُٹھا کر نہیں ڈالتے - راجا ھو یا پرجا ' خاصۂ انسانیت سے تو کوئی خارج نہیں - کار پردازان حکومت بھی تو آخر انسان ھی ھیں کوئی فرشتہ تو نہیں - پھر اگر لکھنو کی رعنائیاں و دلربائیاں ان کو اپنا شیدائی بناتی ھیں اور اس کا جذب انہیں اپنے طرف کھینچتا ھے تو یہ کون سا الزام ھے - لوگ کہتے ھیں ' میں نہیں کہتا ' کہ الہ آباد میں سوائے آمرود' کھپریل اور پراگ والوں کے دھرا کیا ھے؟ ایک حضرت 'اکبر' تھے سو خدا بخشے وہ بھی اب نہ رھے - پھر الہ آباد کو 'اکبر' پر ناز بیجا ھے وہ تو اودھ پنچ کے نو رتنوں میں سے ایک انمول رتن تھے اُن کو الہ آباد سے کیا واسطہ - یہ صحیح ھے کہ الہ آباد اقلیم سیاست و صحافت کا بادشاہ ھے اور بالعموم اخباروں اور رسالوں کو لکھنؤ کی آب و ھوا موافق نہیں آتی ' اسی لیے حضرت 'جوش' ملیح آبادی نے "کلیم" کے لیے پنجاب کی قربت میں دھلی کا آشیانہ ڈھونڈ نکالا- لیکن جب ایسا ھے تو پھر آخر آپ نے اس غریب 'پایونیر' کو بڑھاپے میں ٹھوکریں کھانے اور دم توڑنے کے لیے لکھنؤ کیوں بھیج دیا؟ لاکھوں روپیہ

مریض کی تیمارداری پر صرف کیا جا رہا ہے پر بوسیدہ ہڈیوں میں کوئی جوانی کی روح کیسے پھونک دے ؟

مذاق کی تو بات ہی دوسری ہے - پر سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ لکھنؤ ہی ہے - لاکھہ اُجڑ گیا بگڑ گیا پھر بھی شہر ہے - مٹی مٹائی عظمت و تہذیب کی انمول نشانی ہے - شایستگی و شرافت کا گھر ہے - اودھ کی سرزمین اور لکھنؤ بھی وہ مردم خیز خطہ ہے کہ علم و ادب کی مجلس میں وہ وہ نامور پیدا کیے کہ جنھوں نے اپنا سکہ زمانہ پر بٹھا کر چھوڑا - انشا و سودا - آتش و ناسخ - انیس و دبیر - نسیم و میر حسن نواب مرزا شوق اور رجب علی بیگ سرور کا نام کون نہیں جانتا - خیر - یہ تو پرانی داستانیں ہیں - لیکن سرشار کو گذرے ہوے تو بہت دن نہیں ہوے اُردو میں فن فسانہ نگاری کا موجد تھا - مٹے مٹاے لکھنو کی جیتی جاگتی اور بولتی چالتی وہ وہ تصویریں اپنے قلم سے کھینچ گیا ہے کہ دیکھنے والے عش عش کرتے ہیں - جب تک ہندوستان میں اُردو کے قدر دان اور پڑھنے والے موجود ہیں فسانۂ آزاد کے 'خوجی' کو بھول نہیں سکتے - وہ دم بدم ان سے تھٹول کرے گا اور ان کو ہنساتا رہے گا - ہندو ہوں یا مسلمان - اردو والے ہوں یا ہندی والے - اس میں عورت و مرد کی بھی تخصیص نہیں - گلزار نسیم کس نے نہیں پڑھی - گل بکاولی کا تماشہ کس نے نہیں دیکھا - بیسوں شعر ضرب المثل ہوگئے اور سیکڑوں زبان زد خاص و عام ہیں - نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کا نام کس نے نہیں سنا - آج بھی پڑھنے والے کلیجہ تھام کے رہ جاتے ہیں - لندن پنچ کی تتبع میں نہ معلوم ہندوستان میں بھی پنچانہ رنگ کے کتنے ہی اخبار نکلے ہندی پنچ ' بمبئی پنچ وغیرہ وغیرہ ' لیکن اودھ پنچ کا سا شباب کسی

کو نصیب نہ ہوا - اس گلشن ظرافت کے پھول نہ مرجھاتے ہیں نہ باسی ہوتے ہیں - ویسے کے ویسے ہی بکھرے پڑے ہیں - جب جی چاہے چن کر اور بین کر گلدستہ بنا لیجیے - اس چمن کی تختہ بندی اور آبیاری اُن نکتہ رس اور بذلہ سنج زندہ دل طبیعتوں نے کی تھی جن کی ظرافت، زندہ دلی، طنز و تمسخر اور بذلہ سنجی کی دھاک اور سکہ ہر کہ و مہ پر بٹھایا ہوا تھا - جو بر رو آیا اُسی نے منہ کی کھائی - مرزا سجاد حسین مچھو بیگ ستم ظریف - تربھون ناتھ ہجر - اکبر حسین اکبر - جوالا پرشاد برق - نواب سید محمد آزاد - محمد علی کسمنڈوی وغیرہ اودھ پنچ کے وہ نو رتن تھے کہ جن کا نام دنیائے صحافت میں خدائے سخن کا مرتبہ رکھتا ہے - ڈولھا صاحب دیکھنے میں دبلے پتلے، کمزور اور بوڑھے آدمی تھے - گردن ہمیشہ مراقبہ میں رہتی تھی مگر طبیعت میں دریائے سخن موجزن رہتا تھا - مضامین تھے کہ اُمنڈتے چلے آتے تھے - مرثیہ گوئی کا جوہر انیس سے ورثہ میں ملا تھا - مرثیہ خوانی کا کمال خدا داد تھا - جس وقت منبر پر بیٹھتے اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں بند پڑھتے تو رن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا تھا - معلوم ہوتا تھا کہ دراصل کوئی شہسوار شمشیر بے نیام کر رہا ہے - خدا جانے اس وقت ان بوسیدہ ہڈیوں میں کس بلا کی طاقت اور کہاں سے آجاتی تھی - بات یہ تھی کہ صاحب کمال تھے - اگر یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو چار دانگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا - شاہی درباروں میں قدر و منزلت ہوتی - ہر اخبار و رسالے میں تصویریں چھپتیں اور نہ معلوم کتنی یادگاریں اب تک قائم ہوگئی ہوتیں - لیکن اس بد نصیب ملک کے ماہران فن و صاحبان کمال کے یادگاروں کی کس مپرسی کی حالت تو اسی شعر کے مصداق ہے کہ

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے　　نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

علم ادب و صحافت، شاعری، موسیقی، دستکاریوں کی صنعتیں، خورد و نوش کے تکلفات ہر تہذیب و تمدن کی جان ہوا کرتے ہیں - قوموں کی شایستگی و شرافت کا پتہ انہیں باتوں سے چلتا ہے - میں کہہ چکا ہوں کہ اس مٹتی مٹائی حالت میں بھی لکھنؤ شرافت و شایستگی کا گھر ہے - ہندوستانی تہذیب کا مرکز ہے - علم ادب و صحافت سے قطع نظر نغمہ و سرود تو لکھنو کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے - گو زمانہ کے انقلاب نے اب یہاں کی رقص و سرود کی محفلوں کا رنگ ماند کردیا ہے - 'سنیما' اور 'ڈانس' کی اُچھل کود کے آگے انہیں کون پوچھتا ہے - مگر بہت دن نہیں گذرے کہ لوگ کالکا کا ناچ اور بندہ دین کی ٹھمریاں اور ہولیاں دور دور سے سننے آتے تھے - فی زمانہ کھادی اور چرخے کی دھوم ہے - دستکاریوں کی نمائشیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں - نئے نئے قسم کے چرخوں اور کرگھوں کی ایجاد کے لیے سینکڑوں روپے کے انعام دیے جاتے ہیں- ہاتھ کا بنا ہوا معمولی دیسی کپڑا عجائبات میں سے سمجھا جاتا ہے - اگر آنکھیں ہیں اور قدر کرنا جانتے ہو تو لکھنؤ کی چکن اور ٹانکے کی جامدانی منگا کر دیکھو کہ دستکاری کی صنعت و معجزہ کسے کہتے ہیں - اس جامدانی کو ہاتھ میں لیتے ہی بخدا طبیعت بے ساختہ چاہتی ہے کہ بننے والے کے ہاتھ چوم لے - مٹی کے کھلونے ہر قصبہ و شہر میں بنتے ہیں مگر یہ بات صرف لکھنؤ کے ہی کھلونوں میں ہے کہ صرف جان ڈالنے کی کسر معلوم ہوتی ہے - لکھنؤ کے مطعون کرنے والے تو بہت ہیں لیکن فصل پر ملیح آباد کے سپیدے اور لکھنو کے دسہری کے پارسل کا بیچینی سے انتظار کیا جاتا ہے زردہ اور قوام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے پھر لکھنؤ ہی لکھنا

پڑتا ہے - لکھنؤ پہنچتے ہی بیگماتی کلوریوں کی فرمائش ہوتی ہے - ککڑی کی کیا حقیقت ہے - ایسی کوئی کھانے کی چیز ہی نہیں' لیکن جہاں "لیلیٰ کی انگلیاں ہیں اور مجنوں کی پسلیاں ہیں" کی صدا کانوں میں آئی بے اختیار طبیعت للچاتی ہے اور خدمت گار کو حکم ہوتا ہے کہ دو پیسے کی لے آنا - ایک کیا سینکڑوں باتیں ہیں جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے - شبہ نہیں کہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن شرافت و شایستگی کے تکلفات کی انہی چھوٹی باتوں سے ہر قوم کے تہذیب و تمدن کا اندازہ ہوتا ہے - یہی وہ باتیں ہیں جنھیں آپ فی زمانہا مروجہ زبان میں Culture کہتے ہیں مگر اسے کیا کیجیے کہ ہمارے میدان سیاست کے سورما اور سور بیر اس بات کو مانتے ہی نہیں کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن بھی شایستگی کے نام کا اہل ہے - انہوں نے اس سے زیادہ پڑھا اور سمجھا ہی نہیں کہ ہندو تہذیب کا ماحصل "چوتیا و دھوتیا" ہے اور اسلامی تہذیب کا لب لباب - "کُھٹنا اور بدھنا" - ان کے آگے اس دکھڑے کا بیان اسی ہندی مثل کا مصداق ہے کہ "اندھے کے آگے روئیے اور اپنے نین کھوئیے" —

آپ کہیں گے کہ دعوت دی تھی لطیفہ سننے کی اور لگا یہ دکھڑا رونے - سو یہ بکواس بھی بالکل بے محل نہ تھی - اس تمہید کی ضرورت اس لیے پڑی کہ آپ لطیفے کا پورا لطف اٹھا سکیں - اچھا تو سنیے - مگر ہاں ایک بات کہنی بھول گیا اور وہ بہت ضروری ہے - یعنی یہ کہ جو کچھ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں وہ الہ آباد والوں کو برا نہ لگے - یہ فقیر تو اکبر آباد مرحوم کے اُجڑے دیار کا رمتا جوگی ہے - اسے نہ لکھنؤ کی پچ نہ الہ آباد سے کد نہ دلی سے واسطہ - صرف اتنا جانتا ہے کہ مست کا بول بالا رہے -

اچھا' لطیفہ سنیے - سنی ہوئی بات ہے' آنکھوں کی دیکھی نہیں -

اس لیے عذاب دروغ بر گردن راوی - کوئی چار پانچ برس کی بات ہے کہ ہنگامۂ انقلاب برپا تھا - ملک میں چاروں طرف سے سوائے 'مہاتما کی جے' کے کوئی آواز کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی - لکھنؤ میں بھی جوش کافی تھا - مرد تو مرد عورتیں بھی اور اچھے اچھے گھرانوں کی عورتیں بے نقاب ہوکر میدان کارزار میں نکل آئی تھیں - عورتوں کی ہمت اور بہادری کا ہر طرف چرچا تھا - لوگ ان کی ہستی اور حقوق کے قائل ہوگئے تھے - اسی زمانہ میں میونسپلٹی کا الکشن ہونے والا تھا - سوراجیوں نے تو اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا لیکن اور ممبری کے امیدواروں کی کمی نہ تھی - چنانچہ چوک وارڈ سے ایک ڈاکٹر صاحب ممبری کے لیے کھڑے ہوے تھے - ان کا خاندان لکھنؤ کے پرانے خاندانوں میں تھا - پھر اپنے کام میں ہشیار تھے - لوگوں کو ان کی ذات پر بھروسہ تھا - ان کے حامیوں اور مددگاروں کی کمی نہ تھی - یقین تھا کہ ممبر ہوجائیں گے - پر کوئی شخص کیسا ہی ہر دل عزیز کیوں نہ ہو خار کھانے والے اور مخالف ہر شخص کے ہوتے ہیں - کسی صاحب کو ان سے کد تھی - ہرانا اور جتانا تو ان کے بس کی بات تھی نہیں پر ڈاکٹر صاحب کو تنگ کرنے کی انہوں نے ٹھانی تھی - آدمی سوجھ بوجھ کے اور بڑے دل لگی باز تھے - اور وثیقہ سلامت رہے دل لگی بازوں اور بے فکروں کی اب بھی لکھنؤ میں کمی نہیں - انہوں نے ایک بی صاحبہ کو ابھارا کہ ممبری کے لیے کھڑی ہوجائیں اور ڈاکٹر صاحب کا مقابلہ کریں - بی صاحبہ لکھنؤ کی مشہور گانے والیوں میں تھیں - ان کے بھی ہواخواہوں اور قدر دانوں کی کمی نہ تھی - میراثی اور سازندے دوڑ دھوپ کے لیے حاضر تھے - نئے بگڑے ہوے تماشبین اور سیٹھ ساہوکار روپیہ خرچنے کو تیار تھے - چوک

کی عام طوائفیں بے فکرے وثیقہ دار اور دل لگی باز ووٹ دینے کو موجود تھے - بی صاحبہ کو بھی اچھی دل لگی ہاتھ آئی - دل لگی کی دل لگی اور مشغلہ کا مشغلہ - کھڑی ہوگئیں - نئی نئی بات تھی - گھر گھر یہی چرچا تھا اور شہر بھر میں اس کا غلغلہ - ڈاکٹر صاحب بھی گھبرائے کہ عجب لغویت کا سامنا ہے ' اگر ایک طوائف کے مقابلے میں جیتے تو کون سی سرخروئی اور ہارے تو ذلت ہی ذلت - پھر یاران طریقت کی فقرے بازی مزید براں - بہت کچھ سوچ سمجھ کر بی صاحبہ کو پیغام بھیجا کہ پانچسو روپے لے لیں اور بیٹھ جائیں - کسی طرح پنڈ تو چھوٹے - بی صاحبہ بڑی ستم ظریف تھیں ' انہوں نے جواب میں کہلا بھجوایا کہ " ڈاکٹر صاحب تو بڑے آدمی ہیں اور یہ لونڈی کس قابل ہے پر ایک ہزار میں ہی دیتی ہوں ڈاکٹر صاحب ہی بیٹھ جائیں" - ڈاکٹر صاحب نے رقم تگنی کرکے دربارہ پیغام بھیجا - اُس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ " میں روپیہ کی بھوکی نہیں - میں تو صرف عورتوں کے حقوق کی پیروی کی غرض سے ممبری کے لیے کھڑی ہوئی ہوں ' ڈاکٹر صاحب کسی شریف گھرانے کی تعلیم یافتہ اور بیدار مغز خاتون کو اپنی جگہ کھڑا کرادیں ' میں وعدہ کرتی ہوں کہ بیٹھ جاوں گی اور مخالفت نہ کروں گی" - اب تو ڈاکٹر صاحب کا قافیہ بڑا تنگ ہوا ' لیکن بڑے گرگ باراں دیدہ تھے اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے انہوں نے وہ چال چلی کہ بی صاحبہ کی فقرے بازی کچھ کام نہ آئی - الکشن میں شیعہ سنی کا سوال چھیڑ دیا - لکھنؤ ' میں شیعہ سنی کا سوال چھیڑنا گویا بھس میں چنگاری لگانا ہے - جب زیادہ جوش بڑھتا ہے تو نقض امن تک کی نوبت آتی ہے - محرم کے زمانہ میں حکومت کو پولیس کا خاص انتظام کرنا پڑتا ہے آج - کل بھی 'مدح صحابہ' کا قضیہ اس سلسلے

میں چھڑا ہوا ہے اور نقض امن کا اندیشہ ہے - شیعہ سنی کا سوال چھڑتے ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا - طوائفوں اور سازندوں؛ اُن کے حامیوں اور ہراخواہوں کے دو گروہ بن گئے - ایک شیعہ اور ایک سنی - الکشن ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا - لیکن پالا ڈاکٹر صاحب کے ہی ہاتھ رہا - بی صاحبہ ہار گئیں مگر Sportsman تھیں اپنا ووٹ ڈاکٹر صاحب کو ہی دیا اور نتیجہ معلوم ہونے کے بعد بہ نفس نفیس ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دینے پہنچیں - ڈاکٹر صاحب اپنے خیمہ کے باہر خوش خوش کھڑے تھے - ان کی ٹکڑی کے لوگ ان کے ارد گرد جمع، تھے الکشن کے جوڑ توڑ کا ذکر ابھی جاری تھا کہ بی صاحبہ بھی آپہونچیں - آگے بڑھیں اور ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے بولیں —

بی صاحبہ - ڈاکٹر صاحب الکشن کی جیت مبارک -

ڈاکٹر صاحب - اجی ہار جیت تو ہوا ہی کرتی ہے، اس میں مبارک کی کیا بات ہے —

بی صاحبہ - نہیں 'مبارک' دینا تو میرا فرض ہے، پر مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے شہر کی بدنامی ہوئی -

ڈاکٹر صاحب - وہ کیسے ؟

بی صاحبہ - اجی الہ آباد والے ویسے ہی روز ہم لوگوں پر لعن طعن کرتے رہتے ہیں - انہیں ایک موقع اور مل گیا - کہیں گے، اور صحیح کہیں گے، کہ لکھنو والوں کی نگاہ میں عورت کی ہستی و حیثیت کی کچھہ قدر و منزلت ہی نہیں - عورتوں کے حقوق کا کچھہ پاس و لحاظ ہی نہیں -

ڈاکٹر صاحب - مجھے الہ آباد والوں کے کہنے سننے کا تو کچھہ غم نہیں

پر آپ سے شکایت ہے کہ آپ بھی ایسا کہتی ہیں -

بی صاحبہ - جو بات کھری ہوتی ہے کہنے میں آتی ہے - اچھا آپ ہی بتائیے ڈاکٹر صاحب، دیکھیے قران پاک کی قسم ہے سینہ پر ہاتھہ رکھہ کر سچ سچ کہیے گا، کہ آخر اس الکشن کے نتیجہ سے ظاہر کیا ہوتا ہے ؟ یہی نا کہ لکھنؤ میں مرد کم ہیں اور مریض زیادہ ! —

اس فقرے پر فرمائشی قہقہہ پڑا اور ڈاکٹر صاحب کچھہ ایسا سٹ بٹائے کہ جواب دیتے نہ بنی —